DAMAGE BOOK

*

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224716

UNIVERSAL
LIBRARY

اجرد پٹہ انگریزی ایم نشان ۱۰۵۵
نمبر ۳۵۲
۳۵
جبرت ۲۰ سکہ رعایتی نشان ۲۱

جلد دوم

المعلم

ماہ مہر و آبان سنہ ۱۳۳۴ ف

مدیر ... مریم اے (کنٹب)

شریک مدیر محمد عظمت اللہ خاں بی۔ اے

اعظم اسٹیم پریس چارمینار

حیدرآباد دکن

قواعد

(۱) یہ محض تعلیمی رسالہ ہے جس میں تعلیم کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے سیاسی مذہبی مضامین شریک نہ کئے جائیں گے

(۲) یہ رسالہ ہر ماہ فصلی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا

(۳) پرچہ وصول نہ ہو تو ہر ماہ فصلی کی ۲۵ تاریخ تک خریدار صاحبان بحوالہ نمبر خریداری مطلع فرمائیں

(۴) جو مضامین ناقابل طبع متصور ہوں گے ان کی واپسی خرچہ ڈاک کی روانگی پر منحصر ہوگی۔

(۵) اس رسالہ کی قیمت سالانہ (۳) ہے مع محصول ڈاک ہے جو پیشگی لی جائے گی

(۶) نمونہ کا پرچہ پانچ آنہ کے ٹکٹ وصول ہونے پر ارسال کیا جائے گا۔

(۷) جو طلب مور کے لئے جوابی کارڈ وصول ہونا چاہئے ورنہ ادائی جواب میں مجبوری رہے گی

(۸) اجرت طبع اشتہارات درج ذیل ہے رقم وصول ہونے پر اشتہارات طبع کئے جائیں گے

تعداد و مدت	صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
ایک بار	۱	۸ر	۴ر
سہ ماہ	۲	۱۴	۸ر
ششماہ	۳	۲	۱
سالانہ	۵	۳	۲

(۹) جملہ مراسلت و ترسیل رقوم متی آرڈر وغیرہ بنام شریک مدیر پتہ ذیل پر ہونی چاہئے

محمد عظمت اللہ خاں بی اے شریک مدیر

دفتر رسالہ المعلم بلگرامی ہوس سانچوقی

حیدرآباد دکن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مندرجات

المعلم

(۱) مقصد تعلیم۔ از مولوی سید محمد علی صاحب رگار انسٹرکٹر ڈیٹ کالج اورنگ آباد (۱ تا ۸)

(۲) زراعتی تعلیم۔ از مولوی سید محمد جواد صاحب (بی اے (علیگ) مددگار جاگیردار کالج بیگم پیٹھ (۹ تا ۱۷)

(۳) جغرافیہ۔ از مولوی افتخار علیخاں صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ سریا پیٹھ (۱۷ تا ۲۲)

(۴) مدرسین کے چند عذرات کا تصفیہ۔ از مولوی سید جد علیصاحب بی اے بی ٹی مہتمم تعلیمات ضلع ناندیڑ (۲۳ تا ۳۶)

(۵) تصاویر کے تعلیمی فوائد۔ از مولوی سید محمد حسین صاحب بی اے (اکسن) نائب ناظم تعلیمات سرکار عالی (۳۷ تا ۳۸)

(۶) دیسی کھیل از مولوی عبدالسلام صاحب ناظر مدارس ضلع گلبرگہ (۳۹ تا ۴۳)

(۷) ریڈیو کا راز } شریک مدیر (۴۴ تا ۵۳)

(۸) تبصرہ } (۵۳ تا ۵۹)

(۹) شذرات۔ (۵۹ تا ۶۴)

جلد ۲ | بابتہ ماہ مہر و آبان سنہ ۱۳۳۴ف | نمبر ۲ و ۳

مقصد تعلیم

تعلیم کے بڑے اور ضروری اجزاء تین ہیں (۱) معلم (۲) نصاب تعلیم (۳) متعلم اگر تاریخ تعلیم کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مختلف زمانوں میں ان تینوں میں سے مختلف اجزا پر زور دیا جاتا تھا۔ مثلاً ایک زمانے میں یہ امر مسلمہ تھا کہ اگر معلم لایق اور ہوشیار ہو تو متعلم لازمی طور پر لایق ہوں گے اس کے بعد یہ بات مان لی گئی کہ تعلیم کے بڑے یا

اچھے نتیجے کا تمام تر دارومدار نصاب تعلیم پر ہے۔ خواہ مدرس کیسا ہی ہو اگر نصاب تعلیم کا انتخاب اچھا ہو تو طلبا، قابل و لایق ہوں گے۔ الغرض ایک زمانے تک علم و نصاب تعلیم ہی مصلحان تعلیم کے مطمع نظر بنے رہے۔ ایک عرصہ دراز کے بعد یہ بات محسوس کی جانے لگی کہ اچھے تعلیمی نتائج کے لئے یہ ضرور ہے کہ متعلمین کی صحت جسمانی و ترقی دماغی کا پورا پورا لحاظ کیا جائے بغیر اس کے لایق معلمین اور عمدہ نصاب تعلیم بیکار ہیں کیونکہ قابل مدرس اور اچھا نصاب تعلیم طالب علم کے توائے ذہنی و عقلی کو ترقی نہیں دے سکتے اور ناقص طلبا کی ناکامیابی پر مدرس کو یہی کہکر تسلی دینی ہوتی ہے کہ ؎

یاراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست ۔ در باغ لالہ روید و در شورہ زار خس

پس فی زمانہ منشاء تعلیم یہی ہے کہ متعلم کی دماغی و جسمانی صحت کا پورا پورا لحاظ کیا جائے اور نصاب تعلیم کے تعین یا معلم کے طریقہ تعلیم دونوں میں متعلم ہی کی ضرورت کو مدنظر رکھا جائے۔ مجملاً یہ کہ تعلیم کے اچھے نتائج حاصل کرنے کے لئے متعلم کی شخصیت کو غیر معمولی اہمیت دینی چاہیئے۔

ایسی صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ متعلم کی جسمانی و دماغی ترقی کو مدنظر رکھکر اُسے کس طرف کو لے چلنا چاہیئے یعنے یہ کہ ہمارا نقطہ نظر کیا ہو۔

آیا ہم طالب علم کے جذبہ قومی کو ترقی دیں کہ جذبہ مذہبی کو، اُسے کسی خاص پیشے یا حرفے کی تعلیم دیں کہ جو تحصیل ملازمت میں اُس کی معاون ہو یا محض کتابی علم کا جامع بنا دیں کہ جو دنیا والوں سے اُسے بے تعلق کر دے۔

چونکہ علم التعلیم کے اکثر معلومات میں ہم لوگوں کو اہل مغرب کی مدد لینی پڑی ہے اس لئے بہتر ہے کہ اس اہم ترین مسئلہ تعلیم کے تصفیہ میں بھی اُن کے تجربات سے فائدہ اُٹھایا جائے۔

مقصد تعلیم کے متعلق علمائے مغرب کا آخری فیصلہ | ایک زمانے کے بحث و مباحثہ

علمائے مغرب نے بغلبہ آرا یہ تصفیہ کر لیا ہے تعلیم کا صحیح منشا یہ ہونا چاہئے کہ ہر متعلم کو پہلے احساس خودی یعنے (SELF. REALISATION.) کی طرف متوجہ کیا جائے اور اس کے بعد اظہار خودی یعنے (SELF EXPRESSION) کا اسے پورا پورا موقع دیا جائے چنانچہ لندن کے مشہور ماہر تعلیم پروفیسر نن تعلیم پر لکچر دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

تعلیم کا مدعا یہ ہونا چاہئے کہ ہر فرد قوم کو اپنی ذاتی استعداد کے اظہار کا پورا پورا موقع دیا جائے۔

احساس خودی کا منشا مذکورۂ بالا اصطلاح کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ہر متعلم کو یہ بات بخوبی بتلائی جائے کہ اس کی ہستی کیا ہے اور دنیا میں اُسے کیا کرنا ہے یہ اس طرح معلوم کرایا جا سکتا ہے کہ ہر متعلم کے آگے اُس کی قوم کے کارنامے بیان کئے جائیں اور بتلایا جائے کہ ان کارناموں میں زیادتی اور ترقی دینے کے لئے وہ کس حد تک مفید ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ کہ جس خاندان کا وہ ممبر ہے اُس نے ملک و قوم کی کیا کیا خدمتیں کیں اور ان جلیل القدر بزرگوں کا جانشین ہونے کی حیثیت سے اُس کی ذات سے کیا کیا توقعات وابستہ ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ قوم کی کمزوریاں اور خامیاں بھی نہایت وضاحت کیساتھ بتلائیں خیال دلنشین کرنا چاہئے کہ ان کی اصلاح کی اُسی سے توقع کی جاتی ہے۔ انہیں تمام باتوں کو اہل مغرب نے احساس خودی سے تعبیر کیا ہے۔ اور اُن کے نزدیک ملک و قوم کی ترقی کے لئے یہ لازمی ہے کہ ہر طالب علم کے دل میں یہ خیالات موجزن ہوں۔

احساس خودی خود غرضی نہیں ہے ممکن ہے کہ ناظرین مذکورۂ بالا خیالات کو خود غرضی کا پیش خیمہ تصور فرمائیں پس یہ بتلا دینا ضرور ہے کہ یہاں پاس قوم و ملت سے یہ منشا ہے کہ ہر فرد قوم دوسرے اقوام کے جذبات کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے اپنے قومی و ملی جذبات کو بھی جائز حد تک اپنے قول و فعل میں جگہ دے۔ اس کی یہ غرض نہیں کہ ہم اپنی

قوم کو تنگ نظر بنائیں۔ کیونکہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دوسروں کے احساسات و جذبات کا صحیح اندازہ و احترام وہی شخص کر سکتا ہے جو اپنے عقائد و رسوم میں پکا ہو۔

اہل یورپ اس خود شناسی اور اس کے اظہار سے جو کچھ سمجھے ہوئے ہیں وہ ڈاکٹر فن کے اس لکچر سے معلوم ہو سکتا ہے جو انہوں نے سال گذشتہ بمقام لیورپول برٹش ایسوسی ایشن کے روبرو دیا تھا۔ نصاب تعلیم کی اصلاح اور مقصد تعلیم کے تعین کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب موصوف فرماتے ہیں۔

"یہ امر لازمی ہے کہ نصاب مدرسہ میں قوم کے آئین و رسوم کو جگہ دیجائے ہمارا مقصد یہ ہو کہ اپنی قوم کے بچوں کو اسم بامسمیٰ یوروپین بنائیں یعنے یہ کہ ان کے اوضاع و اطوار سے یوروپین ہونا پایا جائے۔ یہ ایک وسیع منشا ہے جس کی تکمیل کے لئے پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ صحیح معنوں میں انگلستانی بنیں اور انگلستان کی قدیم زبان اور انگلستانی آئین و رسوم کو باقاعدہ حاصل کریں"۔

بخیال دفع غلط فہمی ڈاکٹر صاحب موصوف صاف صاف کہتے ہیں کہ۔

"میرا ہرگز یہ منشا نہیں کہ تمام غیر ملکی خوبیوں کو عمداً نظر انداز کروں یا اپنی قوم کے نونہالوں کو غیر اقوام سے متنفر کر دوں یا اُن کے دلوں میں اس خیال کو جاگزیں کرادوں کہ ہمارے تمام طور اور طریقے لازمتہً اچھے اور قابل قدر ہیں۔ اس قوم کے خیالات تنگ نظری کا پتہ دیتے ہیں، میرا منشا صرف اس قدر ہے کہ ہمارے اخلاف کو تمام ممکن ذرائع سے روشن خیال بنایا جائے۔ اُنہیں یہ چیز بتلائی جائے کہ ہمارے اسلاف نے کن کن طریقوں سے ہمارے موجودہ قار و عظمت کو حاصل کیا اور ہم اب کن طریقوں سے آگے ترقی کر سکتے ہیں اسی طرح یہ بھی کہ ہم میں جو نقائص اور خامیاں سرایت کر گئی ہیں اُن کا منبع کیا ہے اور اب دفعیہ کن کن صورتوں سے ممکن ہے۔ نہ صرف یہ تمام بلکہ یہ بھی کہ ہم دوسری اقوام کے دوش بدوش شاہراہ ترقی پر کیوں کر گامزن ہو سکتے ہیں"۔

اظہار خودی کا منشاء اور اس کی اہمیت ماہرین نفسیات کے نزدیک یہ سرمایۂ تحقیق کو پہونچ چکا ہے کہ ہر متنفس میں بعض قومی و خاندانی خصائل بحیثیت کسی خاص قوم یا خاندان کے ممبر ہونے کے وراثتہً موجود ہوتے ہیں۔ پس تعلیم کا منشا یہ ہونا چاہئے کہ ہر متعلم کو اظہار شخصیت کا کافی موقع دیا جائے تاکہ ان مضمر خصائل کا ظہور ہو سکے۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض خصائل بد ہوں لیکن ماہرین نفسیات نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ انہیں نیکی کی جانب کیونکر مبدل کیا جائے بہرکیف قبل تبادلہ ان کا ظہور لازمی ہے یعنی یہ کہ بہرصورت متعلم کی کامل ترقی کے لئے اُس کو اظہار خودی کا موقع دیا جانا ضرور ہے۔ بغیر اس کے "احساس خودی" بے سود ہے۔ کیونکہ اگر ہر فرد قوم صرف اسی پر اکتفا کرلے کہ اسلاف کے کارناموں کو پڑھ کر خوش ہو یا قوم کی موجودہ ضروریات کا کامل اندازہ کرے لیکن خود کچھ ہاتھ پاؤں نہ ہلائے تو ترقی کا دروازہ مسدود ہو جائیگا ترقی کے لئے ضرور ہے کہ ہر فرد قوم خود بھی کچھ کرے۔ اُن جوہروں کو جو اس کی ذات میں مضمر ہیں اور جو اس کی قوم کا ورثہ ہیں انہیں معقول طریقے پر استعمال کرے اور ترقی کے میدان میں آگے بڑھے بالفاظ دیگر "اظہار خودی" کرے۔ یہ تعلیم کا دوسرا لیکن اہم تر جزو ہے

مقصد تعلیم بوسکن اگرچہ علمائے مغرب کی جدید ترین رائے متعلقہ مقصد تعلیم جس کو بوضاحت بیان کیا ہے ایک بڑی حد تک مکمل اور قابل قبول ہے لیکن ضرورت اس کی ہے کہ بغرض سہولت ایک ایسا جامع مقصد تلاش کیا جائے جو ہر دو منشا یعنی "احساس خودی" اور "اظہار خودی" پر یکساں زور دیتا ہو انگلستان کے مشہور ادیب بوسکن نے ایک موقع پر اپنے ایک لکچر میں تعلیم کی غرض و غایت بیان کی تھی۔ چونکہ اس کی رائے ہمارے مفید مطلب ہے اس لئے نذر ناظرین کی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"قومی ترقی و بہبودی کا بہترین ذریعہ وہ تعلیم ہو سکتی ہے جو افراد قوم کو رحم دل انصاف پسند اور حقیقت شناس بنائے"

اگر غور کیا جائے تو **حقیقت شناسی** ایک ایسا جامع مقصد ہے کہ جس میں احساس خودی اور اظہار خودی دونوں شامل ہیں۔ جب تک کہ ہمیں قوم کی گزشتہ اور موجودہ حالت کا احساس نہ ہو ہم اپنی حقیقت کو کما حقہ نہیں پہچان سکتے۔ اسی طرح جب تک ہم اپنے ذاتی جوہر کو بذریعہ عمل (یعنی اظہار خودی) لوگوں پر روشن نہ کریں لوگوں پر ہماری حقیقت کا اظہار نہیں ہو سکتا پس اہل مغرب کے نزدیک مقصد تعلیم یہ ہوا کہ ہر متعلم حقیقت شناس بنے حقیقت نہ صرف قوم و ملت کی بلکہ اس کی ذاتی بھی ورنہ تعلیم ناممکن رہے گی۔ اس حقیقت شناسی کے بعد متعلم کا یہ فرض ہوگا کہ اپنی حقیقت کو پست سے بلند اور بلند سے بلند تر درجہ پر پہنچانے کی کوشش کرے۔

ہمارا مقصد تعلیم کیا ہو | یہ معلوم ہونے کے بعد کہ اہل مغرب مقصد تعلیم کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنا مقصد کیا قرار دیں اور یہی بتلانا اس مضمون کا مدعا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک بڑی حد تک ہم اُن کے تجربے اور تصفیہ سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں لیکن اُس میں کسی قدر ترمیم کرنی ہوگی اور وہ یہ ہے۔

خدا شناسی ہماری تعلیم کا پہلا مدعا ہونا چاہیئے | اہل مغرب صرف "حقیقت شناسی" کو مقصد تعلیم سمجھتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ وہ وجود حقیقی کی ماہیت کو بھی اسی حقیقت شناسی کا ضمن قرار دیتے ہوں لیکن ہماری نظروں میں وہ کائنات عالم کا جزو اعظم ہے اور ضرورت اس کی ہے کہ اُس کی حقیقت موجودات عالم کی حقیقتوں سے جدا اور پہلے بتلائی جائے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک وہی تمام موجودات کا سبب ہے پس ہماری ضرورتوں اور حالات کا لحاظ کرتے ہماری پہلی غرض یہ ہونی چاہیئے کہ متعلم کو "خدا شناس" بنائیں یعنی یہ کہ ہمارے متعلمین اپنے سارے کاروبار میں اس وجود حقیقی کے اثر کو بمرتبہ عین الیقین سمجھیں اور اس کی یاد دل سے نہ بھلائیں۔ حقیقت ذات حق کے متعلق صرف اس قدر سمجھ لیں کہ

ے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم وز ہر چہ دیدہ ایم و شنیدیم و گفتہ ایم

اپنی کوششوں اور منصوبوں کی تکمیل کے لئے اسی کے آگے دست بدعا ہوں بصورت کامیابی صدق دل سے یہ کہیں کہ

از دست و زبان کہ بر آید کز عہدۂ شکرش بدر آید

اور بصورت ناکامیابی اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دیں کہ السعی منی والاتمام من اللہ نہ صرف اسی پر اکتفا کریں بلکہ اسی کی ذات پر بھروسہ کرکے پھر کوشش کریں

توکل کے غلط مفہوم اور اس کی اصلاح یہاں پر یہ بتلا دینا ضرور ہے کہ توکلت علی اللہ اور قناعت کے ضمن میں عوام ایک غلط اور تباہ کن معنے نکالتے ہیں جس کا دفعیہ نہایت ضرور ہے میرا منشا یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں بالعموم کاہلی اور سستی کو قناعت اور توکل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی ہمت کو پست کرنے والا خیال ہے جو ہماری موجودہ مذلت اور تباہی کا ایک زبردست باعث ہے۔ اس لئے یہ ایک ضروری امر ہے متعلمین یہ بھی سمجھ لیں کہ "خدا صرف انہیں کی مدد کرتا ہے جو اپنی آپ مدد کریں" صرف اس کی ذات پر توکل کرنے اور محض تقدیر پر بھروسہ کرنے کے یہ معنے نہیں کہ اپنے قوائے جسمانی اور دماغی سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ ہر کام میں انسان کی کوشش اور سعی خود ایک اولین سبب ہے۔

خداشناسی کے بعد حقیقت شناسی بھی تعلیم کا جزو لاینفک ہے خداشناسی کے ساتھ ہی ساتھ متعلم کو اس کی قوم اور اس کی شخصی حقیقت کا کما حقہ احساس کروانا اور کوشش و عمل کی تلقین کرنا بھی بہت ضرور ہے۔ اس میں ہم لوگوں کو اہل مغرب سے اتفاق کرنا چاہئے فرق صرف یہ ہوگا کہ وہ اپنے کارنامے اور ترقی پر زور دیتے ہیں ہمیں اپنی موجودہ پست حالات اور اس پستی کے وجوہات متعلمین کو سمجھا کر ان کے دلوں میں ترقی کا شوق پیدا کرنا ہوگا اور انہیں کچھ کرنے کے لئے مستعد کرنا ہوگا۔ اہل مغرب اپنے نونہالوں کو یہ بتلاتے ہیں کہ

تمہاری قوم ترقی کر رہی ہے تم اس ترقی میں اضافہ کرو ہمیں اپنے نوجوانوں کو یہ تلخ حقیقت سنانی ہوگی کہ زمانے کی نیرنگیوں اور اپنی غفلتوں سے ہم قعرِ ذلت میں آپڑے ہیں لیکن وہ دن بھی اب سے کچھ دور نہ تھا کہ ہمارے ہی اسلاف نے بڑے بڑے معرکے سر کئے تھے اور امرا ور ہرے تھے ملکوں میں اُن کی قابلیت اور ہمت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ پس ہماری تاریخ کا یہ روشن لیکن دور از نگاہ صفحہ ہم کو بتلا رہا ہے کہ ہم میں بھی وہی جوہر اور قابلیت مضمر ہے ضرورت صرف اس کی ہے کہ ہم بذریعہ عمل اس کا اظہار کریں۔ الغرض اسی قسم کے ہمت افزا خیالات سے متعلمین کو حقیقت حال کا احساس کروایا جائے اور اُنہیں اپنے حقیقی جوہر کے اظہار پر مستعد کیا جائے۔ ان کے دلوں میں یہ خیال راسخ ہو کہ مقصد تعلیم یہ نہیں کہ وہ عہدہ ہائے جلیلہ ممتاز ہو کر اپنی زندگی آرام سے کاٹ دیں بلکہ یہ ہے کہ حتی الامکان اپنے ملک و قوم کی خدمت کریں۔ کیونکہ جب تک ساری قوم حالت ابتذال میں رہے اُن کا ذاتی اعزاز چنداں قابل قدر نہیں میں مکرر یہ بتلا دینا چاہتا ہوں کہ میں ہرگز اندھی قوم پرستی پر زور نہیں دینا چاہتا۔ چونکہ اس کے متعلق مفصل لکھا جا چکا ہے اس لئے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ہر متعلم جب خدا شناس و حقیقت شناس ہوگا تو وہ لازماً دوسرے اقوام کے احساسات کا احترام کرے گا اور اپنے مفاد کی خاطر اُن کی خوبیوں کے حاصل کرنے میں دریغ نہ کرے گا

بخیال طوالت میں نے اپنے خیالات کو اختصاراً بیان کر دیا۔ لیکن اس اجمال سے اتنا تو ضرور واضح ہو گیا ہوگا کہ خدا شناسی و حقیقت شناسی یہ وہ دو سبق ہیں جن کے ضمن میں ہر متعلم باعتبار اخلاقی۔ قومی۔ مذہبی و رسمی تعلیم مکمل ہو سکتا ہے۔ اسی خیال کو حضرت اکبر یوں ادا کرتے ہیں اور گویا اپنی زبان میں صحیح مقصد تعلیم بتلاتے ہیں کہ۔

اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو میری دانست میں یہ ہمارے لئے جامع و مانع مقصد تعلیم ہو سکتا ہے۔

سید محمد علی

تعلیم زراعتی

نی زمانہ تعلیم انسانی بقا اور مفاد کے لئے لازمی و اہم ہے جیسا کہ اہل اسپارٹا کی
بقا اور زندگی کے لئے قانون اور دلیری لازم و ملزوم تھی انسان کوئی پیشہ اختیار کرے
اگر وہ دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو لازمی ہے کہ عام معلومات کا کافی
ذخیرہ مہیا کرے۔ جنگ عظمیٰ کے بعد سے لوگوں نے زراعتی تعلیم کی اہمیت کو بخوبی محسوس کیا
سب ہر شعبہ خیال کرتا ہے اور اسی ٹوہ میں ہے کہ زراعتی تعلیم اچھی بنیاد پر قائم کی جائے
اور یہ خیال اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ زراعتی تعلیم عام تعلیم کے زیر اثر
نہ لائی جائے اور عام تعلیم چوطرف نہ پھیل جائے۔

سولہویں صدی عیسوی میں سب سے پہلے جس قوم نے اس کی ضرورت کو محسوس کیا
وہ ڈینش تھے ان کے مدارس نوقانیہ کے سراس کی کامیابی کا سہرہ رہا۔

ہم کرنٹڈوگ (GRUNDTVIG) اور دوسرے حضرات کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ
انہوں نے ایک قلیل مدت میں ایسی روح پھونکی کہ حال کا ڈینش کسان اصلی معنوں میں
ایک مستند اور قابل کسان مانا جاتا اور وہ ایک کاروباری آدمی بھی تصور کیا جاتا ہے۔ ڈینش کی
ہمسایہ قوم جرمن بھی کسی طرح پیچھے نہ رہی اور بعض جرمن ممالک مثلاً پرشیا۔ اور بویریا کے
مدارس میں زراعتی تعلیم دیجاتی ہے۔ اہل امریکہ بھی جو اس میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں کئی سال سے
اس کام میں منہمک پائے جاتے ہیں اور لگاتار کوشش کر رہے ہیں اور ممالک متحدہ امریکہ بھی
زراعتی تعلیم کی جانب خاص توجہ مبذول کر رہے ہیں۔

اگر مزارعین ناخواندہ اور جاہل ہوں تو زراعتی تحقیقاتی کام کا کوئی مفید نتیجہ

برآمد نہوگا۔ اس کی مثال ہم کو ہندوستان میں مل سکتی ہے جہاں کے کسان ناخواندہ ہوتے ہیں اور ان کی جہالت اس حد تک پہونچ گئی ہے۔ یہ بالکل نکمے ہوتے ہیں۔ نمایشی کام اور کچھ جو عہدہ داران زراعت کی جانب سے ہوا کرتے ہیں اُن کسانوں تک نہیں پہونچ سکتے جو غیر مشہور اور دور افتادہ مقامات میں رہتے ہیں اگر خوش قسمتی سے یہ اُن تک پہونچ بھی جائیں تو یہ بیچارے ان کا اصل مطلب سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں محکمۂ زراعت کی جانب سے جو رائے مشورے دئے جاتے ہیں ہمدرد نہیں پیدا کر سکتے جب تک کہ کسانوں میں ان کے سمجھنے کی صلاحیت نہ پیدا ہو جائے لہذا تعلیم پہلا اور ضروری زینہ ہے۔ تعلیم سے صرف یہ ہی مقصد نہیں ہے کہ کسان لکھنا پڑھنا اور حساب جان لیں بلکہ تعلیم کا اصلی مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ان کا ذہن اور تعقل اچھی طرح نشو و نما پائیں۔

اس پرآشوب زمانہ میں جب کہ تنازع للبقا بہت شدید ہو گئی ہے لوگوں کو عہدہ تعلیم دی جائے تاکہ وہ اپنا وقار قائم کر سکیں۔ یہ ہر شخص کے لئے ضروری ہے خواہ وہ معمولی کسان ہو یا اہل حرفہ ہو۔ خلاصہ کلام یہ کہ ہر شخص کو اپنے پیشہ میں وسیع معلومات حاصل کرنا چاہئے تاکہ وہ ملک کے لئے گراں نہ ہو بلکہ پیداوار میں مفید ثابت ہو۔

گذشتہ نصف صدی سے حکومت ہند نے تعلیم کی ایک خاص پالیسی اختیار کی ہے تاہم ہندوستان نے تعلیمی شعبہ میں کوئی نمایاں ترقی نہیں کی۔ حسب ذیل اعداد بتلاتے ہیں کہ ہر ملک میں ناخواندہ کی فیصد کیا تعداد ہے ۔

نام ملک	فیصدی
ہندوستان	۹۴
انگلستان اور ویلس	۱۰۸

اسکاٹلینڈ	۱ ر ۶
آئرلینڈ	۱۷ ر ۴
انگلستان	۷ ر ۷

یہ بات نرالی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان دوسرے ممالک سے کسقدر پیچھے ہے اور ہمارے پیش نظر کتنا کام ہے۔ اگرچہ ہندوستانی دیہات میں جاگے ہیں بیدار ہو چکے ہیں۔ صوبجاتی قانونی انجمنوں نے تحریکیں منظور کی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاص خاص رقبوں میں ابتدائی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ اب وہ دن دور نہیں کہ ہندوستان بھی عنقریب ایک ترقی یافتہ ملک ہو جائے گا اور ابتک جو غفلت کاہلی برتی گئی اسکا ازالہ اس طرح مل رہا ہے کہ وہ نہایت جوش و خروش کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہیں۔ مسٹر فنڈلے ناظم اعداد و شمار نے ایک لکچر کے دوران میں جو انہوں نے الہ آباد میں دیا تھا کہا۔

"تعلیم نہایت ضروری اور اشرف شئے ہے کیونکہ تعلیم ہی تمام ترقیوں اور فتوحات کی کنجی ہے اور جتنی بھی قومی ترقیاں ظہور میں آتی ہیں اسی کی بدولت ہوتی ہیں"۔ ملک میں تعلیم کے عام ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں میں یہ خواہش پیدا ہوگی کہ وہ اچھی طرح زندگی بسر کریں۔ اس لئے تعلیم ایسی دی جائے کہ لوگ اپنے پیشوں کو عمدگی سے چلائیں اور ان کے اہل بنیں۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب ثابت ہوں۔ اس کی کامیابی صرف عام تعلیم پر منحصر ہے جو نوجوان طلبار کو دی جاتی ہے۔ قبل اس کے کہ طلبار کسی خاص پیشہ یا فن کیلئے بھیجے جائیں ان کو عام تعلیم اچھی دی جائے اور یہ ہی آیندہ پھلنے اور پھولنے کا راز ہے۔

ہندوستانی نوجوان طلبار پر اکثر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان کو دستی مشاغل سے دلچسپی نہیں ہوتی اور نہ ان کا رجحان اس طرف ہوتا ہے۔ ایسا ہونا

کچھ تعجب انگیز نہیں جب کہ ابتدائی، ثانوی اور کالج کی تعلیم صرف جماعت تک محدود رہتی ہے۔ طلبا کتابوں سے جکڑ دیے جاتے ہیں اور وہ یہ تصور کرتے ہیں کہ علم بغیر کتب کے ممکن نہیں۔ ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے تعلیم کلاس کے باہر ہو سکتی ہے۔ شاذ و نادر ہی طلبا سے خواہش کی جاتی ہے کہ وہ مسودہ باغبانی اور نجاری کا انجام دیں۔ اس قسم کا کوئی خیال ان کے دل میں پیدا ہوتا ہی نہیں جب کہ وہ پھاوڑا یا چھینی تک کو ہاتھ لگانا معیوب سمجھتے ہیں۔

موجودہ طرز تعلیم کا اور ایک نتیجہ یہ ہے کہ طلبا اپنے والدین کے پیشوں سے اجنبیت ظاہر کرتے ہیں۔ ان کو دستی کاموں سے نفرت ہوتی ہے۔

ایک رپورٹ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو "بعض شہادتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تعلیم اہل حرفہ میں پھیلی تو اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ دستی کاموں سے نفرت کرنے لگے اور تعلیمی حالت جب ابتدائی مراحل طے کر کے کچھ بہتر ہوئی تو وہ آبائی پیشوں پر دفتری کام کو ترجیح دینے لگے۔ یہ غلط اور تباہ کن خیالات غلط طریقہ تعلیم کی وجہ پیدا ہوتے ہیں"۔ تعلیم اس نوع کی دی جائے کہ طلبا میں آبائی پیشے اختیار کرنے کی امنگ اور تمنا پیدا ہو۔

حسب ذیل دو نکتے قابل غور ہیں۔

(۱) عام سمجھ میں ترقی ہونے کی کوشش کی جائے۔

(۲) تعلیم میں خصوصیت اور مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ذہن نشین کیجائے تاکہ کاروبار عمدگی اور قابلیت سے چل سکیں۔

پہلا مقصد ابتدائی مدارس کے عام ہونے سے اور دوسرا مقصد خاص خاص مدارس اور کالجوں کے قائم کئے جانے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

پہلا مقصد راستہ صاف کرتا اور ایک مقصد کے لئے طالب علم کو تیار کرتا ہے

اور دوسرا اس کو کام کے قابل بناتا ہے۔ لیکن اس کی تعلیم کا پہلی خاتمہ نہیں ہوتا
یہ خیال کہ اس کو ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے تو یقین مانئے کہ وہ نہایت
ت ہوگا لیکن یہ خیال کہ اس کو اب کچھ سیکھنا نہیں ہے شاہراہ ترقی سے
ہٹا دے کرے گا۔ زراعتی تعلیم دو طرح کی ہو سکتی ہے۔

(۱) سن اشخاص کے لئے (۲) نوجوان طلباء کے لئے

نمبر ۱۔ نمائشی کار اور زراعتی مضامین یہ سب سن رسیدہ اشخاص کے لئے کارآمد ہیں
جو ممالک زراعتی کاروبار میں دلچسپی لیتے ہیں وہ کسانوں کی تعلیم کے حامی ہیں۔ یورپ اور
امریکہ میں پروفیسر اس غرض سے مقرر کئے گئے ہیں کہ مضامین اور اضلاع میں دورہ
کریں اور کسانوں کو ہر طریق سے آگاہ کریں۔

ہندوستان جیسے جاہل ملک میں جہاں کی رعایا بالکل جاہل ہے یہ طریقہ نہایت ہی
مفید ثابت ہوگا ہندوستانی کسانوں کا زیادہ تر حصہ ناخواندہ ہے اور مستقبل قریب میں
اس کی توقع رکھنا کہ وہ چاہ جہالت سے نکلیں گے بعید از قیاس ہے۔ ان میں اگر
تھوڑا بہت حصہ تعلیم کی طرف متوجہ ہے بھی تو ان کی تعلیم ابتدائی مراحل سے آگے نہیں بڑھی
بہرصورت وہ پڑھائی سے فائدہ اُٹھا سکتے۔ ان کے قوائے ذہنی نے نشو و نما
نہیں پائی ہے اور حالت میں زراعتی تعلیم سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔

محکمۂ زراعت صرف مخصوص طریقوں سے کسانوں پر اثر ڈال سکتا ہے وہ
یہ کہ ان کے کھیتوں پر نئی اشیا کے بتلانے کا انتظام کرے اور ان کو کافی موقع دے
کہ وہ ان چیزوں کو بغور دیکھیں۔ مسٹر میکنا نے (AGRICULTURE IN INDIA.) میں
بیان کیا ہے "یہ خیال اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب کہ محکمۂ زراعت ایسے افراد
مقرر کرے جو تمام اضلاع میں گشت لگا کر ان خیالات کو عوام میں پھیلائیں۔ ہر سال
کچھ نہ کچھ رقم ان طریقوں کے رواج دینے اور عام کرنے میں صرف کی جائے۔ ہر ضلع میں

ایک انسپکٹر ہونا چاہیئے اور ہر تعلقہ پر ایک مددگار انسپکٹر (DEMONSTRATION FARM) نمونہ کے فارم ہر تعلقہ میں مناسب مقام پر کھولے جائیں جہاں تجرباتی کام ضرورت نہیں۔ علاوہ اس کے خود مددگار انسپکٹر اپنی زیر نگرانی کام کھیت پر خود نئی نئی باتیں بتلائے۔ زبان ملکی میں رسالہ جات چھاپ کر تقسیم کئے جائیں۔ نمائشی اشیاء ایک خاص حیثیت سے کسانوں پر اثر کریں گی وہ اثر تعلیمی اثر ہوگا اور کسانوں میں مقابلہ کی عمدہ اسپرٹ پیدا ہوگی جو بلحاظ نتائج مفید ثابت ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ اس بات کی کوشش کی جائے کہ دور سے دور رہنے والے زمیندار اور غریب کسان بھی اس سے متمتع ہوں اور محروم نہ رہیں۔

اس خصوص میں زمینداروں کی جماعت سے ملک کو بڑا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ انگلستان کے زمینداروں نے زراعت کو ترقی دینے میں خاصی دلچسپی لی ہے۔ لارڈ ویلنگڈن گورنر بمبئی نے ایک انجمن (DARBAR) قائم کی تھی تاکہ ملک کے معمولی زمیندار اور سربرآوردہ حضرات ان کے قدم بہ قدم چلکر پریسیڈنسی میں زراعت کی ترقی دیں۔ زمینداروں کا فرض اولین ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں نئی نئی اشیاء اور طریقے پیش کریں تاکہ ہمسایہ کسان ان کو اختیار کریں۔

اس لئے ان کو اس میں گہری دلچسپی لینی چاہیے۔ اس میں ان کا ہی فائدہ نہیں ہے بلکہ ملک کی ترقی کا راز اسی میں مضمر ہے۔

پریس بھی ایک نہایت کارآمد مددگار بن سکتا ہے۔ ہندوستان میں فن زراعت پر معدودے چند ہی رسالے نکلتے ہیں۔ برخلاف اس کے دوسرے ممالک مثلاً امریکہ میں اس قسم کے رسالے بیشمار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے ان ممالک میں تعلیم کا بہت چرچا ہے اور تعلیم ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ہر ضلع کی زراعتی کمیٹیوں کی جانب سے میگزین یا اخبار نکلنا چاہیئے جس کا سالانہ چندہ بہت ہی قلیل ہو۔ پونا کی زراعتی انجمن نے

بہت ہی اچھی مثال قائم کی ہے۔ اس انجمن کی جانب سے ایک ماہواری رسالہ
مرحوم کا سالانہ چندہ ایک روپیہ ہے۔ اور یہ رسالہ کاشتکاری زراعتی
م دیتا ہے اس انجمن کی مثال اس قابل ہے کہ دوسری انجمنیں اس کی

کسانوں کو تعلیم دینے کا اور ایک ذریعہ یہ ہے کہ زراعتی انجمنیں قائم کی جائیں
اس قسم کی انجمنوں میں بہترین انجمن آئرلینڈ کی زراعتی انجمن ہے جس کا بانی اور روح رواں
سر ہوریس پلنکیٹ ہے۔

ہندوستان میں اس قسم کی انجمنوں کا قحط نہیں ہے مگر کوئی انجمن بھی اپنے
کام کو بوجہ حسن وجوہ انجام نہیں دے رہی ہے جس کا آئرلینڈ کی زراعتی انجمن سے
مقابلہ کیا جا سکے۔ ہماری انجمنوں کے لئے ایسے افراد کی ضرورت ہے جو دل سے
ملک کے خیر خواہ اور جو پیسہ اور وقت سے مدد کرنے کو تیار ہوں۔ بالفاظ دیگر انجمنیں
اسی وقت کارآمد ثابت ہوں گی جب ملک کے بھی خواہ حضرات اپنا عزیز وقت
اور قوت ان کو کامیاب بنانے میں صرف کریں گے۔ ہر تعلقہ میں اگر دو ایک اشخاص
ایسے پیدا ہو جائیں، تو بہت کچھ کامیابی ہو۔ وہ کسانوں کو رائے مشورہ دے
سکتے ہیں اور نئے نئے اختراعات اور طریقے ان کو بتا سکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ایسے
افراد کی ضرورت ہے جو فراخ دلی سے کسانوں سے ملیں اور ان کا اعتماد حاصل کریں تاکہ
وہ ان کی رائے مشورے پر کاربند ہوں۔ ہر صوبہ میں ایک مرکزی زراعتی انجمن قائم
ہونی چاہئے اور اس کی شاخیں ہر ضلع و تعلقہ کے مستقر پر قائم کی جائیں تاکہ کام میں
یکرنگی و تقویت پیدا ہو۔ کسان اور دیگر دلچسپی لینے والے افراد اس انجمن کے
رکن بنائے جائیں۔

طلبا کی زراعتی تعلیم

یہ تعلیم تین حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔

(۱) کالج کی تعلیم | (۲) ثانوی (۳) ابتدائی

کالج کی تعلیم طلبا کو تحقیقاتی کام کے قابل بناتی ہے اور یہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہے۔ ثانوی تعلیم صرف کسانوں اور زمینداروں کے بچوں کے لئے تجویز کی گئی ہے جو آئندہ پیشہ زراعت اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ زیادہ تر طلبا میں زراعتی عمل علم کا اضافہ کرتی ہے اور ان میں کاروبار و تجارت کا مادہ پیدا کرتی ہے۔

ابتدائی تعلیم طلبا میں زراعت کی طرف رجحان اور رغبت پیدا کرتی ہے اور ان کے لئے وہ معلومات مہیا کرتی ہے جس سے طلبا میں جستجو اور تلاش کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور وہ روزمرہ گھر یا کھیت میں اشیاء دیکھکر ان کے متعلق مختلف سوالات کرتے ہیں اور وہ کافی جواب پانے تک نچلے نہیں بیٹھتے۔

سونچ کی کامل نشوونما اس تعلیم کا مقصد اعلیٰ ہے اگر یہ مطلب حاصل نہ ہو تو سمجھ جائیے کہ یہ تعلیم ناقص اور ادھوری رہے۔ اس لئے [illegible] تعلیم دینا نہایت مفید ثابت ہوگا اگر تعلیم جماعت تک محدود رہے تو تم بھی محدود اور ناقص رہے گی۔ طلبا پہلے اپنے ماحول کا مطالعہ کریں اور اس کے متعلق معلومات حاصل کریں۔ کیونکہ ان کو ان ہی چیزوں سے روزانہ سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ روزانہ کے تجربات سے جو بات حاصل ہوگی وہی علم علم ہوگا اور اسی میں اصلیت کی جھلک نظر آئے گی۔

بہترین وہی مدرسہ وہی ہوگا جو طلبا میں زراعتی روح پھونکے۔ ایسا بھی مدرسہ ہو سکتا ہے جہاں زراعتی تعلیم کا علیحدہ انتظام نہ ہو بلکہ طریقہ تعلیم ایسا ہو کہ خود بخود طلبا میں زراعت کی طرف رغبت پیدا ہو جائے اور روزانہ کی تعلیم کے ذریعہ ان کو زراعتی

تعلیم دیجائے اور مشق کرائی جائے۔ زراعتی کالجوں نے سخت غلطی کی کہ طلبا کو زراعتی عملی حساب کے پڑھنے پر مجبور کیا اور وہ اس بات کو بھول گئے کہ اسپرٹ اور طریقہ تعلیم ہی اس [illegible] بخش سکتے ہیں۔ ہم ان مضامین میں ایسی دلچسپی پیدا کریں کہ طلبا فارغ التحصیل [illegible] کے بعد بلا لحاظ اپنے آبائی پیشے شوق سے اختیار کریں" ہم نے اوپر ہر اشکال پر بحث کی۔ کوئی خاص طریقہ کسی خاص ملک کے لئے تجویز نہیں کیا جا سکتا بلکہ حسب صوابدید ترمیم کی جا سکتی ہے۔

پہلے مقامی حالات کا مطالعہ نہایت ضروری ہے اور مقامی حالات کے مطالعہ کے بعد مدارس قائم کرنا چاہئے۔

سید محمد جواد

جغرافیہ

اس میں شک نہیں کہ جغرافیہ کا مضمون نہایت دلچسپ اور مفید ہوتا ہے لیکن عموماً جس بے عنوانی اور بے لطفی کے ساتھ اس کی تعلیم دی جاتی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے یہ مضمون دوسرے مضامین کے لئے قوت بازو کا کام دیتا ہے۔ ابتدائی جماعت کے طلبا کے حال پر ترس آتا ہے کہ دماغی قویٰ کی ترقی کا آلہ بننے کے بجائے یہ فن دماغی تنزل کا ذریعہ ہو جاتا ہے۔ ذیل میں اس فن کی مختصر تاریخ اس کے فوائد اور چند اصول کا اظہار کیا جاتا ہے جس سے اس فن کی اہمیت اور خوبی کا بہت کچھ پتہ لگ سکے گا۔

جغرافیہ کی تعریف مختلف طریق پر مختلف اوقات میں کی گئی ہے۔

تعریف (۱) جغرافیہ وہ علم ہے جس سے روئے زمین کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔
بعضوں نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے۔
(۲) جغرافیہ روئے زمین کے بالخصوص اُس حصہ کا مطالعہ ہے جو بود و باش انسانی سے وابستہ ہے۔
جغرافیہ کی ایک اور تعریف ہے
(۳) روئے زمین سے متعلق انسانی حالات کے مطالعہ کا نام جغرافیہ ہے۔
تاریخ دور اول۔ زمانہ قدیم میں اکثر جغرافیہ دان اصحاب گزرے ہیں جن میں سے چند مشہور یہ ہیں۔ ہیرو ڈوٹس۔ پلینی۔ اسٹریبو۔ ٹولمی (بطلیموس) ان حضرات نے فن جغرافیہ کو مقامی معلومات جھیل۔ دریا و پہاڑ وغیرہ تک محدود کر دیا تھا۔ جغرافیہ ناموں کی ایک طویل فہرست تھی اور ان ناموں کا تعلق واقعات کے ساتھ وابستہ نہ ہوتا تھا۔ ٹولمی جغرافیہ کا سب سے بڑا ماہر زمانہ قدیم میں گذرا ہے لیکن اُس کے معلومات کرۂ ارض صرف ایشیا یورپ اور افریقہ کے چند حصص تک محدود تھی انہیں معلومات میں ہندوستان کا کچھ حصہ بھی شامل تھا۔ اِن قدیم جغرافیہ دان اصحاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا علم زمانہ وسطیٰ کے جغرافیہ دان حضرات کی نسبت زیادہ صحیح تھا یہ لوگ زمین کو گول مانتے تھے اور ہند کے قدیم ماہران جغرافیہ کی رائے بھی یہی تھی۔
دور دوئم۔ زمانہ وسطیٰ میں جغرافیہ بھی دوسرے فنون کے ساتھ زوال پذیر ہو گیا زمین کے گول ہونے کے خیال کو علمائے نصاریٰ نے خلاف مذہب قرار دیا اور اس امر پر زور دیا گیا کہ انجیل کے مطابق زمین چپٹی ہے اور بحر بیکراں سے محدود ہے زمانہ وسطیٰ کے اخیر اور اُس کے گذرنے کے بعد بھی ایک مدت تک فن جغرافیہ مقامی معلومات تک محدود رہا۔ لیکن سترھویں۔ اٹھارھویں اور بیسویں صدی عیسوی میں جہاں دیگر علوم نے ترقی کی وہاں جغرافیہ میں بھی ایک نمایاں ارتقا ہوئی اور اس کا

شمار ادبی سلسلہ سے نکل کر (جہاں خانقاہی مدارس میں السنہ کے ساتھ اس کی تعلیم دی جاتی تھی) اب سائنس میں ہونے لگا۔ نظام شمسی۔ درجۂ حرارت۔ آب و ہوا اور نباتات و حیوانات کی روئے زمین پر تقسیم وغیرہ امور جغرافیہ کے تحت میں لائے گئے۔ اب اس کا دائرہ اس قدر وسیع ہوگیا کہ مختلف شعبہ سائنس کے اندر اس کا بہت کچھ حصہ آنے لگا اور یہ ہر ایک میں دخیل خیال کیا جانے لگا۔ یہ حد جغرافیہ کی دوسری منزل متصور ہوتی ہے۔

دور سوم۔ تقریباً بیس سال کا عرصہ گذرتا ہے کہ جب سے یہ فن اپنی تیسری منزل میں داخل ہوا ہے اور ایک مکمل سائنس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے اغراض و مقاصد میں جاسکتے ہیں دوسرے فنون کا محتاج نہیں ہے۔ اس فن میں مشاہدات تجربے بھی اعلیٰ پیمانہ پر کئے اور ان کی تصدیق بھی کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ تصدیق جبر مقابلہ کے سوالات اور ہندسے کے نکات کی تصدیق سے مختلف ہے جغرافیائی نتائج کی تصدیق کا دارومدار مقامی آبادی تنزل و ترقی کے وجوہات نادر اشیا کی فراہمی (یا کم از کم ان کی تصاویر) سیاحوں کے سفرناموں نمایش جغرافیہ (بذریعہ سینما) عجائب خانوں کی سیر اور ہمہ اقسام کے نقشہ جات و نمونہ جات پر موقوف ہے۔

جغرافیہ کا شمار اب اُن علوم میں ہونے لگا ہے جو انسانی زندگی کا جزلاینفک علمی حیثیت سے تصور کئے جاتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں صرف جغرافیائی معلومات فراہم کرنے ہی پر اکتفا کیا جاتا تھا۔ لیکن زمانہ موجودہ میں ہر جغرافیائی معاملہ کی تہ تک پہونچنے کی کوشش عمل میں لائی جاتی ہے اور علت و معلول سے بحث کی جاتی ہے۔

فوائد۔ اس فن کا مطالعہ اعلیٰ پیمانہ پر ضبط و تحمل کا سبق دیتا ہے معلومات پر غور و خوض کے لئے ایک معلم کے واسطے کافی گنجایش رکھتا ہے یہ فن قوت حافظہ کو ترقی دیتا ہے۔ قوت استنباط و استدلال ہر دو کو اس سے امداد حاصل ہوتی ہے۔ ممالک کا مقابلہ مختلف عنوان پر کرنے سے کثیر فوائد اس فن سے نکل سکتے ہیں۔

گیکی صاحب کی رائے ہے کہ یہ فن اصول تعلیم میں ایک بڑے نقص کا واقع ہوسکتا ہے۔ قوت مشاہدہ میں اگر نقص واقع ہوا ہو تو یہ فن اس کی تکمیل کا عمدہ ذریعہ ہے ایک دوسرا ماہر فن تحریر کرتا ہے "جغرافیہ قوت متخیلہ کی اصلاح کا ذریعہ ہے تصاویر۔ اشکال اور نقشہ جات اس قوت کو ترقی دیتے ہیں"۔ روحانی کیفیات کی ترقی بھی اس فن کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے کیونکہ کون انسان اتنا بے حس ہوگا کہ عجائبات عالم کے مشاہدہ اور قدرتی مناظر کے اتحاد سے متاثر نہ ہو۔ اور اُن سے کسی اعلیٰ نتیجہ پر نہ پہونچے۔

ہنڈیل صاحب لکھتے ہیں۔

"جغرافیہ انسانی زندگی کے دائرہ کی تکمیل کرتا ہے اور اُس کی انتہائی دلچسپیوں کو فراہم کرتا ہے لیکن یہ دلچسپیاں جغرافیائی ریگستان ٹیلے اور نہر۔ جلید گلے شیر یا برف تشکل نہیں بلکہ انسانی عناصر پر مبنی ہیں"۔

جغرافیہ بعض علوم سے بڑی حد تک وابستہ ہے اور اس اعتبار سے جغرافیہ کا مطالعہ گویا کئی علوم سے روشناس کرا دیتا ہے نقشوں کے کھینچنے۔ نمونہ جات اور تصاویر مہیا کرنے سے طلبہ میں خوبصورتی اور تناسب کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ مزید برآں اخلاق کا سبق بھی اس فن سے بڑی حد تک ملتا ہے۔ اشکال کے کھینچنے میں بردباری اور استقلال کو کام میں لانا پڑتا ہے اور انسان میں جو طبعی عجلت پائی جاتی ہے اس کو قابو میں رکھنا پڑتا ہے۔

زباندانی کی حیثیت سے جغرافیائی مواد مضمون نگاری میں بڑی امداد پہونچا سکتا ہے جغرافیہ علی ہندسہ کے سیکھنے میں بڑی امداد دیتا ہے۔ عملی حیثیت سے اس کا مفید ہونا ثابت کیا جاتا ہے۔

شہریت کی تعلیم امریکہ اور یورپ کے مدارس میں طلبا کو جغرافیہ کے ذریعے سے دیجاتی ہے چنانچہ توسیع زراعت و تجارت۔ جنگ سے واپس شدہ سپاہیوں کو عطیات زمین وغیرہ سے

اہم مسائل پر عملی سوالات جغرافیہ میں طلبا کو دیے جاتے ہیں اس طرح پر جغرافیہ قومی اور شخصی زندگی کی تیاری کا بڑا ذریعہ ہو سکتا ہے۔

جرمنی نے جغرافیہ کی عمدہ تعلیم کی بدولت چالیس برس کے اندر اندر وہ تجارتی ترقی کی کہ دنیا دیکھکر محو حیرت ہو گئی

ممالک متحدہ امریکہ دوسرا ملک ہے جس نے جغرافیہ کی عمدہ تعلیم کی بنا پر تجارتی ترقی حاصل کی ہے۔

جغرافیہ اُن حیرت انگیز فطری واقعات کا معدن ہے جو دنیا میں گذر چکے ہیں یا گذرتے ہیں۔ وخانی جہاز اور دوسری ایجادات کے قصوں کی طرح جغرافیائی اسباق جن سے کرہ جماعت کے اندر قدرت پر انسانی فتح کا اظہار ہوتا ہے۔ حیرت انگیز ہوتے ہیں یہ اسباق اس امر کی تشریح کرتے ہیں کہ ایک معمولی انسان نے باوجود ہر طرح کی قدرتی اور دیگر مشکلات کے اپنا ترقی کا راستہ کس طرح صاف کیا ہے اور وہ موجودہ ترقی تک کس طرح پہونچا ہے۔

چند ضروری امور طریقۂ تعلیم جغرافیہ کے متعلق ظاہر کر دیے جاتے ہیں۔

ایک صاحب کی رائے ہے کہ جغرافیہ سکھلانے میں بڑی غلطی اُس وقت ہوتی ہے جبکہ معلوم سے نامعلوم کی طرف جانے کے بجائے اُس کے برعکس طریقہ کو اختیار کیا جاتا ہے جغرافیہ کی ابتدا اُن چیزوں سے کرائی جائے جو بچوں کے گرد و پیش میں واقع ہوں قصبہ کے بازار۔ مدرسہ کی عمارت و شارع عام کا حال اُن کو بتلایا جاوے۔ دریا۔ پہاڑ جھیل وغیرہ کی تعریفات کا رٹوانا تضیع اوقات کا باعث ہے۔ پہلے قصبہ کے معلومات اس کے بعد تعلقہ و ضلع وغیرہ کے حالات سبق میں لئے جاویں۔ جہاں تک ممکن ہو مشاہدہ کرایا جاوے۔ جہاں یہ ممکن نہ ہو نقشہ جات و نمونہ جات سے کام لیا جاوے اسباق میں صرف نصاب کو کافی نہ تصور کیا جاوے بلکہ سفرناموں اور دیگر ذرائع سے جو معلومات

بہم پہونچ سکیں کام میں لائی جاویں

جس قدر واقعات سکھلائے جاویں تختہ سیاہ پر درج کئے جاویں۔

ابتدائی جماعتوں میں نقشہ جات کا کھنچوانا مفید نہیں ہے (بلکہ مدرسہ اور کھیل کے میدان کے نقشے یا اس قسم کے دوسرے نقشے اُن سے کھنچوانا چاہئے) چھپے ہوئے نقشہ جات پر مقامات کا دیکھنا اور خاکہ کی خانہ پوری کرنا ہی کافی ہے۔

اعلیٰ جماعتوں میں نقشہ جات کا کھنچوایا جانا زیادہ کار آمد ہے کیونکہ اُس وقت تک مختلف ممالک کے خاکے طلباء کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ یادداشت پر زور نہیں پڑتا اور بآسانی نقشہ کھینچ سکتے ہیں نقشہ کشی طریقہ تعلیم کا عمدہ ذریعہ اور اچھی مشق ہے اس سے ہاتھ کی صفائی۔ شئے کی ٹھیک وضاحت۔ اور جغرافیائی تفصیل سے اُنسیت کا سبق ملتا ہے

اعلیٰ جماعتوں میں مختلف ممالک کا مقابلہ کرا کر اسباق کو دلچسپ بنایا جائے اور ایسے سوالات دئے جاویں جس سے بخوبی اندازہ ہو سکے کہ طلباء اپنی دماغی قوت بھی جوابات کے نکالنے میں صرف کرتے ہیں یا صرف رٹی ہوئی باتوں تک اُن کا علم محدود ہے اُن کو سوالات اس قسم کے دئے جاویں۔

(۱) مغربی یورپ کی آب و ہوا کا مقابلہ شمالی امریکہ کے مغربی حصہ سے کرو اور وجہ اختلاف کی تشریح کرو۔

(۲) گنجان آبادی اور لوگوں کے مشاغل کن مختلف جغرافیائی آثار پر موقوف ہیں مفصل تمثیل بیان کرو۔

(۳) لندن۔ ڈرسڈن اور کیف قریب قریب ایک ہی ارض البلد پر واقع ہیں پھر بھی آب و ہوا میں بڑا اختلاف ہے اس کی وجہ کیا ہے۔

(۴) یورپ اور افریقہ کے اُن ممالک کو جو بحر روم پر واقع ہیں مخصوص جغرافیائی خطہ سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ خصوصیات کیا ہیں جن کی بنا پر یہ تقسیم عمل میں آئی ہے

مدرسین کے چند عذرات کا تصفیہ

مدارس کے معائنہ کے وقت جب کبھی مدرسین سے باز پرس کا موقع آتا ہے تو وہ بعض عام عذرات پیش کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ان کا اظہار تمام ذمہ داریوں سے بری کر دیتا ہے۔ بعض اوقات تو مدرسین مدرسوں کے نقائص سے واقف ہوتے ہیں اور ان کے رفع کرنے کی تدبیریں بھی جانتے ہیں۔ مگر یہ سمجھکر کہ عذرات گھڑے گھڑائے موجود ہیں کسی قسم کی کوشش نہیں کرتے بعض زیرک اصحاب کوشش کی تدبیروں کے بجائے قبل از قبل عذرات سوچ لیتے ہیں۔ اور غالباً اس خیال خام میں رہتے ہیں۔ کہ معتمم جو سال میں ایک مرتبہ مدرسہ کا معائنہ کرتا ہے۔ ان کے عذرات کے سچ یا جھوٹ کو کیا پہچان سکتا ہے۔ یہ سادہ لوح نہیں جانتے کہ وہ ایک چاول کو دیکھکر دیگ کی حالت پہچاننے والا ہے۔ اس مضمون میں چند عام عذرات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اور ان کے رفع کرنے کے طریقے بتلائے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ یہ عذرات نہیں پیش کئے جائیں گے۔ بلکہ یہ بتلایا جائے گا کہ ان کے ارتفاع کیلئے کس قدر کوشش کی گئی۔

(۱) رعایا کو تعلیم کا شوق نہیں جب کبھی یہ اعتراضات کئے جاتے ہیں کہ آبادی کے لحاظ سے طلبار کی تعداد کیوں کم ہے؟ حاضری کے کم ہونے کی کیا وجہ ہے؟ مختلف قوموں کے طلبار کی تعداد آبادی کی مناسبت سے نہونے کا کیا سبب ہے؟ تمام طلبا کے پاس کتابیں بیاضیں سلیٹیں کیوں نہیں؟ طلبہ وقت پر مدرسہ کیوں نہیں آتے؟ تو سب کا ایک جواب ملتا ہے۔ کہ "رعایا کو شوق نہیں" مگر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آپ نے کیا کوشش کی

تو بعض تو لاجواب ہو کر سر نیچا کر لیتے ہیں۔ بعض اور عذرات پیش کرتے ہیں۔ جو گناہ سے بدتر ہوتے ہیں۔

میں اس عذر کو تسلیم کرتا ہوں کہ رعایا کو شوق نہیں ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ تبلا ضروری سمجھتا ہوں کہ مدرسوں کا قیام مدرسین کا تقرر۔ ناظروں اور مہتموں کی ماموری۔ یہ تمام انتظامات اسی بے شوقی کے ازالہ کے لئے ہیں۔ اگر رعایا کو شوق ہوتا تو ان کی ضرورت نہ ہوتی۔ رعایا خود مدرسے قائم کرتی۔ مدرسین مقرر کرتی۔ اور اُستادوں کی خوشامد کرتی ان سے عزت سے پیش آتی۔ مگر اسے شوق نہیں ہے اور یہ ممکن نہیں کہ حکومت جو زمانہ کے تیور پہچانتی ہے۔ اور دیگر اقوام کی ترقی کے راز سے واقف ہے۔ خاموش ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی یہ کہا کرے کہ رعایا کو شوق نہیں! رعایا کو شوق نہیں!! مدرسین تو اس مرض کے رفع کرنے کے لئے ہیں۔ بھلا خیال تو کیجئے اس ڈاکٹر پر کس قدر ہنسی اڑے گی جو ایک وبا کے رفع کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ مگر کوئی کوشش نہیں کرتا۔ اور جب کبھی باز پرس ہوتی ہے تو جواب دیتا ہے۔ "صاحب میں کیا کروں وبا موجود ہے"۔ مناسب ہے کہ مدرسین آئندہ اس عذر کو ہرگز نہ پیش کریں۔ بلکہ یہ تبلائیں کہ انہوں نے کس قدر کوشش کی ہیں۔ اور میری رائے یہ ہے کہ مہتمم صاحبان بھی ایسا سوال کر کے کہ "تعداد کیوں کم ہے" انہیں اس عذر کا موقع نہ دیں بلکہ دریافت کریں کہ کس قدر سعی کی گئی۔ سطور ذیل میں چند قابل عمل تجویزیں بتلائی جاتی ہیں۔ جن سے نقائص مذکورہ بالا رفع ہو سکتے ہیں۔

(۱) مدرسین بلا اجازت۔ باضابطہ مدرسہ سے غیر حاضر نہ رہیں۔ بے وجہ رخصت نہ لیں۔ مدرسہ اوقات مقررہ پر کریں۔ آپس میں ہل مل کر رہیں۔ تعلیم کے وقت تعلیم دیں اور کھیل کے وقت کھلائیں۔ کسی طالب علم کے ساتھ بے جا رعایت نہ کریں ہر طالب علم پر مساوی نظر شفقت رکھیں۔ بچوں کی شوخی کو بُرا نہ سمجھیں ان کی تمام دل میں پرورش نہ کریں اور امتحان کے وقت بدلہ نہ لیں۔ مختصر یہ ہے کہ

اپنے فرائض دیانت داری، مستعدی اور محنت سے انجام دیں۔ جذبات اسفل کو اپنی طبیعت پر غالب نہ ہونے دیں بعض اوقات ان میں سے کوئی ایک سبب یا تمام اسباب مل کر مدرسہ کو ابتر کر دیتے ہیں۔ یوں اپنے معاملات میں رعایا دقت کا خیال نہ کرے مگر مدرسین کی حاضری کا بہت خیال رکھتی ہے۔ اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں پیدا ہوتی ہے کہ وقتاً فوقتاً مدرسین کو اس سے تنبیہ کرتی رہے مگر دل میں خیال رکھتی ہے۔ اور مدرسہ پر نامعلوم طور پر یہ اثر ہوتا رہتا ہے۔

(۲) مدرسین کو موجودہ حالات میں اپنے دو فرائض سمجھنا چاہئیں۔ ایک تعلیم دوسرا ترغیب تعلیم۔ وہ یہ نہ خیال کریں کہ ان کا کام صرف حاضر طلبہ کو تعلیم دینا ہے ابھی ان کا کام بچوں اور باپوں۔ دونوں کو تعلیم دینا ہے صرف فرق اتنا ہے ایک کے قوائے کی تربیت منظور ہے۔ اور ایک کو سمجھانا ہے کہ تعلیم کس قدر ضروری ہے انہیں صاف طور سے مگر درد آمیز لہجہ میں بتلا دینا چاہئے کہ ان کی زندگی تو جیسے تیسے گذر گئی۔ اور جو رہی ہے۔ وہ بھی بسر ہو جائے گی۔ مگر ان بچوں کو ابھی دنیا میں رہنا ہے۔ عالم میں تبدیلی ہو رہی ہے۔ اگلے زمانے میں جوانی تک تفکرات معاش سے بے پرواہ رہتے تھے۔ آج بہت ہی کم عمری میں فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ آثار بتلا رہے ہیں کہ آئندہ زندگی نہایت پیچیدہ ہوگی۔ اس کی الجھنوں سے وہی بچ سکیں گے جو عقل و علم سے بہرہ ور ہوں گے۔

ترغیب تعلیم کے طریقہ بھی بہت سوچ سمجھکر اختیار کرنا چاہئے۔ والدین کو علم کے فوائد بتلانے۔ ان سے ملکر بچوں کو مدرسہ بھیجنے کے لئے کہئے۔ سرکار کا خوف دلا کر بچوں کو مدرسہ بلانے کے طریقے بہت کم کارگر ثابت ہوئے ہیں بھلا کو علم کے فوائد بتلانا ایک بے سود کوشش ہے۔ یہ باتیں مطلق ان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ ان کے سر ہلانے یا بچوں کو مدرسہ بھیجنے کے لئے آمادگی ظاہر کرنے پر آپ کی تقریر کی تعریف کرنے سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ

وہ علم کے فوائد سمجھ گئے۔ یہ جو کچھ کرتے ہیں اوپری دل سے کرتے ہیں۔ ان کے دماغ میں کچھ نہیں اُترتا۔ دوسرے اُن سے مل کر بچوں کو مدرسہ بھیجنے کیلئے کہنا اس وقت تو مفید ہو جاتا ہے۔ جب مدرس کے اور مخاطب کے تعلقات اچھے ہوں۔ مگر ذرا بھی بیگانگی ہو تو اثر نہیں ہوتا بعض اوقات مدرس کو ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ جاہل باپ سمجھتا ہے۔ کہ میں بہت بڑا آدمی ہوں۔ یہ خوشامد کرتے ہیں یہ انانیت کا جذبہ تعلیم کی طرف سے بالکل اندھا کر دیتا ہے۔ اور بعض اوقات اس قسم کی طرز تشویق کا الٹا اثر پڑتا ہے۔ بعض مدرسین والدین کو سرکار کا خوف دلاتے ہیں یہ مناسب نہیں۔ یہ کاٹھ کی ہنڈیا بار بار چولھے پر نہیں چڑھ سکتی۔ اس میں یہ بھی اندیشہ ہے کہ اگر بھرم کھل جائے تو مدرس صاحب کی کوشش بار آور نہ ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ مندرجہ ذیل طریقے اختیار کئے جائیں۔

(۱) تقسیم انعامات اعلیحضرت بندگانعالی متعالی کی سالگرہ اور اعلان خود مختاری کی تقریبات پر جلسے کئے جائیں تقسیم انعام کے جلسے میں مدرسہ کی رپورٹ سنائی جائے۔ پبلک میں سے جن اصحاب نے دوران سال میں امداد کی ہے۔ ان کا ذکر خیر کیا جائے۔ طلبہ کو اردو اور ملکی زبان میں ترانہ وطن یاد کرایا جائے۔ نیز دوسری اخلاقی نظمیں یاد کرائی جائیں مکالمات ہوں۔ اگر یہ خود مدرسین کی تالیف یا تصنیف ہوں تو بہتر ہے۔ مدرسین کو چاہئے کہ ایسے مکالمے تیار کریں جو حالات مقامی کے لحاظ سے ضروری ہوں کسی میں یہ بتلائیں کہ لڑکا تعلیم کا خواہش مند ہے۔ مگر باپ مدرسہ نہیں بھیجتا۔ کسی میں بتلائیں کہ کس طرح جہل کا شکار جعلی رسید سے بننے کے دھوکے میں آتا ہے۔ طلباء سے صفائی پر دیانت داری پر بدتمیزی پر مختصر مضامین پڑھوائیں۔ موضع کے کسی پڑھے لکھے شخص کو ایک آدھ مفید مضمون پر تقریر کرنے کے لئے آمادہ کریں۔

(۲) مدرسین کو موضع کے باشندوں سے مل جل کر رہنا چاہئے۔ یہ میل جول جہاں تک ہو سکے بے لوث ہو۔ غرض کا شائبہ اکثر ملاپ میں عیب پیدا کرتا ہے۔ اس سے میری مراد

یہ نہیں کہ اگر وقت پڑے تو طالب امداد نہ ہو۔ میرا منشا صرف یہ ہے کہ ابتدا ہی سے غرض کو مدنظر رکھکر دوستی نہ پیدا کی جائے۔ اور اگر کوئی شخص غرض پوری نہ کر سکے تو اسے دل میں جگہ نہ دینا چاہئے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ دنیا ہے۔ ہر ایک آدمی اس کی کمزوریات میں مبتلا ہے۔ شاید کوئی ایسی ہی مجبوری ہے کہ وہ امداد سے قاصر ہے۔ بالفاظ دیگر ہمیشہ نیک گمان رہنا چاہئے۔ جب تک متعدد بار کسی کی بدنفسی ظاہر نہ ہو جائے اس وقت تک بدظن نہ ہونا چاہئے بشری کمزوریوں کو ہمیشہ مدنظر رکھکر اپنا کام کرنا چاہئے

اہالیان دہ جہالت کی وجہ سے اکثر حسد اور تعصب کے شکار رہتے ہیں۔ مشکل سے کوئی گاؤں ایسا ہوگا جہاں دو تین پارٹیاں نہ ہوں بھائیوں میں جنگ ہوتی ہے خاندانوں میں مقدمے چلتے ہیں۔ مدرسین کو ان میں سے کسی کی جانب داری نہ کرنا چاہئے سب سے الگ رہنا چاہئے ان کا فیض سب کے لئے عام ہے بعض اوقات مدرسین کسی پارٹی کی طرف داری کرنے لگتے ہیں تو خود ذلیل ہوتے ہیں۔ مدرسہ ابتر ہوتا ہے اور پھر محضر اور درخواستوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔

مدرسین جب ملازمت اختیار کریں تو انہیں اپنے فرائض کو حسن و خوبی سے انجام دینے کی حتی الوسع کوشش کرنا چاہئے مطالعہ کتب جس قدر ممکن ہو کرنا چاہئے رعایا جاہل ضرور ہوتی ہے مگر علم کے اثر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ میں نے اب تک کسی ایسے مدرسے کو ابتر نہیں دیکھا۔ جس کے مدرسین یا کم از کم صدر مدرس میں مطالعہ کتب کا شوق تھا۔ اور طلبا کو توجہ سے تعلیم دیتا ہے مدرسین کو کسی اور دھندے میں ہرگز نہ پھنسنا چاہئے۔ اس سے ایک طرف تو رعایا سے غرض آمیز تعلقات پیدا ہونیکی وجہ سے مشکلات رونما ہوتی ہیں۔ دوسرے فرائض منصبی کی انجام دہی میں کوتاہی ہونے لگتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جب سررشتہ تعلیمات کی تنخواہ سے گذر اوقات نہ ہو سکے استعفا پیش کر دینا چاہئے۔

بعض مدرسین میں ایک اور بُرا عیب ہوتا ہے۔ کہ طلبا، کے گھروں سے بعض اشیا، طلب کرتے ہیں۔ کسی کے مکان سے آچار منگاتے ہیں اور کسی سے جوار۔ یہ زمانہ گذشتہ میں ملّا اور پنڈت کیا کرتے تھے۔ مگر اُس وقت ان لوگوں کو تنخواہیں یا تو ملتی ہی نہ تھیں یا بہت کم ملتی تھیں۔ خیر خیرات کا عام رواج تھا۔ اس قسم سے دینا والدین اپنا فخر سمجھتے تھے۔ مگر اب خیالات میں تبدیلی ہوگئی ہے۔ مدرسین کو ماہ بماہ سرکار سے تنخواہ ملتی ہے اس لئے رعایا کو اس قسم سے دینا بہت بارگذرتا ہے اور مدرسین ان کی نظروں میں ذلیل ہو جاتے ہیں۔ مدرس کے لئے تو دست طلب ہی دراز کرنا مناسب نہیں چہ جائے کہ وہ خیرات مانگے۔

(۲) "اصول کے ساتھ تعلیم دینے سے نصاب مقررہ ختم نہیں ہوتا"

ٹرینڈ مدرسین اکثر نارمل اسکولوں سے واپس ہوتے ہی وہی اپنے قدیم طریقوں سے تعلیم دینا شروع کر دیتے ہیں اور جب اعتراض کیا جاتا ہے تو جواب دیتے ہیں کہ تاریخ امتحان تک مقررہ نصاب ختم نہیں ہو سکتا۔ ایک گھنٹہ میں ضروری سبق ختم نہیں ہوتا اور جو کچھ ہوتا ہے۔ بہت کم ہوتا ہے۔ مدرسہ میں کافی آلات تعلیمی موجود نہیں مکان مدرسہ ناموزوں ہے دیہاتی لوگ پسند نہیں کرتے اور تعجب ہے کہ بعض بعض مہتمم صاحبان بھی ایسے چند اعتراض کرتے ہیں۔ اور بعض اوقات ٹرینڈ مدرسین پر فقرے کستے ہیں۔

یہ اعتراضات اصول تعلیم سے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کا نتیجہ ہیں۔ اور خدا بھلا کرے امتحانات کے طریقوں نے انہیں اور تقویت پہونچا دی ہے۔ میں اس وقت امتحانات کے بارے میں کچھ نہیں لکھتا یہ سمجھکر کہ جس طرح انسان نے حضرت دماغ کی بدولت اور بہت سی مصیبتیں مفت مول لے لی ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ہے اور جب تک کوئی بدل نہ ہو اسے برداشت کرنا پڑے گا۔ اس لئے یہ تسلیم کرکے کہ طلبا

امتحان دینا لازمی ہے۔ اعتراضات بالا کا جواب درج کرتا ہوں۔

(الف) اصول تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ طلبا میں خود علم حاصل کرنے کی قابلیت پیدا ہو ایک سبق اسطرح پڑھایا جائے کہ [illegible] اس لئے اگر مدرس واقعی یہ پابندی اصول تعلیم دے۔ تو مدرس کو خود جماعت میں نصاب ختم کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی طلبا خود بخود ختم کرلیں گے۔ مثلاً زبان دانی میں پڑھائی کو لیجئے۔ کیا شروع کتاب سے اخیر تک ہر سبق میں نئے الفاظ ہوتے ہیں؟ کیا ہر ایک سبق کی عبارت کا مطلب بالکل اس طرح علیحدہ ہوتا ہے۔ جس طرح ایک مکان میں بلا دروازے دیواریں کھڑی کرکے تمام حجرے علیحدہ علیحدہ کردئے ہوں۔ یہاں تک کہ ایک کی ہوا تک دوسرے میں نہ جاسکے؟ ایسا نہیں ہوتا بلکہ اکثر الفاظ دھرائے جاتے ہیں۔ محاورات کا بار بار استعمال ہوتا ہے۔ الفاظ کی نشست کی تکرار ہوتی ہے اس لئے اگر ابتدا ہی سے اصول تعلیم کے مطابق پڑھایا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جیسے جیسے طلبا آگے بڑھتے جائیں گے زیادہ زیادہ سبق لیتے جائیں گے یہاں تک کہ اخیر میں طلبا خود پڑھنے لگیں گے اور اگر ابتداً چار سطر سے سبق شروع کیا گیا ہے تو۔ اخیر میں چل کر ایک صفحہ سے زیادہ خود نکالنے لگیں گے۔ البتہ مدرس کو اسبات کا خیال رکھنا چاہئے کہ طلبہ کو وہ باتیں بتلانے میں وقت ضائع نہ کرے جو وہ جانتے ہیں۔ یہ نہایت ضروری ہے اکثر اوقات مدرسین ایسی باتیں بتلانے میں ناحق بہت وقت ضائع کرتے ہیں جن سے طلبا واقف ہوتے ہیں مدرس کو چاہئے کہ اپنے ذہن پر قابو رکھے اسے آوارہ نہ ہونے دے

اسی طرح حساب کو لیجئے۔ اگر طلبا کو اصول اچھی طرح ابتداً ہی سمجھا دئے جائیں اور مناسب تعداد میں سوالات حل کرادئے جائیں۔ تو ان میں وہ قوت پیدا ہوسکتی ہے کہ پھر انہیں کسی بھی کتاب سے سوال دیا جائے وہ حل کردیں گے یہی حالت دیگر مضامین کی ہے مدرسین یہ اعتراض کرتے وقت اس تضیع اوقات کو بھول جاتے ہیں جو بار بار

اعادہ کرنے سے ہوتی ہے۔ پہلے بہت بہت سبق پڑھا دیتے ہیں۔ مگر جب دیکھتے ہیں کہ یاد نہیں ہوا تو پھر دھرلاتے ہیں۔ اس طرح کورس ختم ہو جاتا ہے۔ مگر جو کچھ بچوں کو یاد ہوتا ہے اس کی یہی حالت ہوتی ہے۔ کہ اگر پوچھو زمین کی تو بتائیں آسمان کی اس لئے بجائے بار بار اعادہ کے ابتدا ہی سے قدم جمائے ہوئے چلیں تو ایک تو کورس ختم ہو جائے گا دوسرے یاد رہے گا۔

مدرسین خود اگر اپنے تجربہ پر غور کریں تو انہیں اس اعتراض کا خود بخود جواب مل جائے گا کیا انہوں نے وہ تمام کتابیں مدرسہ میں پڑھی تھیں جنہیں اب پڑھ سکتے ہیں؟ نہیں پڑھی تھیں یہ اسی قابلیت کی بدولت ہے۔ جو مدرسہ میں پیدا ہوئی تھی گو یہ قابلیت ناقص ہے۔ مگر اس امر کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ طلبا میں آگے نکالنے کی قابلیت تعلیم سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر طریقہ اچھا ہو تو بہتر طور سے ہوتی ہے۔ اور روز بروز مقدار سبق بڑھ سکتی ہے یہاں تک کہ امتحان تک کورس بخیر و خوبی ختم ہو سکتا ہے۔

گھنٹہ بھر میں سبق ختم نہ ہونے کا اعتراض بالکل بے جا ہے۔ اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدرس صاحب گھر سے تیار ہو کر نہیں آئے ہیں۔ ان میں یہ قابلیت نہیں کہ بلحاظ وقت مقدار سبق کا اندازہ کر سکیں ایسا شخص مدرسی کا اہل نہیں۔ تیاری سبق کے بارے میں مدرسین کا ایک اعتراض ہے۔ اور اس میں کچھ قوت بھی ہے کہ ایک مدرس کے پاس بعض اوقات دو جماعتیں ہوتی ہیں۔ اور مقدر مضامین ہوتے ہیں میں اس کا حامی ہوں کہ ایک مدرس کے پاس ایک جماعت سے زائد نہ ہونی چاہئے یہ ممکن نہیں مدرسین کو چاہئے کہ کم از کم ایک سبق کے روزانہ مختصر نوٹ لکھ لیا کریں اس وقت یہ افسوسناک نظارہ پیش نہ ہوگا کہ اٹھارہ برس کی طالبہ ہو جائے اور جہل کا تصور نہ کر سکیں نہ ہو۔

یہ اعتراض کہ آلات تعلیمی بہت کم ہوتے ہیں۔ اور کرایہ کے مکانات مدرسہ کے لئے

موزوں نہیں ہوتے۔ غور طلب ہے۔ آج کل غالباً ہر ایک مدرسہ میں آلات تعلیمی کافی ہیں۔ اور روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اگر بعض ضروری سامان موجود نہ ہو تو مدرسین ذرا سی کوشش سے بہم پہونچا سکتے ہیں۔ مثلاً اگر بالفرض نہ ہو تو موٹے موٹے کنکر چنیں۔ اور گولیوں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اگر حیدرآباد ریاست کا نقشہ موجود نہ ہو تو مدرسین صاحب۔ خود ایک تیار کر سکتے ہیں۔ البتہ مکانات کا مسئلہ ان کے بس کا نہیں۔ جب تک محکمہ اس جانب خاص طور سے توجہ نہ کرے۔ یہ خاطر خواہ حل نہیں ہو سکتا مگر یہ ہو سکتا ہے کہ صدر مدرس مالکان مکان سے مناسب ترمیم کرالیں۔ دوسرے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اصول و قواعد تمام دنیا کے لئے ایک نہیں ہوتے تعلیم معاشرت کا ایک جزو ہے۔ معاشرت بلحاظ مکان و زبان بدلتی رہتی ہے۔ بہترین اصول تعلیم وہ ہوتے ہیں۔ جو موجودہ حالات اور آیندہ ضروریات قوم و ملک کا بغور مشاہدہ کرکے مرتب کئے جائیں اس اعتبار سے اس ملک میں تعلیم کے لئے اصول ترتیب دنیا باقی ہیں۔ اور اس کے لئے یہاں کے حالات ہی دیکھنا چاہئیں غیر ممالک کے نظامات تعلیمی اسی وقت مفید ہو سکتے ہیں جب وہ حالات ملک کے مناسب ہوں مدرسین کو چاہئے کہ اردگرد کے حالات دیکھیں۔ مدارس تعلیم المعلمین میں جو کچھ سکھایا ہے اس پر غور کریں غیر ممالک نے جو کچھ تعلیم میں ترقی کی ہے اس کا مطالعہ کریں اور اہالیان وہ کی آیندہ ضروریات کا اندازہ کرکے ایسے اصول و قواعد مرتب کریں جو انہیں کم سے کم وقت میں قلیل سے قلیل صرف دماغ سے ممکنہ دلکش طریق پر بچوں کی تعلیم ہو سکے۔ اصول و طریقہ عمل کے لئے ہوں ذہن کے مزے کیلئے نہوں۔ ایسے کوئی مادی نتیجہ برآمد ہونا چاہئے۔ خیالی عمارت ہی بن کر نہ رہجائے یہ اعتراض کہ دیہاتی ان طریقوں کو پسند نہیں کرتے۔ وہ چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے گھنٹہ میں اجلنی ہو۔ اور جماعت صغیر میں جب تک یہ تیس تک نہ ہو جائے۔ دوسرا

ایک حرف نہ سکھایا جائے یہ دیہاتیوں کا اعتراض ہے، جہالت سے صاف ٹپکتی ہے اسے تو سننا ہی نہ چاہئے۔ اگر مدرسہ سے طلبا کو اٹھالیں تو انہیں بخوشی اجازت دیجائے مگر یاد رکھئے۔ مدرسیں اس کی آڑ میں اپنی غفلت اور بے علمی کو محفوظ نہیں رکھ سکتے ممکن ہے کہ ایک آدھ مرتبہ یہ عذر تسلیم کرلیا جائے۔ مگر ہمیشہ کارگر نہیں ہوسکتا میں نے دیکھا ہے کہ جن مدارس میں قابل۔ فرض شناس۔ ملنسار۔ اور محنتی مدرسین ہیں وہاں کی رعایا کو ایسی کوئی شکایت نہیں ہوتی ایسا عذر کرنے والے مدرس میں خود کچھ نقص ہوتا ہے ورنہ رعایا کتنی ہی جاہل ہو۔ اتنی بے عقل نہیں، کہ مفت تعلیم چھوڑ کر پیسے خرچ کرے گی اگر بدقسمتی سے کہیں ایسا ہو بھی تو مناسب طور سے سمجھانے سے اعتراض رفع ہوسکتا ہے

(۳) "والدین تاریخ وجغرافیہ کی تعلیم نہیں چاہتے"

مواضعات میں یہ اکثر اعتراض ہوتا ہے بعض والدین نے خود مجھے آکر کہا ہے کہ صاحب ہم اپنے بچے کو (یف اے۔ بی اے) بنانا تو چاہتے ہی نہیں۔ پھر یہ جغرافیہ وتاریخ کیوں پڑھائی جاتی ہے۔ ہم تو کنبی کسان ہیں۔ لکھنا پڑھنا۔ حساب آگیا تو کافی ہے۔ اس اعتراض میں کچھ جان بھی ہے۔ واقعی بظاہر پرائمری مدارس کے بچوں کو ان مضامین کی تعلیم کی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی۔ ان کی کسی پیشہ میں ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن جو لوگ ان دیہاتیوں کو بغور دیکھتے ہیں۔ انہیں افسوس ہوتا ہے باوجودے کہ ان کو خدا نے خلعت انسانی عطا فرمائی ہے۔ مگر ان میں بہت کم ایسی باتیں ہیں جو انسانیت پر دلیل کرسکتی ہیں۔ ان میں سوائے چند اوصاف وحشیانہ کے جن کی تعریف سفرناموں میں اکثر ہوتی ہے۔ کوئی لطیف جذبہ موجود نہیں عدالتوں سے دریافت کیا جائے۔ معلوم ہوگا کہ آئے دن۔ زن۔ زر۔ زمین کے لئے مقدمات ہوتے رہتے ہیں گاؤں میں پارٹیاں ہیں۔ اور ایک دوسرے کے خون کی پیاسی

ذرا سی ضد پر کشت وخون ہو جاتا ہے۔ ایک معمولی سی بات پر مقدمہ بازی میں گھر بار سب لٹا دیا جاتا ہے۔ نظروں میں وسعت نہیں۔ دلوں میں جذبات اعلیٰ نہیں خیالات میں رواداری نہیں۔ اس کے علاوہ حالانکہ دن رات محنت کرتے ہیں مگر جب دیکھو تو مفلس کے مفلس انہیں یہ معلوم نہیں کہ ان کے گاؤں سے بیس تیس میل کے فاصلے کپاس کا کیا بھاؤ ہے یا تیس میل پر جوار کس نرخ سے بک رہی ہے۔ اور اس تمام پر طرہ اوہام پرستی کا ہے ایسے ایسے رسم ورواج ابتک جاری ہیں کہ خدا کی پناہ۔ مختصر یہ ہے یہ اور اس قسم کی بہت سی ایسی باتیں دیہاتیوں میں موجود ہیں۔ جو صرف تاریخ وجغرافیہ ہی کی صحیح تعلیم سے رفع ہو سکتی ہیں۔ مگر دیہاتی ان تمام باتوں کو نہیں سمجھ سکتے ان کے لئے یہ تمام گفتگو بے سود ہے۔ ان کے سمجھانے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ مدرسہ میں بلا کر خوبصورت تصاویر اور نقشہ جات تیار کئے جائیں۔ انگریزوں اور جرمنوں کے ملک دکھائے جائیں جب کوئی حادثہ کسی ملک میں ہو مثلاً زلزلہ آئے جنگ ہو تو وہ مقامات نقشہ میں بتلائے جائیں۔ ایسے مواقع پر تاریخ کی ضرورت ان کے ذہن نشین کی جا سکتی ہے جلسہ میں نقشہ جات اویزاں کئے جائیں۔ تاریخی مکالمہ ہوں بعض اوقات تقریبات کے موقع پر ان کو تاریخ بتلائی جائے اپنے مذہبی تہوار۔ ملکی تقریبات جشنوں کے مواقع پر ان کی ابتدا وغیرہ کے واقعات بتلا کر تاریخ کی ضرورت بتلائی جا سکتی ہے مجھے امید ہے کہ چند روز تک اگر یہ کوشش کی گئی تو اعتراض رفع ہو جائیں گے۔ بیشک بعض مقامات میں ہوا ہے اگر اس پر بھی نہ سمجھیں۔ تو ان سے یہ کہا جائے کہ اگر ان سامانوں کے علاوہ جو تم چاہتے ہو ہم نفع میں اور باتیں سکھا دیں تو کیا برائی ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ آخری جواب ہے۔

(۴) "خانگی مدرسہ"

بعض اوقات جب مدرسہ کی کمی تعداد پر باز پرس کی جاتی ہے تو جواب ملتا ہے کہ

خانگی مدرسہ قائم ہو گیا ہے طلباء اس میں جا رہے ہیں۔ اگر اور سوال کیا جاتا ہے کہ یہ خانگی مدرسہ کیوں قائم ہوا تو کہا جاتا ہے کہ فلاں سٹیل نے مدرس مقرر کیا ہے۔ دیہاتی باضابطہ مدرسہ کی تعلیم ناپسند کرتے ہیں۔ مسلمان مذہبی تعلیم چاہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس میں شک نہیں کہ خانگی مدرسہ کے قیام کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ لیکن مدرسین کی یہ استدعا، کہ انہیں سرکاری طور سے بند کر دیا جائے۔ توجہ کے قابل نہیں ہوتی۔

محکمہ سرکار کا مقصد یہ ہے کہ رعایا تعلیم پائے۔ اس کا انتظام سرکاری اور خانگی دونوں طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات خانگی انتظام خاص مقاصد تعلیمی کے لئے بہتر ہوتا ہے۔ سرکار ایسے مدارس کے قیام کو ناپسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتی۔ بلکہ بذریعہ امداد مناسب ان کے مستقل قیام کی کوشش کرتی ہے۔ ان امور کے مدنظر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان مدارس پر غائر نظر ڈالی جائے

خانگی مدرسے حسب ذیل طریق پر عموماً قائم ہوتے ہیں۔

(۱) قابل تعلیم تمام موضع کے بچوں کے لئے سرکاری مدرسہ کافی نہیں ہوتا اور رعایا کو تعلیم کا شوق ہوتا ہے۔ اس لئے صرفہ برداشت کر کے مدرسہ قائم کر دیا جاتا ہے۔ سرکاری مدرسین کو ایسے مدرسہ کی مناسب اور ممکنہ امداد کرنا چاہئے کیونکہ وہ ایک اہم کام میں ان کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔ اس کے قیام سے ان کے مدرسہ پر اس وقت تک آنچ بھی نہیں آسکتی جب تک وہ اپنا کام محنت و مستعدی اور قابلیت سے انجام دیں گے۔ البتہ ذرا سی غفلت اور بے پروائی سے سرکاری مدرسہ میں تعداد کم ہو جائے گی۔ اور اس کے ذمہ دار خود سرکاری مدرسین ہیں۔ نہ کہ خانگی مدرسہ۔

(۲) بعض اوقات گاؤں کا کوئی مقتدر یا امیر شخص خانگی طور سے مدرس مقرر کر لیتا ہے اس کی وجہ یا تو شان امارت یا اقتدار دکھانا مقصود ہوتی ہے

۔ مدرسین سے اس کے بچوں کے برتاؤ میں خاص رعایت کا مطالبہ ہوتا ہے یا محض فرعونیت ہوتی ہے۔ مدرسین کو ایسے مدرسہ کی جانب مطلق توجہ نہیں کرنا چاہئے۔ ایسا مدرسہ ایک عرصہ تک نہیں چل سکتا۔ بشرطیکہ مدرس اپنی انسانیت قائم رکھیں۔ ملنساری اور انکساری کو عار نہ سمجھیں۔ کیونکہ اگر کسی امیر یا متمدن شخص نے اپنے بچوں کے لئے یہ مدرسہ قائم کیا ہے تو وہ اسی عرصہ قائم رہے گا جب تک اس کے لڑکے تعلیم پائیں گے۔ نیز بمشکل کوئی شخص عرصہ تک خانگی مدرس رہ سکتا ہے۔ آدمی مدرس ہوتے ہی کچھ آزاد پسند ہو جاتا ہے۔ اور خانگی ملازمت اس کے منافی ہے۔ اگر کوئی خانگی مدرس ہو گا تو وہ یا تو چند یوم ایسی ملازمت کرے گا یا مدرس نہ رہے گا خدمتگار ہو جائے گا۔ اگر یہ مدرسہ سرکاری مدرسہ کے مقابل اظہار فرعونیت کے لئے قائم کیا ہے تو بھی بہت کم مدت تک قائم رہ سکتا ہے کیونکہ گاؤں میں اس خلقت کا آدمی مقبول نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے گاؤں والے چند روز تک اس کی ہاں میں ہاں ملائیں مگر وہ ہمیشہ اس تلاش میں رہیں گے کہ کوئی موقع ملجائے تو بچوں کو سرکاری مدارس میں داخل کردیں۔ اور ایسے موقع عہدہ داران سررشتہ تعلیمات و دیگر سررشتہ جات کے دورہ کے وقت آسانی سے بہم پہونچائے جاسکتے ہیں مگر یاد رہے کہ سرکاری مدرسہ میں کوئی نقص نہو ورنہ مخالف قوی ہو جائے گا۔

(۳) خانگی مدرسہ مذہبی تعلیم کے لئے بھی قائم ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ بہت کم صرف مذہبی تعلیم کے لئے مخصوص رہتے ہیں اکثر ان میں دنیوی تعلیم بہ اقتضائے زمانہ شروع کردی جاتی ہے۔ اور چونکہ سرکاری مدارس میں بھی دینی تعلیم کا اچھا انتظام ہے۔ اس لئے شدہ شدہ یہ مدرسے سرکاری مدرسوں کی سطح پر آجاتے ہیں۔ اور رقابت کا اثر نمایاں ہونے لگتا ہے۔ ابتدائی جوش مذہبی

جو یا تو کسی جوشیلے مدرس کا پیدا کردہ تھا یا کسی وعظ کا اثر تھا یا
کسی کی تحریک تھی۔ وہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے منتظمین مدرسہ کو کام چلانا مشکل ہو جاتا
اب یا تو سرکار ہی ہے، طالب امداد ہوتے ہیں۔ یا مدرسہ بند کر دیا جاتا ہے
اس لئے مدرسین سرکاری کو چاہئے کہ ایسے مدرسوں کو دیکھکر گھبرائیں نہیں
بلکہ اپنا کام اطمینان سے کئے جائیں۔ دینیات کی تعلیم پر توجہ قائم رکھیں۔ لیکن
اگر ایسے خانگی مدارس کے مدرسین امداد طلب کریں تو انہیں انتظام میں مدد
دیجائے۔ اس تمام بحث سے ظاہر ہوگا کہ سرکاری مدرسین کو خانگی مدارس
قائم ہوتے دیکھکر نہ گھبرانا چاہئے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ آیا وہ اپنے فرائض
کا حقہ ادا کر رہے ہیں یا نہیں۔ ممکن ہے کہ تھوڑے عرصے کے لئے مدرسہ کی
تعداد پر بھی اثر پڑ جائے مگر عرصہ تک ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر ہوا تو ضرور
مدرسین قصوروار ہیں۔

سید ساجد علی

شمع اردو آگرہ کا ماہانہ رسالہ شمع آگرہ

جنوری ۱۹۲۸ء سے شمع نہایت آب و تاب سے شایع ہو رہا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ غرض ہر لحاظ سے
اپنی آپ نظیر ہے۔ ہر مضمون مہذب۔ محرک خیال اور معلومات جدیدہ کا بہترین نمونہ ہوتا ہے اور تاریخی سیاسی
اقتصادی و ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں اس کے مقاصد علمی و ادبی ہیں۔ لایق مدیران شمع مسٹر محمد حبیب (آکسن)
بیرسٹرایٹ لا پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ و مسٹر حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹرایٹ لا آگرہ ہیں حضرات
بہترین تعلیمیافتہ ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے نقاد اور ادیب ہیں اور فن اخبار نویسی سے واقف ہیں اور
محض ادبی و علمی خدمت کی آرزو میں رسالہ کی ترتیب میں مصروف ہیں اس میں کوئی ذاتی فائدہ شامل نہیں
اور نہ کسی تجارتی اصول پر اس کو پیش کرنا چاہتے ہیں

ہر ماہ میں پابندی وقت سے شائع ہوتا ہے۔ تصاویر بھی شائع ہوتی رہتی ہیں

حجم ۹۰ صفحہ قیمت سالانہ تین روپیہ کلدار نمونہ کا پرچہ ۱۰ ار کلدار

منیجر رسالہ شمع حسن منزل المشتہر شاہ گنج آگرہ

تعلیم تصاویر کے ذریعہ

جیسا کہ موجودہ زمانہ مشینری کا کہا جاتا ہے ویسا ہی تصاویر کا بھی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا آج سے سو سال قبل فن مصوری ابتدائی حالت میں تھا لیکن اگر ہمارے آباؤ اجداد آج کل کے کتب اخبارات رسالہ جات دیکھیں کہ یہ کس طرح واقعات سابقہ کے تصاویر سے بھرے ہوتے ہیں تو ان کے تعجب اور حیرت کی انتہا نہ ہوگی اندریں کثرت سے تصاویر کا استعمال اس بات کا شاہد ہے کہ اس سے زیادہ انسان کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا دکانداروں کی فہرستیں خوبصورت تصاویر سے بھری ہوتی ہیں اور رسالہ کو دیکھکر لوگ خریدار بنتے ہیں اور بہت سی اشیاء کے آرڈر روانہ کرتے ہیں جن ممالک میں تصویر گھر ہیں تو کیا بڑے کیا بچے کثرت سے ان گھروں کو جایا کرتے اور تصاویر دیکھتے ہیں۔ ناول اور قصہ کہانیاں پڑھنے کے عوض آج کل سینما کے ذریعہ یہ شوق پورا کیا جاتا ہے۔ تصاویر کا حالیہ شوق اس پر دال ہے کہ آئندہ اس فن میں بیحد ترقی ہوگی اور عنقریب وہ وقت آئے گا کہ بلا تار برقی کے ذریعہ تصاویر شایع ہونے لگیں گی اور اخبارات اور رسالہ جات کے وصول ہونے کا انتظار بھی نہ کرنا پڑے گا۔ عام پبلک کے ذوق و شوق کا حال تو یہ ہے لیکن مدارس میں ابتک تصاویر کا استعمال کما حقہ مروج نہیں ہوا ہمارے خیال میں اب وہ وقت آگیا ہے کہ تصاویر تعلیم کا ذریعہ قرار دی جائیں اور آزادی اور کثرت کے ساتھ مدارس میں تصاویر کا استعمال کیا جائے۔ تاریخ جغرافیہ اور نیچر اسٹڈی کی تعلیم میں اچھی تصاویر کا استعمال نتیجہ خیز اور مفید ثابت ہوگا۔

(۱) ڈالٹن پلان اور دوسرے انفرادی طریقوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بانی اسباق ویسے ہی مفید ہوسکتے ہیں جیسے کہ ایک اچھی لکھی ہوئی کتاب کے سبق اور بسط۔ ایک ٹکسٹ بک میں تصاویر کا وجود لازمی ہے اسی طرح زبانی سبق کے وقت بھی تصاویر سے کام لینا لازمی ہے ورنہ سبق خشک ہو جائے گا۔

ہر سبق کے لئے مختلف تصاویر کا مہیا کرنا آسان چیز نہیں اس کے لئے رقم کثیر کی ضرورت ہے اس لئے بجائے تصاویر خریدنے کے اگر اساتذہ طلباء سے ان کے نوٹ بکس میں تصاویر بنوائیں تو کام چل سکتا ہے۔ بچے تصاویر نہایت خوشی بناتے ہیں اگر ان کا یہ شوق بڑھایا جائے اور مدرسین رہنمائی کرتے رہیں تو وہ اپنے سبقوں کے لئے خود اپنی تصاویر تیار کرلیں گے۔

تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ کم سن بچوں میں غور و فکر کا مادہ تصاویر کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ بچہ جب تصویر دیکھتا ہے تو اس کو ہاتھ لگانا چاہتا ہے اگر تصویر میں کوئی کام ہوتا ہوا دیکھتا ہے تو اس کی نقل کرنی چاہتا ہے۔

ابتداً بچے تصاویر کو صرف دیکھنے پر اکتفا کرتے ہیں بعد میں ان کے متعلق آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ تصاویر کے متعلق گفتگو کرنا اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ غور شروع ہوگیا دل و دماغ میں خیالات پیدا ہوئے جس کا اظہار تقریر کے ذریعہ ہوا اب یہ مادہ یعنے تصاویر کے متعلق غور کرنا اور سوچنا سب بچوں میں یکساں نہیں ہوتا بلکہ کم اور زیادہ۔ اس کا انحصار بچوں کی تربیت اور تعلیم پر ہوتا ہے۔ بچوں کو ابتدا سے ایسی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ صرف تصاویر کو دیکھ ہی نہ لیں بلکہ ان پر غور بھی کیا کریں۔

سید محمد حسین

*

دیسی کھیل

انجمن اساتذہ صوبہ گلبرگہ شریف کے ایک جلسہ میں جو ۱۳۳۲ف میں منعقد ہوا تھا جناب مولوی سید علی اکبر صاحب بی۔ اے صدر مہتمم تعلیمات و میر مجلس انجمن اساتذہ صوبہ گلبرگہ (حال بلدہ و اطراف بلدہ) نے ورزش جسمانی پر تقریر کی تھی دوران مباحثہ میں ۲۰ منٹ تک میں نے ولایتی طرز کی ورزش اور ولایتی کھیلوں کو حالات وضروریات ہندوستان کے نامواقف بلکہ بعض صورتوں میں مضر بتلاکر دیسی کھیلوں اور دیسی ورزش اور اوقات ورزش کی جانب توجہ دلائی تھی۔ اس مباحثہ کے نوٹ کھیلن پڑ گئے اس کے بعد ورزش جسمانی کے دوسرے جلسہ کے لئے فلسکیپ کے چھ صفحہ پر ایک تقریر لکھی گئی تھی جس کو جلسہ عام میں پڑھنے کا موقع نہ ملا مگر چند دوستوں کے سامنے پڑھی گئی۔

باوجود سخت اختلاف رائے کے جناب سید علی اکبر صاحب نے جوابی تقریر میں دیسی کھیلوں کی اجرائی کے لئے مجھے ترغیب دی میں نے کہا کہ میں معائنہ مدارس کے وقت بچوں کو دیسی کھیل کھلاتا اور ان کے ساتھ خود کھیلتا ہوں۔

جناب سید علی اکبر صاحب کی ترغیب و تشویق کے بعد میں نے مدرسہ نوقیا انگریزی گلبرگہ میں مدارس مستقر کے طلبہ کو جمع کر کے دیسی کھیل کھلائے جس میں طلبار مدرسین، عمال، معززین اور عہدہ دار کافی تعداد میں شریک تھے اور ان کھیلوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور پسند کیا گیا۔

ہر مدرسہ تحتانیہ مستقر گلبرگہ اور متعدد مدارس تعلقات و مواضعات کے لئے

ہفتہ واری دیسی کھیل کا نظام العمل (پروگرام) بنا کر دیا گیا اور کھیل بھی کرا کر بتا دیا گیا مگر اس پر عمل نہ ہوا۔ اسپورٹس کمیٹی گلبرگہ کو دیسی کھیل کی ترویج پر توجہ دلائی گئی مگر وہاں یہ عرض قبول نہیں ہوئی۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں ٹیچرز کانفرنس (صدر انجمن اساتذہ) میں دیسی کھیلوں کو رواج دینے کی تحریک منظور ہوئی۔ میں نے زبانی مختصر تقریر کی جس کے نوٹ نہیں کئے گئے اخبار رشید دکن وغیرہ نے روئداد کانفرنس کی تنقید کے ضمن میں دیسی کھیلوں کی کفایت معنوی نیت پر بحث کی ہے۔ ۱۹۳۴ء کی کانفرنس میں جناب مولوی شیخ ابو الحسن صاحب منصرم صدر مہتمم تعلیمات و میر مجلس انجمن اساتذہ (حال مہتمم تعلیمات ضلع میدک) نے دیسی کھیلوں کو کانفرنس کے نظام العمل میں شریک کیا جناب مولوی سید محی الدین صاحب اور اکثر شرکا کانفرنس نے ان کھیلوں کو بہت پسند فرمایا۔

عالیجناب مولوی سید محمد حسین صاحب منصرم ناظم تعلیمات (حال نائب ناظم تعلیمات) نے سالانہ رپورٹ ضلع گلبرگہ کی تنقید کے ضمن میں دیسی کھیلوں کی فہرست مجھسے مرتب کرانے کا حکم صادر فرمایا۔ جناب مولوی سید حسین صاحب جہاں ۱۹۳۵ء میں گلبرگہ کی پہلی کانفرنس میں دیسی کھیلوں کی تحریک کو اپنے عالمانہ اثر سے شریک فرمایا۔ وہیں اس کی تحریک و تائید کے وقت حسب عادت کا اظہار فرمایا دیسی کھیلوں کی ترویج کا وعدہ فرمایا۔ اور اب رسالہ المعلم کے لئے دیسی کھیلوں کی فہرست مسلسل طبع کرنے کے لئے طلب فرمائی ہے۔ بنا بر ارشاد عالی ذیل میں بجنسہ روئداد کانفرنس سال دوم سے دیسی کھیلوں کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔ اس فہرست کی دوسری قسط پھر کسی موقع پر شائع کی جائے گی۔

۱۰ مرداد ۱۳۴۳ف کی صبح کو مدرسہ فوقانیہ انگریزی گلبرگہ کے میدان میں مدارس مقامی کے طلبا کو معتمد کانفرنس نے چھ مختلف قسم کے دیسی کھیل کھلائے اور تو صبحا

بیان کیا کہ ولایتی کھیلوں پر روپیہ بہت صرف ہوتا ہے دیسی کھیل پر کچھ صرف نہیں ہوتا جھاڑ کی ایک لکڑی یا پانی کا لوٹا کافی ہوتا ہے۔ طلباء کے قوا اور حالات ملک کے لحاظ سے بھی دیسی کھیل زیادہ مفید اور ولایتی کھیل مضر ہیں۔ آج چھ مختلف قسم کے کھیل طلباء کو کھلائے گئے۔ اگرچہ پورا سال تعلیمی بہت چھوٹا یعنے پانچ چھ ماہ کا ہی ہوتا ہے مگر ہفتہ کے باستثنائے تعطیل جمعہ چھ ہی دن ہوتے ہیں۔ لہذا آج چھ کھیل کھلائے اور ان کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ امید کہ سال آیندہ تک روزانہ یہ کھیل مدارس میں کھلائے جائیں گے۔

(۱) بے ہاتھ پیر کی لڑائی۔ دونوں جانب مساوی تعداد کے طلباء ہوں ایک گول حلقہ پانی سے یا لکڑی سے نشان کرکے بنا لیا جائے وسط حلقہ میں فریقین کا ایک ایک لڑکا آئے۔ اور ایک پیر زمین پر رکھے دوسرا پیر زمین سے اٹھائے۔ دونوں ہاتھ کے پنجے کمر پر رکھے۔ دونوں لڑکے یہ کوشش کریں کہ بازوں سے دھکیل کر کسی کو لکیر کے باہر کر دیا جائے

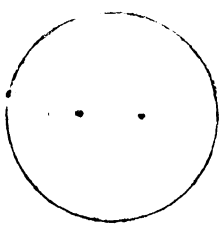

جو لڑکا لکیر کے باہر ہو جائے یا ہاتھ یا پیر چھوڑ دے وہ ہار دیتا ہے۔ ہارا ہوا لڑکا علیحدہ بیٹھ جائے۔ اور اس کے فریق کا دوسرا لڑکا آجائے وہ بھی ایسا ہی کرے جس فریق کے تمام لڑکے پہلے ہار جائیں اور دوسرے فریق کے کچھ لڑکے باقی رہ جائیں تو باقی ماندہ فریق فتح یاب ہوگا۔

(۲) تال بم (بیٹھا) لڑکوں کی تعداد معین نہیں۔ جتنے طلباء چاہیں شریک ہو سکتے ہیں ایک لڑکا ہارا ہوا ہوگا باقی تمام کھڑے رہیں گے۔ تمام لڑکے ادھر ادھر پھر کر بیٹھیں گے بیٹھے ہوئے جس لڑکے کو ہارا ہوا لڑکا ہاتھ لگا دے تو ہاتھ لگا ہوا لڑکا ہار جائے گا۔ اور ہاتھ لگانے والا دوسروں کے ساتھ مل جائے گا۔ ہارا ہوا لڑکا پھر بیٹھے ہوئے کسی

لڑکے کو ہاتھ لگانے کی کوشش کرے۔ جس کو ہاتھ لگ جائے گا وہ ہار جائے گا ایسا ہی جتنی دیر چاہیں کھیل سکتے ہیں۔

(۳) تال بم (کھڑا) یہ بیٹھے تال بم کے برعکس کھیل ہے یعنے اس میں لڑکے سب اِدھر اُدھر بیٹھے رہیں گے۔ کھڑے ہونے والے کو ہاتھ لگانا چاہئے۔

(۴) جھاڑ پھاند۔ ایک لکڑی دور پھینکی جائے۔ لکڑی واپس لانے سے قبل سب لڑکے جھاڑوں یا دیواروں پر چلے جائیں۔ لڑکا لکڑی لاکر جھاڑ کے نیچے رکھے تمام لڑکے یہ کوشش کریں کہ ان میں سے کوئی ایک لکڑی کو ہاتھ لگا دے لکڑی لانیوالا لڑکا یہ کوشش کرے کہ تمام لڑکوں میں سے کسی ایک کو ہاتھ لگا دے اگر لکڑی کو کسی کا ہاتھ لگنے سے پہلے لڑکا کسی کو ہاتھ لگا دے تو جس کو ہاتھ لگ جائے گا وہ ہار جائے گا لکڑی پھر پھینکی جائے گی اور اس کو لکڑی لانے جانا پڑے گا۔ اگر لکڑی کو پہلے ہاتھ لگ جائے تو دوبارہ پھر اسی لکڑی کو لانے کے لئے جانا پڑے گا۔ اس کھیل کا نام جھاڑ بند ہے غلط

(۵) کونے کی بلی۔ یہ صرف پانچ لڑکے کھیل سکتے ہیں۔

الف ب

مندرجہ حاشیہ مربع شکل میں نشانات لکڑی سے کرلئے جائیں اگر چاروں طرف کھم ہوں تو کسی نشان کی ضرورت نہیں کھم ہی نشان کا کام دیں گے۔

س

ج د

ہر نقطہ کے پاس ایک ایک لڑکا کھڑا ہو جائے۔ الف کو ب یا ج سے اور ب کو الف یا د سے اور ج کو الف یا دال سے اور د کو ج یا ب سے تبادلہ کا حق ہے الف یا ب یا ج یا د کی جگہ جب کبھی خالی ہو اور اس پر دوسرے لڑکے کے آنے سے پہلے س چلا جائے۔ تو جس کی جگہ جا چکی وہ س کے پاس آجائے اور پھر خالیہ جائداد کا

انتظار کرتا رہے۔ اس پر جو لڑکا رہے گا وہ ناکام یا ہارا ہوا شخص کہلائے گا

(۶) کبڈی (گدگدا) دونوں جانب مساوی تعداد کے لڑکے ہوں وسط زمین پر پانی یا لکڑی سے لکیر کھینچ دی جائے ایک فریق کا ایک لڑکا دوسرے کے سمت میں کبڈی کبڈی یا گدگدا کہتا ہوا جائے دوران دم میں کسی فریق کو ہاتھ لگا کر اپنے حلقہ میں آجائے۔ جس کو یا جتنے لڑکوں کو ہاتھ لگ جائے وہ ہار جائیں گے۔ اگر وہ اس لڑکے کو پکڑ لیں تو گرفتار شدہ لڑکا ہار جائے گا۔ اب پھر دوسرے فریق کا لڑکا اسی طرح فریق اوّل کی سمت میں جائے گا اور ایسی ہی کوشش کرے گا جس فریق کے تمام لڑکے پہلے ہار جائیں وہ ناکام اور باقی ماندہ فریق فتح یاب شمار ہوگا۔

کبڈی (گدگدا) کا نقشہ

فریق اوّل کے لڑکوں کی جگہ	عدالت	فریق دوم کے لڑکوں کی جگہ

رے ڈیو کا راز

ہمارے ایک مخلص دوست نے جاپان سے ایک انگریزی اخبار کی کترن بھیجی ہے۔ یہ اخبار ٹوکیو سے شائع ہوتا ہے۔ اس کترن میں کرنل سی ایچ نائس کی ایک تقریر ہے جو انہوں نے ٹوکیو کی ایک کلب میں کی تھی۔

کرنل نائس امریکہ کی رے ڈیو کارپوریشن کے سرگرم رکن ہیں اور وہ جاپان میں رے ڈیو کے فروغ اور ترقی کے لئے سیاحت کر رہے ہیں۔

رے ڈیو کا فن اب جس نوبت پر پہونچ گیا ہے اس سے حیرت ہوتی ہے اور اس حیرت انگیز میدان میں اصحاب سائنس کے کارنامے دماغ میں جولانی اور نظر میں وسعت پیدا کرتے ہیں۔ کرنل نائس نے ایسے عام فہم پیرایہ میں رے ڈیو کی باتیں بیان کی ہیں کہ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ان باتوں کو اپنے اساتذہ تک پہونچائیں۔

اس تقریر کا جہاں تک ہو سکا سلیس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے اور یہ جسارت بھی کی گئی ہے کہ ضروری اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اس سے یہ منشا نہیں ہے کہ یہی اصطلاحات موزوں اور رواج کے قابل ہیں بلکہ مقصد صرف اتنا ہے کہ اس قسم کی پہل ہو جائے تاکہ اور اصحاب بھی اس طرف دماغ لڑائیں۔

ہمیں یہ توقع ہے کہ ہمارے سائنس داں اساتذہ رے ڈیو کے متعلق صاف اور سلیس مضامین اپنے ہم فن بھائیوں کے لئے تحریر کریں گے "المعلم" میں ایسے مضامین نہایت خوشی سے شائع کئے جائیں گے۔

رے ڈیو کی اصطلاح کا ہم نے ترجمہ نہیں کیا ہے۔ براڈ کاسٹنگ
کے لئے البتہ چوکھ پھیلاؤ کا لفظ تراشا ہے۔ اور اصطلاحیں بھی ہم نے گھڑلی ہیں
جن کی صراحت کی یہاں چنداں ضرورت نہیں کیونکہ وہ ایسی اصطلاحیں ہیں جو
اپنے آپ ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔ شریک مدیر

کرنل نائس نے کہا اس میں شک نہیں کہ رے ڈیو نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی ہے لیکن میں ابھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ رے ڈیو نے بحر کاہل پر بھی فتح پائی ہے۔ مجھے جو آپ کے سامنے اس مضمون پر بولنے کا موقع ملا ہے اس کو اپنے لئے بطور خاص باعث امتیاز سمجھتا ہوں اس لئے کہ میری تقریر کا موضوع ایسی چیز ہے جس میں فی الوقت علمی دنیا بے حد دلچسپی لے رہی ہے۔ میں دو مہینے سے جاپان میں ہوں اور ان دو مہینوں میں میں نے یہ دیکھا کہ رے ڈیو اور اس کے ہر شعبہ میں جاپان بے حد دلچسپی لے رہا ہے اور نہایت سرگرمی دکھلا رہا ہے اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اتنے قلیل عرصہ میں اس قدر دلچسپی کی نظیر کسی اور ملک میں نہیں ملے گی۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی حکومت نے خانگی سرمایہ کی امداد بھی حاصل کرلی ہے تاکہ پبلک اور حکومت اس معاملہ میں پوری طرح مل جل کر کام کر سکیں۔ آپ کے شوریٰ (پارلمنٹ) نے بھی حال ہی میں رے ڈیو کی تجاویز کو منظور کر لیا ہے اور اس سے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ آپ کی مملکت کے ہر حصہ میں رے ڈیو کے ٹھکانے قایم ہو جائیں گے۔ رے ڈیو ریلوں میں لگا دیا گیا ہے اور بعض دور کے مقبوضات میں بھی اس کا سامان مہیا کر دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کی نوآبادیاں مادر وطن سے اور زیادہ گتھ سی گئیں ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ ٹوکیو کے قریب بھی رے ڈیو کا اسٹیشن قائم ہو گیا ہے اور ملک کے اور حصوں میں متعدد اسٹیشن قائم ہونے والے ہیں۔

ریڈیو کی تعریف میں ریڈیو چوکھ پھیلاؤ (RADIO BROADCASTING)
ریڈیو براڈکاسٹنگ کی تعریف سے ابتدا کرنی چاہتا ہوں۔ اس کی تعریف یہ ہو سکتی ہے۔ آواز کی صورت میں ایک مرکزی فرستندہ مقام سے کسی اطلاع کا کل سمتوں میں پھیلانا تاکہ اس اطلاع کو وہ تمام گیرندہ مقام سن سکیں جو اس کو سننا چاہتے ہوں ان معنوں کے علاوہ بھی اس اصطلاح کی تعبیر کی جاتی ہے لیکن وہ غلط ہے۔
چوکھ پھیلاؤ کی چند امتیازی خصوصیتیں یہ ہیں۔

۱۔ چوکھ پھیلاؤ یکطرفہ اطلاع ہے یعنے بھیجنے والے مقام سے گیرندہ مقامات کو تو اطلاع پہونچ جاتی ہے لیکن گیرندہ اسٹیشن جواب میں فرستندہ مقام کو کوئی بات نہیں پہونچا سکتے۔

۲۔ عملاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ گیرندہ اسٹیشن خواہ کتنی ہی دور ہوں وہ سب کے سب ایک ہی وقت سن سکتے ہیں اور یہ کہ ان گیرندہ مقامات کی تعداد غیر محدود ہو سکتی ہے

۳۔ فرستندہ اور گیرندہ مقامات کے درمیان انسان کے ہاتھوں کسی قائم کئے ہوئے تعلق کی ضرورت نہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ کرۂ ہوا کی حالت۔ فرستندہ مقام کی قوت اور گیرندہ مقامات کے متاثر ہونے کی صلاحیت اگر ٹھیک ٹھاک اور کافی و وافی ہو تو پھر جس کا جی چاہے اور جہاں سے جی چاہے وہ ان کل باتوں کو سن سکتا ہے جو کسی فرستندہ مقام سے فضا میں بھیجی جا رہی ہوں

خبر رسانی کا بہترین طریقہ یہ تینوں خصوصیتیں ریڈیو چوکھ پھیلاؤ میں ایسی اکٹھی ہو گئی ہیں کہ اس کے ذریعہ ہر قسم کی اطلاع آواز کی صورت میں سامعین کے بڑے سے بڑے اور دور دور پھیلے اور بکھرے ہوئے مجمع تک اسی وقت پہونچائی جا سکتی ہے جس وقت کے جو بات پہونچانی ہے معرض وقوع میں آ رہی ہو۔ مجھے کامل یقین ہے کہ یہ تینوں خصوصیتیں ہی وہ چیزیں جس پر ریڈیو چوکھ پھیلاؤ کی کامیابی بلکہ یوں کہئے کہ

اس کے وجود کا دارومدار ہے۔ جس ملک میں ایسی قوانین اس قسم کے ہوں کہ وہ فطرت کے ان قوانین میں روڑے اٹکائیں جو ہوا تک میں آزادی کی روح پھونکتے ہیں تو ظاہر ہے کہ چوکھ پھیلاؤ کا ایسے ملک میں گلا گھٹ جائے گا اور جدید تمدن میں اس ریڈیو کے فن کا جو فریضہ ہے وہ پورا نہ ہو سکیگا۔

اس موقع پر آپ کے محکمہ رسل و رسائل نے جس دانشمندی سے کام لیا ہے اس کا ذکر کرنا مناسب ہے۔ آپ کے اس محکمہ نے اُن تمام قیود کو جو جاپانی چوکھ پھیلاؤ کی ابتداً عاید کی گئیں تھیں اٹھا دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ریڈیو جو جاپان میں ابھی ایک ننھا سا بچہ ہے بہت جلد اسی طرح ایک دیو قامت جوان بن جائے گا جس طرح اور ملکوں میں ریڈیو نے رائج ہونے کے بعد ترقی کی ہے

غیر اصطلاحی بات چیت چونکہ جاپان میں بہت سے لوگوں نے مجھ سے یہ بات دریافت کی ہے کہ کس طرح باتیں ریڈیو کے ذریعہ گھر گھر پہونچ جاتی ہیں لہذا میں کوشش کرونگا جہاں تک ممکن ہو غیر اصطلاحی بکھیڑوں کے اس بارے میں کچھ بیان کروں۔

چوکھ پھیلانے والے ہر اسٹیشن میں ایک کمرہ ہوتا ہے جسے اسٹوڈیو کہتے ہیں اس کمرہ میں مقرر یا گویا اپنی تقریر یا گانا سناتا ہے اور یہ باتیں ریڈیو کے جملہ سامعین تک ایک ہی وقت پہونچتی ہیں خواہ سننے والے اپنے گیرندہ آلات کے سامنے ملک کے کسی حصہ میں بیٹھے سن رہے ہوں۔

اس کمرہ کی اصلی چیز میک روفون (صوت چین) ہے یہ آلہ بالکل معمولی ٹیلیفون کے صوت فریبندہ سے مشابہ ہے جو عام طور پر استعمال ہوتا ہے اس میک روفون کے ذریعہ یہ ہوتا ہے کہ آواز کی لہریں ایک تار میں جاتی ہیں مگر اُن کی ہیئت بدل جاتی ہے یعنے وہ آواز کی لہریں نہیں رہتیں بلکہ برقی پھٹکاریں بن جاتی ہیں یہ پھٹکاریں تار کے ذریعہ ریڈیو کے فریبندہ آلہ میں پہونچ کر برقی مقناطیسی پھٹکاریں

بن جاتی ہیں اور فضا میں جو طرف منتشر ہو جاتی ہیں۔ ان پھٹکاروں کے چکر پھیلتے اور بڑھتے جاتے ہیں جس طرح پانی میں کنکر کے پھینکنے سے چکر پھیلتے اور بڑھتے ہیں لیکن ان چکروں کا مرکز فریسندہ مقام ہی ہوتا ہے۔

اچھا اب رے ڈیو کا ایک گیرندہ آلہ اس طرح لگایا جائے کہ وہ اُن برقی مقناطیسی پھٹکاروں کو جو فضا میں پھیل رہی ہیں چن لے تو ان برقی مقناطیسی پھٹکاروں کو ایک ایسے عمل میں سے گذرنا پڑے گا جو فریسندہ مقام کے ابتدائی عمل کا بالکل عکس ہے یعنی یہ فضا والی برقی مقناطیسی پھٹکاریں محض برقی پھٹکاروں میں بدل جاتی ہیں اور اس طرح برقی لہریں بن کر بلند آواز بھپے کے صوتی صندوق (ڈیافرام) کو چھیڑتی ہیں اور پھر اسی اصلی ابتدائی آواز کو من وعن پیدا کر دیتی ہیں جو اسٹوڈیو میں بول یا گا رہی ہے رے ڈیو والی لہریں فضا میں اور برقی پھٹکاریں تاروں میں دونوں کی رفتار تیس کروڑ (۳۰۰۰۰۰۰۰) میٹر فی لحظہ ہے یعنے ان کی رفتار وہی ہے جو روشنی کی ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنے ہوئے کہ عملاً اسٹوڈیو کے مقرر یا گوئے کی آواز رے ڈیو کے ذریعہ سننے والے جہاں کہیں ہوں اسی وقت سن سکتے ہیں جس وقت وہ مقرر یا گوئے کے منھ سے نکلے۔

حیرت ناک مقبولیت جو شخص فن رے ڈیو کی تیز ترقی کو بغور دیکھ رہے تھے وہ رے ڈیو چکمہ پھیلاؤ کی بہت سی امکانی صورتوں کو قبل از قبل محسوس کر چکے تھے حالانکہ اس وقت تک رے ڈیو ٹیلیفون معرض عمل میں نہیں آیا تھا۔ تاہم میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ رے ڈیو نے جو حیرت ناک عام مقبولیت حاصل کی ہے اور اس نے جس سرعت کے ساتھ محض ایک کھلونے کی حیثیت سے گذر کر اس زمانہ کے شائستہ گھروں کی ایک اٹل ضرورت اپنے آپ کو ثابت کیا ہے۔ یہ ایسے امور تھے کہ بڑے سے بڑے رے ڈیو قدردان کی توقعات سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اُن جدید ترین اعداد سے جو میری نظر سے گذرے ہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ صوبہ جات متحدہ امریکہ میں اس وقت (۵۳۷) ایسے فریسندہ اسٹیشن ہیں جو پوری طرح اسٹیشن کہلانے کے مستحق ہیں اس لئے کہ پورے

سازوسامان سے آراستہ ہیں۔ امریکہ میں اس وقت تقریباً (۶۰،۰۰۰،۰۰۰) ساٹھ لاکھ گیرندہ مقامات ہیں جو ان (۵۳۷) فریسندہ اسٹیشنوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اب یوں غور فرمائیے کہ چوکھ پھیلاؤ کا پھیلا اشتہار جولائی ۱۹۲۱ء میں دیا گیا اور باقاعدہ گانے وغیرہ کے پروگرام کوئی پانچ مہینہ بعد بھیجے جانے لگے تو آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ صوبہ جات متحدہ امریکہ میں ریڈیو کی اس شاخ یعنے چوکھ پھیلاؤ نے جو ترقی اس قلیل عرصہ میں کی ہے وہ کس قدر اچنبھے میں ڈالنے والی ہے۔

بہت احتیاط کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ صوبہ جات متحدہ امریکہ اس وقت چوکھ پھیلاؤ کے فریسندہ اور گیرندہ آلات کی نفاست اور ترقی میں ساری دنیا سے پانچ برس آگے ہے۔ نہ صرف ان آلات میں بلکہ اسٹوڈیو کے عملیات انتظام اور ہر ملعزیز گاؤں کے پروگرام تیار کرنے میں بھی امریکہ اسی قدر آگے ہے۔ صوبہ جات متحدہ امریکہ کو یہ سبقت دو باتوں سے نصیب ہوئی ہے ایک تو یہ کہ امریکہ میں چوکھ پھیلاؤ بے انتہا مقبول ہو گیا ہے اور امریکہ کے لوگوں نے اس معاملہ میں ایسی قدر دانی سے کام لیا کہ چوکھ پھیلاؤ کی ترقی اور نئی نئی تحقیقات کے کام میں لوگوں کو ایسی تشویق ہوئی کہ جس کی نظیر نہیں دوسری بات یہ ہوئی کہ ہماری حکومت نے فوراً پہچان لیا کہ چوکھ پھیلاؤ کے ذریعہ پبلک کی نئی طرح اور مفید خدمت کی جا سکتی ہے اور اس معاملہ میں کام کرنے والوں کو حکومت نے پوری پوری آزادی دی اور ملک میں جو ریڈیو کا سرکاری نظام قائم ہو چکا تھا اس کو چوکھ پھیلاؤ کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

امریکہ میں ریڈیو کے مخالفین

جب امریکہ میں ریڈیو چوکھ پھیلاؤ کا کام اول اول ہوا تو ایسے طبقوں میں جو پبلک کا سامان تفریح فراہم کرتے ہیں بہت سے لوگ چوکھ پھیلاؤ کے مخالف بن گئے۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ پبلک کے اسباب تفریح کا میدان خود اس قدر کھچا کھچ بھرا ہوا ہے کہ اب اس میں چوکھ پھیلاؤ کی گنجائش

گنجایش نہیں۔ فونوگراف کے کارخانوں تھیٹروں اور بعض اخباروں نے بھی چوکھ پھیلانے کے استقبال میں بڑی ہی سرد مہری سے کام لیا۔ لیکن اب وہ وقت آگیا ہے کہ یہ لوگ محسوس کر چکے ہیں کہ اول تو چوکھ پھیلاؤ نے لوگوں کے دلوں میں اس طرح گھر کر لیا ہے اب دلوں سے اترنا ممکن نہیں اور ثانیاً یہ کہ چوکھ پھیلاؤ ان مخالفین کے کاروبار کو نقصان پہونچانے کے بجائے ان کے کاروبار کا زبردست مدد اور معاون ثابت ہو رہا ہے۔

غرض ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ریڈیو کے گیرندہ آلات اور فونو گراف ملے جلے کام کر رہے ہیں۔ تھیٹروں کے گانے اور سکالے چوکھ پھیلائے جا رہے ہیں جن سے معقول آمدنی ہو رہی ہے۔ اخبار ریڈیو پر صفحے کے صفحے لکھ رہے ہیں اور بہت سے اخباروں نے اپنے طور پر چوکھ پھیلاؤ کا دھندا بھی کھول رکھا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ چوکھ پھیلاؤ کے سیلاب نے امریکہ میں ساری رکاوٹوں کو گھاس پھوس کی طرح بہا دیا ہے۔

ریڈیو میں اصطلاحات ریڈیو کے گیرندہ اور چوکھ پھیلانے والے آلات میں خصوصاً سال گذشتہ بڑی بڑی اصلاحیں ہوئی ہیں۔ پبلک کا یہ مطالبہ تھا کہ ایسے آلات مہیا کئے جائیں جن سے بہت دور کی باتیں سنی جا سکیں اور ایسے آلات بھی اختراع کئے جائیں جن کی مدد سے بآسانی صرف اُن ہی چیزوں کو فضا میں سے چُنا جا سکے جو سُننی ہوں جیسے زیادہ بلند آواز ہوں اور ریڈیو کے سامان کی گھریلو الماریاں نہایت نفیس اور خوبصورت ہوں۔ یہ تمام پبلک کی فرمائشیں اور یہ سب کی سب پوری کی گئیں۔ جو پروگرام چوکھ پھیلائے جاتے تھے اُن کے متعلق پبلک کی یہ خواہش تھی کہ آواز صاف صاف آئے ایک فریبندہ اسٹیشن کی آوازیں دوسرے اسٹیشن کی آوازوں سے نہ الجھیں ریڈیو کے ذریعہ بولنے یا گانے والے کا گیرندہ انتخاب کئے جائیں اور سب میں بڑی بات یہ کہ صرف اسٹوڈیو کے اندر

گانے بجانے یا بولنے پر اکتفا نہ کی جائے بلکہ ایسی باتیں بھی چوکھ پھیلائی جائیں جو اسٹوڈیو کے باہر وقوع پذیر ہوں مثلاً امریکہ کے پریزی ڈنٹ کی پبلک تقریر پبلک کی یہ فرمایشیں بھی پوری کی گئیں۔

رے ڈیو چوکھ پھیلاؤ کے متعلق پہلے یہ خیال تھا کہ فرسینڈہ مقام سے صرف سو یا ڈیڑھ سو میل کے گھیرے میں کام لیا جا سکیگا۔ اس طرح ہر فرسینڈہ اسٹیشن ایک خاص دائرہ تک محدود رہتا اور اس دائرہ میں رہنے والوں کے مذاق کے مطابق خبریں گانے اور تقریریں فراہم کی جاتیں۔ لیکن اب چوکھ پھیلاؤ نے محدود دائرہ سے نکل کر قومی حیثیت اختیار کر لی ہے اور آج امریکہ کے ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک بے تکلف گانے کی آواز پہونچتی ہے۔ ان ساحلوں کا درمیانی فاصلہ تین ہزار میل ہے۔ کیا یہ گیا ہے کہ مختلف فرسینڈہ مرکزوں کو معمولی ٹیلیفون یا رے ڈیو ٹیلیفون کے ذریعہ آپس میں ملا دیا گیا ہے۔ اس طرح کل ملک کی فضا میں گویا ایک جال سا بچھ گیا ہے اور کوئی بات ہو اس جال کے ذریعہ ملک کے گوشہ گوشہ میں ایک ہی وقت سنی جا سکتی ہے۔ اور اب وہ وقت بھی آنے ہی کو ہے کہ چوکھ پھیلاؤ بین قومی حیثیت اختیار کر لے نری ایک اچنبھے کی بات نہ رہے بلکہ روزمرہ کی ایک چیز بن جائے۔ اور جب رے ڈیو کو یہ بات حاصل ہو جائے گی تو اس وقت سمندر پر بھی پہنائی اور بھی سکڑ جائے گی۔

رے ڈیو کا عام استعمال | ابتداءً تو صرف یہی ہو سکتا تھا کہ اسٹوڈیو کی باتیں ہی چوکھ پھیلائی جائی تھیں اب رے ڈیو کے رپورٹر سفری آلات لیکر گرجا تھیٹر ہوٹل یا کھیل کود کے مقامات پر جا پہونچتے ہیں اور وہاں کی خبریں اپنے قریب تریں فرسینڈہ اسٹیشن تک پہونچا دیتے ہیں جہاں سے فضا میں ہوتی ہوئی یہی اطلاعیں سارے ملک میں پھیل جاتی ہیں۔ امریکہ میں چوکھ پھیلاؤ سے جو کام لیا جا رہا ہے

اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۲۴ء میں وی۔ جے۔ ڈ کے بڑے فریبندہ اسٹیشن سے تین ہزار پچاس گھنٹوں تک پروگرام بھیجے جاتے رہے اور اس وقت تقریباً نصف حصہ ایسی باتوں کے بھیجنے میں صرف ہوا جو اسٹوڈیو کے باہر سے حاصل کی گئی تھیں۔ صرف اس ایک اسٹیشن سے چار ہزار نو سو پینتیس پروگرام بھیجے گئے۔

آج کل صوبہ جات متحدہ میں کوئی بات قومی دلچسپی کی ایسی نہیں ہے جو فضا کے ذریعہ ملک میں منتشر نہ کی جائے۔ پریزیڈنٹ کولج چوتھی مارچ کو اپنی صدارت پر متمکن ہوئے۔ اس رسم کی باتوں کو کل ملک میں پھیلانے کے لئے بائیس بڑے بڑے اسٹیشن ایک دوسرے سے ملا دیے گئے۔ یہ حال ہی کی مثال ہے اور اس سے چونکھ پھیلاؤ کی قوت بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ اس واقعہ کے متعلق ایکو میں ایک امریکن اخبار کا اقتباس سناتا ہوں۔

اخباروں کی رائیں "صوبہ جات متحدہ کے کسی پریزیڈنٹ نے تاریخ میں اس طرح ہمارے پریزیڈنٹ ہونے کا امتیاز حاصل نہیں کیا جیسا کل پریزیڈنٹ کولج کو حاصل ہوا ہے۔ کیونکہ کل ساری قوم کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ اپنے پریزیڈنٹ کی آواز کو چار برس تک ملک کی خدمت گذاری کی قسم کھاتے ہوئے اپنے کانوں سے سنے۔

اس دفعہ یہ رسم ایسی نہ تھی جس میں چند مٹھی بھر امریکن ہی حصہ لے سکیں ہر فرد قوم گویا کہ وہاں موجود تھا۔ یہ رسم بعض مقامات سے کئی ہزار میل دور ادا ہو رہی تھی لوگوں نے چیف جسٹس ٹافٹ کی گونجتی ہی آواز سنی جب کہ وہ پریزیڈنٹ کولج کو اس بات کی قسم دے رہے تھے کہ قوم کی بہبودی کو اپنے جان کی طرح رکھنا اور قومی کانسٹی ٹیوشن کے لئے جان تک لڑا دینا تو اس وقت ہر شخص گو وہ ہزاروں میل دور تھا اپنے آپ احتراماً کھڑا ہو گیا۔"

یقیناً کوئی اور قوت انسان کو اب تک ایسی معلوم نہیں ہوئی ہے جو اس طرح

کا صفایہ کونیست و نابود کردے۔

شریک مدیر

تبصرہ

صیدیہ

میر وزیر علی صاحب صبا لکھنوی کی اس نام کی مثنوی کو "مولانا ابوالبلاغ علاء الدین خاوری۔ ایم۔ اے" نے انگریزی طرز پر اڈٹ کرکے شائع کیا ہے۔ خاوری صاحب نے سرورق کے بعد پہلے صفحہ پر اس جدید ایڈیشن کو حضرت اقدس واعلی خلد اللہ ملکہ کے نام نامی سے معنون کیا ہے اور 'تہدیہ' اس کی سرخی رکھی ہے اس کے بعد دیباچہ ہے اور دیباچہ کے بعد صفحہ ۵ سے مقدمہ شروع اور صفحہ ۶۷ پر ختم ہوتا ہے۔ اصل مثنوی صفحہ ۱ سے شروع اور صفحہ ۱۴۱ پر ختم ہوتی ہے۔ انگریزی میں پرانی کتابیں اسی طرح اڈٹ ہوتی ہیں خاوری صاحب نے اس رنگ کی پوری پوری تقلید کی ہے اور شروع سے آخر تک اصل مثنوی میں انگریزی طریقہ کے مطابق بے گنتی فٹ نوٹ بھی دے ہیں تاکہ مثنوی کے سمجھنے میں طلباء اور قارئین کو مدد ملتی جائے۔

خاوری صاحب کی طبع خداداد نے 'تہدیہ' سے لیکر مقدمہ کے خاتمہ تک اور ہر فٹ نوٹ میں وہ وہ گل کھلائے ہیں کہ اس تبصرہ میں اُن کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے

خاوری صاحب کے طرز تحریر میں ایک خاص بات یہ ہے کہ آپ نہایت بے تکلفی کے ساتھ الفاظ کی نرالی اور نئی نئی ترکیبیں کام میں لاتے ہیں۔ ٹکسالی اردو کے پسند کرنے والے۔ قدامت پسند بزرگوں کی نظر میں ایسی ترکیبیں ضرور کھٹکیں گی

گرامی شخصیت ادب نوازی تشکر اور امتنان کا اظہار کرتے ہوئے خدمت ہا
خود لفظ تہذیب پر عربی دان اصحاب چونک پڑتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ محاورہ
عرب اس لفظ کو اس طرح استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

خاوری صاحب نے دیباچہ ایک لیکچر کی طرح "حضرات" سے شروع کیا۔
اور پہلے جملے کا منشا یہ ہے کہ مشرق کی پرانی تصنیفات کی جانب "مرتبین" یا
لکھنے والوں کے بقائے نام کی خاطر متوجہ ہونا چاہیئے۔ انجمن ترقی اردو دکن دارالمصنفین
اعظم گڑھ اور "دائرہ" ادبیہ لکھنؤ کو قابل تشکر فرما کر "وظیفہ شناس مصنفین" کو "انفرادی
طور پر" یہ نصیحت کی ہے "کہ جہاں ایک طرف تمدنی ترقی کے لئے مغربی علوم کا ترجمہ
وتدوین ناگزیر ہے وہاں دوسری طرف ہندوستانی تہذیب کے مشرقی عناصر کے
قیام و بقا کے لئے اپنے بزرگوں کے علمی و ادبی کارناموں کی ترتیب و اشاعت بھی
ایک ضرورت کا حکم رکھتی ہے" نصیحت اسی کی تاثیر رکھتی ہے کہ صحیح خود اس پر عمل
پیرا ہو۔ خاوری صاحب اس صداقت سے ناآشنا نہیں ہیں چنانچہ فرماتے ہیں
ہم نے انہی احساسات سے متاثر ہو کر اس مختصر مگر قابل قدر مثنوی کو مرتب کیا ہے"
یہاں مرتب کرنے سے مطلب اڈٹ کرنا ہے۔ اس کے بعد قابل دیباچہ نگار نے
یہ بات بتلائی ہے کہ یورپ اور امریکہ میں پرانی کتابوں کی ترتیب و تصحیح کا کام
ایک فن بن گیا ہے "ہندوستان میں ایک جزوی حیثیت رکھتا ہے"۔ پھر یہ امر بھی
واضح کیا ہے کہ یورپ اور امریکہ میں قوم اور حکومت ایسے کام کرنے والوں کو دنیا
و مافیہا سے بے نیاز کر دیتی ہے ہندوستان میں یہ نہیں ہوتا اور اس کا نتیجہ یہ ہے
قوم اپنے قوائے ذہنی سے عشر عشیر فائدہ نہیں اٹھا سکتی"۔ یہ سب ایسی صداقتیں ہیں خاوری صاحب
بیان فرمائی ہیں کہ ان سے انکار ہو ہی نہیں سکتا یہ اور بات ہے کہ اس موقع پر
[illegible] ان باتوں کا دہرانا ضروری تھا یا نہیں" بہرکیف اس سے آگے ایک

نفیس نکتہ بیان کیا ہے اور مناسب ہوگا کہ انہیں کے الفاظ کا اعادہ کیا جائے
جو قدیم کتابیں مرتب کی گئی ہیں ان میں ہندوستانی پبلک کے علاوہ غیر ملکی
اردو خوانوں کی ضروریات کو شاید کبھی ملحوظ نہیں رکھا گیا لیکن اب چونکہ اردو
ہندوستان کی چار دیواری سے باہر پہونچ چکی ہے اور دوسرے دلچسپی ہمیشہ سمجھنے
کی پیدا ہوتی ہے اس لئے ہم نے اس کتاب کی ترتیب میں ذرا ذرا سی بات پر
مفصل فٹ نوٹ دیا ہے اور اس امر کا التزام کیا ہے کہ کیا متن اور کیا مقدمہ میں
جہاں کہیں قابل لحاظ شخص کا نام آگیا ہے حسب ضرورت اس کے متعلق حاشیہ ذیل میں
ایک حد تک مبسوط اور مفید معلومات کا اضافہ کیا جائے

ہمیں اب تک اس بات کی خبر نہیں تھی کہ اردو پر ہندوستان کے باہر اتنی
توجہ ہونے لگی ہے کہ بیرونی قارئین کے فائدہ کا لحاظ کرکے اردو کتابوں پر فٹ نوٹ
لکھنے کی ضرورت داعی ہو جائے۔

ایک نہیں یہی خیال ان فٹ نوٹوں ان تفہیمات کا محرک نہیں ہوا ہے بلکہ
مؤلف کے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ اگر کسی یونیورسٹی کے نصاب میں یہ کتاب
داخل ہو جائے تو طلبا "حواشی کی بدولت متن اور مقدمہ کے ہر نقطہ پر کما حقہ جاوی
ہو سکیں"۔ بس یہی دو خیال اس مثنوی کے اس طرح اڈٹ کرنے کے محرک تھے۔

ایک اخلاقی نکتہ توجہ کے قابل ہے اسی دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ ایک
افسوسناک حقیقت ہے کہ عام مشرقی ارباب قلم اپنی تصنیفات میں کسی ہم عصر کا
نام عزت کے ساتھ لینا اپنی تنقیص سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم خوش ہیں کہ ہمارے اخلاق کا
دامن اس معاصرانہ تنگ ظرفی کے بدنما داغ سے بے لوث رہا ہے" خاور ہی صاحب نے
جملہ مشرقی ارباب قلم پر بڑا سخت الزام لگایا ہے۔ جس کو ہمارا خیال ہے کہ وہ شاید
ہی ثابت کر سکیں مگر اس دعوے سے قطع نظر کر لی جائے اور صرف یہ دیکھا جائے کہ

جو کوئی اہل قلم خواہ وہ مغربی ہو خواہ مشرقی اپنے معاصرین کے ساتھ معاصرانہ چشمک کا ہے وہ واقعی قابل افسوس ہے اور ہم کو بھی خوشی ہے کہ خاوری صاحب کے ان جیسا کہ وہ اطمینان دلاتے ہیں اس قبیح دھبہ سے پاک ہے بعد کا جملہ بھی نقل کرنے کے قابل ہے "ان دنوں چونکہ راقم الحروف پنجاب یونیورسٹی کی ڈی۔ او۔ ایل (ڈاکٹر آف اورینٹیل لنگ) کی ڈگری کے لئے فارسی ادب پر ایک کتاب لکھنے میں مصروف ہے اس لئے ندیم القرشی کے باعث واجد علی شاہ مرحوم کے متعلق کچھ لکھا نہیں گیا انشاء اللہ"۔

اس کا ہمیں بھی افسوس ہے کہ واجد علی شاہ اور ان کے عہد حکومت کے حالات خاوری صاحب کے جدت طراز قلم سے ضبط تحریر نہ ہو سکے اور ساتھ ہی جو وجہ بتائی گئی ہے اس پر ہم مسکراہٹ کو نہ روک سکے۔

دیباچہ کے خاتمہ پر باوجود اس قابلیت کے کہ آپ "اب یونیورسٹی کی ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگری کے لئے فارسی ادب پر ایک کتاب تحریر فرما رہے ہیں انتہائی سادگی اور انکساری سے فرماتے ہیں۔

"ہم کو اپنے قصور فہم کا اعتراف ہے اس لئے ہر قسم کی مناسب اور مخلصانہ ترمیم شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے گی"۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "مناسب اور مخلصانہ" ترمیم کی پہچان اور معیار کیا ہوگا؟ غالباً اسی دقت کو محسوس فرما کر لکھا ہے۔

"تاہم نقاد حضرات کی درد آشنائی سے توقع ہے کہ وہ تبصرہ کے وقت اس فن کی مشکلات اور مصروفیت کی تنگ وقتیوں کو ملحوظ رکھیں گے"۔

یہ ایسی قیدیں لگائی گئی ہیں کہ "مناسب اور مخلصانہ" ترمیم یا تنقید کرنے میں بھی یہ ڈر لگتا ہے کہ ممکن ہے کہ ہماری دانست میں جو مناسب اور مخلصانہ تنقید ہے وہ

ری صاحب کے نقطہ نظر سے ایسی نہ ہو بہر حال ہم یہی کر سکتے ہیں کہ اپنے خیالات ظاہر کر دیں۔

سب سے پہلے ہمارا یہ خیال ہے کہ اس کتاب میں فٹ نوٹوں کی ایسی بھرمار ہے کہ دل گھبرا جاتا ہے۔ فٹ نوٹ کا اصول یہ ہے کہ ایسے خاص امور جو اصل کتاب میں خوبی اور مناسبت سے نہیں آسکتے۔ لیکن مطلب کی وضاحت کے لئے ان کا بیان ضروری ہے، مختصر سے مختصر الفاظ میں صفحہ کے پائیں تحریر کئے جائیں۔ اول تو کتاب ان فٹ نوٹوں سے بدنما ہو جاتی ہے پڑھنے والے کو متن چھوڑ کر ان حواشی کو پڑھنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ خاوری صاحب معاف فرمائیں۔ فٹ نوٹ بازی انہیں لکھنے والوں کا مشغلہ ہوتا ہے جو اپنی کتاب کے موضوع کے ہر پہلو پر حاوی نہیں ہیں اور موضوع اور اس کے متعلقات اور لزومات پر قابو نہیں رکھتے۔ مثنوی پر فٹ نوٹ ہر ایک سینہ بھی رکھتے ہیں لیکن مقدمہ پر فٹ نوٹ اور بیسیوں جگہ محض بے ضرورت باتوں کی وضاحت خاوری صاحب کی توجہ کی محتاج ہے۔

اس مثنوی کا مقدمہ پنجاب کے فارسی زبان اور ادب کے اختصاص سے شروع ہوتا ہے اور خاوری صاحب نے اپنے پرزور قلم سے یہ دکھایا ہے کہ "فارسی شاعری اور ادب کا چراغ ابھی تک (پنجاب میں) گل نہیں ہوا ہے"۔ ہم حیران تھے کہ صائب کی مثنوی اور پنجاب کی۔ فارسی زبان اور ادب" کی بات چیت میں کیا تعلق ہے اور ان کی واقعہ نگاری اور بدعت پسندی کے مرثیے رہے تھے "مولانا گرامی جن کو حضرت نظام دکن ظلہ کو استادی کا امتیاز حاصل ہے جالندھر کی تخلیق ہے" جالندھر کی تخلیق کا مطلب پرانی زبان میں یہ ہے کہ گرامی جالندھر کی خاک سے اٹھے تھے۔ ہمیں جہاں تک علم ہے اس جالندھر کی تخلیق کی استادی کا قصہ محض قصہ ہی ہے۔ کسی جالندھری دماغ کی تخلیق ہے۔ اس پنجاب اور پنجاب کی فارسی [illegible] مثنوی کی [illegible]

اس طرح گریز کی ہے کہ۔

"اب یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ اردو نے فارسی ہی کی آغوش میں پرورش پائی ہے پس جہاں فارسی کا چرچا زیادہ ہوگا وہیں اردو کو بھی نشو و نما کا صحیح موقع مل سکے گا۔"

ہمیں اس کا موقع نہیں کہ اس استدلال کو منطقی حیثیت سے جانچیں اور لطف یہ ہے کہ قریب قریب سارے مقدمہ میں اس قسم کے استدلال کی پر لطف مثالیں ملتی ہیں۔ خاوری صاحب نے اردو ادب میں اولیت کی بحث بھی چھیڑ دی ہے اور فرماتے ہیں

"فارسی، ہندی عناصر کو اولاً امیر خسرو دہلوی نے نہیں بلکہ ان سے قریب قریب دو صدی پہلے مسعود سعد سلمان لاہوری نے ترکیب دیا ہے۔"

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اردو اب اتنی مقبول ہو چلی ہے کہ ہندوستان کا ہر حصہ اس بات کا متمنی ہے کہ اردو کی ابتدا اپنی سرزمین سے ثابت کرے۔ یہ تصفیہ شاید کبھی نہ ہوگا کہ اردو کہاں سے شروع ہوئی اور اردو کا پہلا شاعر کون تھا لیکن بعض اہل قلم کی یہ کوشش مصروفیتوں کے لئے ایک دلچسپ مشغلہ رہے گا اور اس بہانے اردو کی بہت سی پرانی کتابوں گمنامی کے پردہ سے نکل آئینگی

یہ تبصرہ اس قدر طول ہو گیا ہے کہ خاوری صاحب کے مقدمہ کے بارے میں صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ یہ دلچسپ چیز ہے اور اس میں بہت سی ایسی بحثیں اٹھائی گئی ہیں جن پر تبصرہ لطف سے خالی نہ ہو۔ صرف دو ایک باتوں کی طرف توجہ دلانی کافی ہے۔

قصیدہ کے اڈٹ کرنے کے جوش میں خاوری صاحب اس مثنوی کو میر حسن کی مثنوی بدر منیر پر فوقیت دے گئے ہیں۔

صفحہ (۸۰) پر جو فٹ نوٹ ہے اس کا لب و لہجہ ٹھیک نہیں کسی کے عقیدہ کے متعلق

خواہ وہ ہمارے نزدیک ٹھیک نہ ہو "تبسم انگیز" حاقت" لکھنا خادری صاحب کی قابلیت اور کلچر کے شایان نہیں۔

"مثنوی کے متعلق بھی اس وقت سوائے اس کے ہم اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ایک مسلمہ استاد کی چیز ہے اور عمدہ چیز ہے۔ ہمارے مسلمہ شعرا کو بھی واقعہ نگاری اور مسلسل گوئی سے بہت کم لگاؤ رہا ہے اور اس بحث پر بہت کچھ غور و خوض اور اس جانب بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے اس قسم کی مثنویوں کے عمدہ نمونے جہاں تک اردو میں رواج پائیں مناسب ہے۔ "صید یہ" کی کتابت وغیرہ خاصی ہے۔ قیمت (عہ)

نورالدین احمد صاحب

منیجر دارالبلاغ لاہور سے مل سکتی ہے

شذرات

گلبرگہ میں جاپان | جناب مولوی سجاد مرزا صاحب بی اے صدر مہتمم تعلیمات نے جاپان کی سیاحت کو صرف اپنی ذاتی سیر و صحت تک محدود نہیں رکھا بلکہ وہ انجمن اساتذہ گلبرگہ کے لئے جاپان سے وہاں کے ایک سو سلائڈز (طلسمی فانوس کے نقشے) لائے ہیں اور اپنے مفید معلومات متعدد تقاریر میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کی پہلی تقریر محبوب کلب گلبرگہ میں ہوئی۔ قلت جگہ کے باعث حاضرین کو ہال کے باہر بھی کھڑا ہونا پڑا۔ حاضرین کی تعداد باوجود بارش تین چار سو کے درمیان تھی۔

مقرر صاحب نے جاپان کی تاریخ، خودکشی، پردہ، بچوں کی شگفتگی، میز مقامات زیور اور گالیوں سے احتراز، پردہ، صفائی، اخلاق پر ایک گھنٹہ سے زیادہ دیر تک تقریر فرمائی۔ پھر ۲۰ منٹ تک طلسمی فانوس کے ذریعہ سے جاپانی بچے کی پیدائش، نشوونما، کھیل، راستہ، مدرسہ، ورزش، تعلیل میں بھی مدرسہ آنا، مدرسہ میں کھانا کھانا بتا

اور اس کی تشریح فرمائی جاپانی سلائڈز سے پہلے خبر مقدم کے الفاظ جاپانی پھول اور اعلیٰ حضرت خسرو دکن خلد اللہ تعالیٰ ملکہ کی تصویر نمایاں کی گئی جس پر زور سے تصفیق ہوئی۔ صدر جلسہ جناب نواب ناظر یار جنگ بہادر شمس نے ۲۰ منٹ تک جاپان اور ہندوستان کا مقابلہ کرکے عمل کی ترغیب دی۔

ایران سے سررشتہ تعلیمات کی بیداری کی خبریں آرہی ہیں چنانچہ حال میں حاکم سیستان نے سرکاری مدرسہ کا معائنہ کیا اور اصلاح و درستی کی بابت کارروائیاں عمل میں لائیں مہتمم مدارس کے حقوق اور اختیارات میں اضافہ کیا گیا اور عام طلبہ کے لئے ایک قسم کا خاص لباس مقرر کیا گیا۔

ایران کے سررشتہ تعلیمات نے اپنے موازنہ میں اس سال تین ہزار تومان اس غرض سے رکھا ہے کہ عجائب خانہ تعلیمی قائم اور اس کے لوازمات فراہم کرنے کے لئے ایک خاص فن جرمنی سے طلب کیا جائے جو اس عجائب خانہ کا مہتمم ہو۔

بمبئی میں اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ طلبار مدارس کے لئے شہر کے مختلف حصوں میں کھیلنے کیلئے میدان حاصل کئے جائیں مجلس صفائی نے دو میدان اس غرض کے لئے محفوظ کرنے کا تصفیہ کردیا ہے۔ ان میدانوں کی نگہداشت محکمہ صفائی کی جانب سے ہوگی مسٹر دیسر کی زیر نگرانی مختلف کھیل جمناسٹک وغیرہ ہوگی۔ جدید آلات ورزش فراہم کئے جائیں گے اور علاوہ کمسن بچوں کے نوجوانوں کو بھی فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے گا۔ ہمارے یہاں بھی اس کی ضرورت ہے کہ بڑے بڑے مقامات پر اس قسم کے میدان محفوظ کئے جائیں اور جمناسیم قائم کئے جائیں تاکہ طلبار میں ورزش کا شوق پیدا ہو اور ان کی جسمانی حالت درست ہو۔

حیدرآباد ریاست میں ایک یونیورسٹی کے قیام کی کارروائی جاری ہے تعلیمی ترقی کے نظر کرتے

ہندوستان میں ٹراونکور سب ممالک سے بڑھا ہوا ہے

سر ابراہیم بھائی کریم بھائی نے بمبئی یونیورسٹی کو دس لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا ہے تاکہ یونیورسٹی میں مسلمان طلبا، کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہوسکے اس رقم میں سے مستحق طلبا، کو وظائف بھی دیے جائینگے

نوآبادیاں بسانے والوں کی زراعتی تربیت

چونکہ ہندوستان کے بعض حصوں میں اس قسم کی تجاویز زیر غور ہیں اس لیے کہ تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری کے مسئلہ کو حل یوں کیا جاسکتا ہے نوآبادیوں کی بعض اسکیموں کے مطابق انتظام کیا جائے لہذا ہمارے قارئین کے لئے اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہوگا کہ انگلستان میں جامعہ نارفوک (نارفوک یونیورسٹی) سے ملحق ایک زراعتی کالج قائم کرنے کی تجویز کی گئی ہے۔ اس کا منشا، یہ ہوگا کہ ان تعلیم یافتہ حضرات کو زراعتی تربیت دی جائے جو آسٹریلیا میں جاکر بسنا چاہتے ہیں۔ کالجوں کے تعلیم یافتہ لوگ اس کالج میں بہ حیثیت نوآبادی میں بسنے والوں کے تربیت پائینگے اور بعد تربیت تھوڑے سرمایہ کے ساتھ کالونیس لینڈ کو بھیجے جائیں گے اور پوری کوشش کی جائے گی کہ ان کے لئے وہاں ایسے حالات پیدا کئے جائیں جو ان کے موافق و مساعد ہوں۔ آسٹریلیا اور انگلستان کے چند عالی ہمت اور اعلیٰ منصوبوں والے اصحاب نے اس اسکیم کو معرض وجود میں لانے کی کوشش کی ہے کالونیس لینڈ کی حکومت نے وعدہ کیا ہے کہ اس معاملہ میں بڑی رعایات کی جائینگی حکومت مذکور نے زمین کا بہت بڑا قطعہ اس غرض سے محفوظ کر دیا ہے اور حکومت بسنے والوں کو قرض بھی دے گی لیکن کسی صورت میں قرض کی مقدار ساڑھے سات سو پونڈ سے زیادہ نہ ہوگی ہر بسنے والے کو (۱۶۰) ایکڑ زمین دیجائے گی اور یہ بھی تجویز کی گئی ہے کہ بسنے والوں کی ٹولیاں کردی جائیں تاکہ ہم مذاق لوگوں کی صحبت رہے۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ پہلے سال ہر بسنے والے کی آمدنی تین سو پونڈ ہوگی کیا ہندوستان میں حکومت اس جانب قدم نہیں اٹھا سکتی تاکہ پڑھے لکھے لوگوں کی بے روزگاری کا مسئلہ اس ملک میں ایک حد تک حل ہوجائے۔

مسلمان خواتین کی پبلک امور میں گہری دلچسپی | بتاریخ ۱۰ اگست پونا میں بمقام حسینی باغ احاطہ بمبئی کی مسلم خواتین کی کانفرنس کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا شیخ عبدالقادر صاحب، صدر پنجاب لیجس لیٹو کونسل کی بیگم صاحبہ کرسی صدارت پر متمکن تھیں بیگم صاحبہ ممدوحہ سر جلال شاہ کے ہاں مہمان تھیں۔

کانفرنس میں بہت سی بیویاں شریک ہوئیں اور کل کارروائی نہایت باضابطہ ہوئی پردہ کا سختی کے ساتھ انتظام کیا گیا تھا ہر ہر تجویز (رزولیوشنوں) پر جو تقریریں ہوئیں اُن کو بہت شوق سے سنا گیا اور کل تجاویز نہایت گرم جوشی سے منظور کی گئیں۔ کل کارروائی کے دوران میں ایک خاص کیفیت طاری تھی جس سے عزم صحیح اور شوق و ذوق ٹپکتا تھا۔

ممتاز بیگمات میں چند کے اسمائے محترم ذیل میں درج ہیں۔

جناب نفیس دلہن صاحبہ۔ بیگم صاحبہ سیر ابراہیم رحمت اللہ۔ بیگم صاحبہ عمر حیات ٹاٹا۔ مسز لارنس۔ مسز ہدایت اللہ۔ مسز دہلوی۔ مسز سلمان طیب جی۔ [illegible] جی۔ مسز ہن۔ مسز ابراہیم ہارون جعفر۔ مس پی سہراب جی۔ بیگم صاحبہ محمد عمر۔ مسز کمال فیض۔ مسز حاجی مرسی۔ مسز مولا دینا۔ ان کے علاوہ حیدرآباد (دکن) پنجاب اور احاطہ بمبئی کی اور بہت سی معزز خواتین شریک تھیں۔

کلام مجید کی تلاوت سے کارروائی کا آغاز ہوا اور مسز حامد علی کی تحریک پر بیگم صاحبہ عبدالقادر کا کرسی صدارت کے لئے انتخاب ہوا۔ صدر صاحبہ نے پھر اپنا خطبہ صدارت پڑھا۔ خطبہ میں بیگم صاحبہ نے یہ مشورہ دیا کہ اس کانفرنس کے شاخیں انجمنوں کی صورت میں کل احاطہ بمبئی میں قایم ہونی چاہئے اس بات کی سخت ضرورت ہے ایک آل انڈیا خواتین کانفرنس کی تشکیل کی جائے تاکہ مسلمان خواتین کی دنیا میں بھی سماجی (سوشیل) سرگرمیوں اور لکچروں کے ذریعہ کلچر اور تعلیم کا رنگ چڑھایا جا سکے۔ صدر صاحبہ نے اس طرح کانفرنس کی صورت میں اکٹھے ہونے کی اہمیت پر بڑا ہی

زور دیا انہوں نے کہا کہ کلچر اور علم کی ذہنی بیویوں کے ساتھ مل بیٹھنا ہی ایک طرح کی تعلیم ہے۔

مسز ابراہیم کی تحریک اور مس سہراب جی اور بیگم اظہر علی کی تائید سے حسب ذیل تجویز منظور ہوئی۔

چونکہ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ غریب اور فلاکت زدہ مستورات کی سماجی خدمت کی جائے اس لئے مناسب ہوگا کہ فوراً ایک انجمن اس غرض سے قائم کی جائے کہ ارکان باقاعدہ یکجا جمع ہوں اور ہسپتالوں میں جو بے استطاعت عورتیں اور بچے ہیں ان کے لئے کپڑے سئیں اور ہسپتالوں اور مدارس کا معائنہ کرکے ان کپڑوں کو مستحقین کو بانٹیں اس انجمن کی رکنیت صرف مسلمان بیویوں تک محدود نہ ہو اور جن عورتوں اور بچوں کو امداد دی جائے اس میں بھی مذہب اور ذات کا خیال نہ کیا جائے۔

دوسرے رزولیوشن میں مسٹر پرادھان کے (لوکل آپشن بل) مقامی صوابدید کے مسودہ (قانون) کی تائید کی گئی تھی اور اس بات کا یقین ظاہر کیا گیا تھا کہ مقامی حکومتوں کو ترک مسکرات کا اختیار دینا گویا اس بات کی پہلی سیڑھی ہوگی کہ ترک مسکرات عام ہو جائے۔

مسز سلمان طیب جی کی تحریک اور مسز امیر حسن اور مسز ہمایون مرزا کی تائید سے ایک اور تجویز منظور ہوئی۔ اس تجویز میں علی گڑھ کانفرنس (۱۹۲۳ء) والے رزولیوشن کا اعادہ کیا گیا یعنے یہ کہ مسلمانوں میں کثرت ازدواج کو ترک کیا جائے اور ایک بیوی کے اصول کو ترجیح دی جائے۔

چند اور رزولیوشن منظور کئے گئے اور خاتمہ پر صدر نشین صاحبہ نے رضاکاروں اور کارگذاروں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ کانفرنس نے جس طرح بغیر رکاوٹوں کے کام کیا ہے

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کانفرنس کے ارباب کار تنظیم کی اعلیٰ قابلیت رکھتے ہیں۔ اس احاطہ کی مسلمان خواتین کو ان بیویوں کا جنہوں نے یہ سب کام اس خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے بے انتہا احسانمند ہونا چاہیئے۔

مسز ابراہیم ہارون جعفر نے معزز صدر صاحبہ کے لئے دلی شکریہ کی تحریک کی جو بڑے جوش و خروش سے منظور کی گئی صدر صاحبہ کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور کانفرنس کی کارروائی ختم ہوگئی۔

---

۲۰ جون کو مسٹر میک ملن ایک نئے براعظم کی تلاش میں روانہ ہونے والے ہیں جو بعض جغرافیہ دان کے قیاس کے بموجب آلات کا اور نارتھ قطب شمالی پول ( ) کے درمیان واقع ہے اور جس کا رقبہ تقریباً دس لاکھ مربع میل ہے۔ برف کے طوفانوں کی وجہ سے دنیا کا یہ حصہ باوجود سخت جد وجہد اسوقت تک دریافت نہ ہوسکا لیکن اب امید ہے کہ ہوائی جہازوں کی مدد سے مسٹر میک ملن اپنے منصوبہ میں ضرور کامیاب ہوں گے۔

موٹر کار کے موجد مسٹر ایل وڈ ہنیز کا انتقال ہوگیا۔ تاریخ میں ایسے موجد کم ملیں گے جنہوں نے اپنی زندگی میں اپنی ایجاد کو ایسا سرسبز ہوتے اور تمام عالم میں غیر معمولی تغیرات کرتے دیکھا ہو۔

امریکہ کی تقلید میں انگریز و جاپانیوں نے اعلان کیا ہے کہ چینی حکومت سے جو کثیر رقم بطور تاوان بلوہ باکسر وصول کی جاتی ہے وہ اب چینی طلبا کی تعلیم و تربیت میں صرف کی جائے گی۔

آنکھ کی تندرستی

چند ضروری باتیں

بہت چمکیلی چیزوں کو زیادہ دیر تک گھورنا نہیں چاہیئے۔

روشنی ٹھیک ہونی چاہیئے یعنی نہ تو ضرورت سے زیادہ تیز ہو اور نہ بہت دھندلی دھندلی روشنی پیچھے سے اس طرح آنی چاہیئے کہ روشنی کتاب پر پڑے آنکھ پر نہ پڑے۔ مثلاً کھڑکی کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھا جائے تو یہ بات حاصل ہوگی۔

ہمیں خطا یا مرٹے ہوئے حروف والے چھاپے کی کتاب یا اخبار سے بچنا چاہیئے۔

ٹائپ کی صورت میں حروف کی اونچائی (ہ) اور موٹائی (ہ) ملی میٹر سے کم نہ ہونی چاہیئے۔

سامنے سے دھوپ آنکھوں پر پڑتی ہو یا جھٹپٹے کا وقت ہو تو پڑھنا نہیں چاہیئے

بچوں کی مدرسہ کی پڑھائی تندرستی کا لحاظ کرتے پانچ یا چھ برس کے سن سے شروع ہونی چاہیئے

کتب بینی کے دوران میں آنکھوں کو کتاب پر سے ہٹا کر ان کو آرام دینا ضروری ہے جس وقت منہ اٹھانا ہو تو اس وقت اس طرح آرام بھی دے لیا جائے۔

ریل یا گاڑی میں یا پلنگ پر لیٹ کر کبھی نہ پڑھنا چاہیئے۔

لکھنے اور پڑھنے کے وقت سر اور جسم کو سیدھا رکھنا چاہیئے میز اور کرسی ایسی ہونی چاہیئے کہ بیٹھنے میں آرام ملے اور بچوں کو کتاب پر جھکنا نہ پڑے بچوں کو یہ عادت ڈالنی چاہیئے کہ

*

وہ لکھنے یا پڑھنے میں جھکیں نہیں۔ میز اتنی اونچی ہونی چاہیئے کہ آنکھ میں اور اس کے بارہ سے اٹھارہ انچ تک فاصلہ رہے۔ میز کا تختہ اتنا ڈھلواں ہو کہ ۳۰ درجہ کا زاویہ بنائے تاکہ جھکنا نہ پڑے گردن کی کبھی کمر کی پیڑہ جو مدرسہ کے بچوں میں پائی جاتی ہے اس کی وجہ بھی ہے کہ نشست کے صحیح طریقہ سے اُستاد اور شاگرد دونوں غفلت برتتے ہیں۔

بڑی دانشمندی کی بات ہے کہ **فطرت کی انتباہ پر کان دھرنا چاہیئے**

فطرت حسب ذیل طریقوں سے متنبہ کرتی ہے۔

آنکھوں میں پانی کا آنا۔ آنکھوں کا جلنا۔ روشنی کا نہ سہنا۔ کھجلی۔ سرخی۔ پلکوں کا جھڑنا ایک آنکھ کا دوسری سے چھوٹا ہونا۔ پھڑکنا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور جھریاں نرچھاپن۔ پیشانی پر شکنیں۔ تلانا۔ اعصابی بے چینی آنکھیں مچ مچانا۔ دوران سر و درد کتابوں سے نفرت پڑھنے میں اونگھنا۔ سرع۔ توجہ کا انتشار۔ بدمزاجی بھول پسی۔ تکان پڑھنے کی چیزوں کو ہٹا۔ آنچ سے ذرے یا پرے رکھنا۔ رات کو ہیں خط یا ٹائپ کے پڑھنے میں تکلف۔ آنکھوں میں تر مرنے یا کالے دھبوں کا پھرنا۔

مشیر	ہارڈی اینڈ کمپنی
ڈاکٹر کے۔ پی۔ پوپٹ	ماہرین نظریات وینک ساز۔ لندن
ایل آر سی پی ایس ایل ایم (ایڈنبرا)	جیمس اسٹریٹ۔ سکندرآباد (دکن)
جراح چشم لندن	

رسالہ ہمدرد تعلیم لاہور | شمالی ہند کا نامی گرامی تعلیمی رسالہ ہیں سال سے پوری شان و شوکت کے ساتھ شہر لاہور سے شائع ہو رہا ہے اس کی خوبیاں اس کے مطالعہ سے ظاہر ہو سکتی ہیں قیمت سالانہ تین روپیہ سکہ کلدار مجموعہ بارہ (۱۲۰) نمبر ملنے کا پتہ

مینیجر بکڈپو رسالہ ہمدرد تعلیم لاہور

جزو ذیقعدہ انگریزی ۱۹۱۷ء نشان ۲۰۶۵ء
جزو شعبان ۱۳۳۵ھ نشان ۱۲۱۷
جلد دوم
نمبر ۴

المعلم

ماہ آذر ۱۳۳۵ف

مدیر..... محمد سجاد مرزا یم۔ اے (کنٹب).....

شریک مدیر..... محمد عظمت اللہ خاں۔ بی۔ اے .....

اعظم سٹیم پریس چاینا
حیدرآباد دکن

*

قواعد

(۱) یہ محض تعلیمی رسالہ ہے جس میں تعلیم کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے سیاسی مذہبی مضامین شریک نہ کئے جائیں گے۔

(۲) یہ رسالہ ہر ماہ فصلی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۳) پرچہ وصول نہ ہو تو ہر ماہ فصلی کی ۲۵ تاریخ تک خریدار صاحبان بحوالہ نمبر خریداری مطلع فرمائیں

(۴) جو مضامین ناقابل طبع متصور ہوں گے ان کی واپسی خرچہ ڈاک کی روانگی پر منحصر ہوگی۔

(۵) اس رسالہ کی قیمت سالانہ (۳) مع محصول ڈاک ہے جو پیشگی لی جائے گی۔

(۶) نمونہ کا پرچہ پانچ آنہ کے ٹکٹ وصول ہونے پر ارسال کیا جائے گا۔

(۷) جوابطلب امور کے لئے جوابی کارڈ وصول ہونا چاہئے ورنہ ادائی جواب میں معذوری رہے گی

(۸) اجرت طبع اشتہارات درج ذیل ہے رقم وصول ہونے پر اشتہارات طبع کئے جائیں گے۔

تعداد مدت	صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
ایک بار	۱۰	۸	۶
سہ ماہ	۲۵	۱۵	۸
ششماہ	۴۰	۲۵	۱۵
سالانہ	۷۰	۴۰	۲۵

(۹) جملہ مراسلت و ترسیل رقوم منی آرڈر وغیرہ موسومہ شریک مدیر پتہ ذیل پر ہونی چاہئے

محمد عظمت اللہ خاں بی اے شریک مدیر

دفتر رسالہ المعلم بلگرامی ہوس سانچہ توپ

حیدرآباد دکن

*

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مندرجات

المعلم

(۱) جامعہ عثمانیہ کے پہلے جلسہ اسناد کا خطبہ۔ عالیجناب نواب ذی الدولہ بہادر صدر اعظم و امیر جامعہ (۱ تا ۸)

(۲) عملی جغرافیہ ابتدائی مدارس میں۔ از جناب مسٹر راوصاحب بی ایل ٹی پرنسپل مدرسہ تعلیم المعلمین ہنمکنڈہ اورنگ آباد (۸ تا ۱۱)

(۳) سائنس۔ از جناب ویدوراج صاحب ساتی سائنس ٹیچر حیدرگھاٹ ہائی سکول بلدہ (۱۱ تا ۱۷)

(۴) لکان از مولوی عبدالعزیز صاحب بی اے (علیگ) مدرس ریاضی جاگیردار کالج بیگم پیٹ (۱۸ تا ۲۰)

(۵) ٹراونکور میں تعلیم ۔ شریک مدیر (۲۰ و ۲۱)

(۶) تبصرہ۔ شریک مدیر (۲۲ تا ۲۵)

(۷) شذرات۔ (۲۶ تا ۳۲)

جلد ۲ | بابتہ ماہ آذر سنہ ۱۳۳۵ ف | نمبر ۴

جامعہ عثمانیہ کے پہلے جلسۂ اسناد کا خطبہ امیر جامعہ

بتاریخ ۲۳ مہر آبان سنہ ۱۳۳۵ ف باغ عامہ کے خوبصورت ٹون ہال میں جامعہ عثمانیہ کا پہلا جلسۂ اسناد منعقد ہوا جلسہ نہایت کامیاب تھا اس موقع کی اہمیت کے لحاظ سے خوبصورت عمارت کو سلیقہ سے سجایا گیا تھا نشستوں کا انتظام مناسب تھا اور جلسہ کا دورانی پروگرام کے مطابق ہوئی۔ جیسا کہ عالیجناب امیر جامعہ نے اپنے خطبہ میں اشارہ کیا ہے یہ ایک تاریخی جلسہ تھا اور آنے والی نسلیں دراز زمانہ کے فاصلہ کے بعد اس کی اہمیت کو

ہم لوگوں سے بہت زیادہ محسوس کریں گی اس لئے کہ اس وقت تک اس جامعہ کے فارغ التحصیل نہ صرف ممالک محروسہ سرکار عالی بلکہ ہندوستان کے دیگر حصوں میں بھی اپنی جامعہ کے اصول کی صحت کو کامیابی کے ساتھ ثابت کر چکے ہوں گے اور اردو بولنے والی دنیا ان کے علمی اور ادبی کارناموں کو تسلیم کر چکی ہوگی۔ نواب امیر جامعہ کا خطبہ ناظرین المعلم کے لئے ذیل میں درج کیا جاتا ہے ہمیں اتنا جتلانا ہے کہ ہمارے اساتذہ اس خطبہ کو غور سے پڑھیں اس لئے کہ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی کے اساتذہ کے عمدہ کام اور اخلاص مندانہ درس تدریس سے ہی اس ہماری جامعہ کو ایسے ہونہار اور سدھے سدھائے طلبا ملیں گے جو آگے چلکر اپنی جامعہ کا سکہ منوائیں گے اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارے اساتذہ اس خیال کو پیش نظر رکھ کر اپنی سرگرمیوں اور ہمدردی سے دکن کی ہونہار پود کی تعلیم کو پوری طرح کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں گے۔ اس زرین یادگار عہد عثمانی کی خدمت راست یا بالواسطہ اپنے مالک اور ملک کی خدمت ہے

شریک مدیر

آج کی تقریب مسرت میں بحیثیت امیر جامعہ آپ صاحبوں کا خیر مقدم میرے لئے موجب نازش و انبساط ہے اس میں کچھ کلام نہیں کہ آج کا دن تاریخی و یادگار دن ہے یہ محض تقسیم اسناد ہی کی تقریب نہیں ہے بلکہ یہ اس مبارک سعی کی بارآوری کا یوم مسعود ہے جس کی طرف ہم سب کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں اور جس کی بنا آٹھ سال پہلے ہمارے آقائے نامدار اور علم و ہنر کے مربی اعلیحضرت شہریار دکن خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ نے رکھی تھی اور اپنی فراست و دور اندیشی اور روشن خیالی اور بلند حوصلگی کا ایسا کرشمہ اہل بصیرت کو دکھایا تھا جس کی نظیریں تاریخ کے اوراق میں بہت کم ملتی ہیں۔

اس جامعہ کی تاسیس ممالک ہند کی تاریخ تعلیم میں ایک بالکل جدید اور پر امید

باب کا اضافہ ہے۔ گزشتہ نصف صدی سے تمام ہندوستان میں ہر قسم کے علم و فن کی اعلیٰ تعلیم کا جو اصول نافذ اور مسلم ہے اس کے خلاف یک لخت ایک نئے اصول کا اختیار کرنا، یعنی انگریزی زبان کی بجائے ایک دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا بڑی جرأت و ہمت کا کام تھا۔ اکثر اہل الرائے اور ماہران تعلیم اس جدت و اجتہاد پر متردد تھے اور انہیں اس تجربے کی کامیابی کے متعلق بہت کچھ شبہ تھا۔ جن صاحبوں نے اعلیٰ تعلیم اور طریق تعلیم کی داستان پڑھی ہے اُن سے یہ نکتہ مخفی نہ ہوگا کہ دنیا کے ہر ملک میں جہاں تہذیب و تمدن کا قدم آیا وہاں انسانی علم کے خاص معارف و اسرار سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے کسی نہ کسی غیر زبان کا رہین منت ہونا پڑا۔ ازمنۂ وسطےٰ میں یورپ کی درسی زبان لاطینی تھی اور نہ صرف لاطینی بلکہ پے ڈوا۔ بولونا اور پیرس و روما کے شہرۂ آفاق علمی جامعات میں خود ہماری مقدس زبان عربی کا تسلط تھا۔ انگلستان میں جب اعلیٰ تعلیم کا دور آیا تو وہاں بھی یہی ہوا اور بڑے بڑے علمی مرکزوں میں لاطینی ایسی ہی لازمی تھی جیسے ہمارے ملک میں اس وقت انگریزی زبان ہے اس لئے لاطینی کی واقفیت کے بغیر علم و فن کے کسی شعبہ میں قدم بڑھانا غیر ممکن تھا۔

لیکن حضرات! غیر زبانوں کے ذریعہ سے علم کی تحصیل کیسی ہی مفید اور ناگزیر کیوں نہ مانی جائے، یہ سلسلہ غیر محدود زمانہ تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اقوام کی زندگی میں ایک ایسا وقت آتا ہے جبکہ علم کا شوق اور تشنگی اُن کو بیتاب کر دیتی ہے اور یہ جوش اس قدر عام اور موج زن ہو جاتا ہے کہ نہ اُس سے اغماض ہو سکتا ہے اور نہ غیر زبان کی محدود وساطت اسے سیراب کر سکتی ہے یہی اسباب تھے کہ یورپ کے ملکوں میں لاطینی کے بجائے ملکی السنہ کو اختیار کرنا ضروری ہوا۔ گویا وہ دیواریں جنہوں نے حصول تعلیم کے راستے کو تنگ گھاٹی بنا رکھا تھا، توڑ کے فراخ و کشادہ شارع عام تیار کی گئی اور اس کے ساتھ ہی علوم و فنون کے قصر پر یورش ہوئی اور اس پراسرار

لاطینی حصار کے دروازے کھل گئے۔ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ ملکی زبان میں اعلیٰ تعلیم دینا بجائے خود ملکی فلاح و ترقی کی دلیل اور اہل ملک کی روشن خیالی اور ہمت کا ثبوت ہے۔ اٹالیہ، فرانس، انگلستان سب جگہ یہی عمل ہوا اور باہر کی علمی زبان کی جگہ قوم کی مروجہ زبان ذریعہ تعلیم قرار پائی۔ قریب زمانہ میں اسی قسم کا انقلاب ملک جاپان میں واقع ہوا یہ دیکھ کر کہ خود ہمارے عزیز وطن میں دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے متعلق جو شبہات اور اندیشے تھے وہ کلیتاً زائل اور نابود ہو گئے مجھے الفاظ نہیں ملتے کہ اپنی دلی فخر و مسرت کا اظہار کروں۔

حضرات! ہمارا تجربہ کامیاب ہوا۔ ہمارے روشن ضمیر فرمانروا (خلد اللہ ملکہ) نے انتہائی لطف و کرم اور کمال رعایا پروری سے جس حقیر تخم کی آبیاری فرمائی تھی وہ آج ایک تناور درخت کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ یہی نہیں کہ ہمارے تجربہ کے سرسبز و کامیاب ہونے میں کسی کو شبہ کی گنجایش باقی نہیں رہی، بلکہ میں ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی اسی آواز کی گونج سنتا ہوں جو چند سال پہلے بلدۂ فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں بلند ہوئی اور محض "صدا بصحرا" سمجھی جاتی تھی۔ اب وہ رفتہ رفتہ اس اصول کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ آئندہ چند سال میں ہم برہمانوی ہند کی اعلیٰ درسگاہوں کو جامعہ عثمانیہ کے نقش قدم پر گامزن فرسائی کرتا ہوا دیکھیں۔

یہ امر بلاشبہ موجب مسرت ہے کہ جامعہ کی عام تعلیم اور اس کے مختلف شعبوں کی حالت نہایت قابل اطمینان ہے۔ لیکن جامعہ عثمانیہ کو تحقیقی جامعہ بنانے کے لئے ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ ہمیں فارغ التحصیل طلباء کے واسطے بہتر سے بہتر ماہرانہ اور محققانہ تعلیم و رہنمائی کا انتظام اعلیٰ پیمانہ پر کرنا ہوگا، اور مجتہدانہ تحقیقات اور اکتشافات کے جدید سے جدید سامان مہیا کرنے ہوں گے۔ اگرچہ ان چیزوں کا کچھ کچھ آغاز ہو چکا ہے اور دوسرے علوم کے ساتھ طب اور انجنیری جیسے فنون کی تعلیم کا بھی انتظام ہو رہا ہے

اور اُن کی توسیع کی فکر کی جارہی ہے، تاہم ہماری جامعہ عثمانیہ بالکل ابتدائی اور گویا طفولیت کی حالت میں ہے۔ جب تک ہم اعلیٰ تعلیم و تحقیقات کا سرانجام کرنا اپنا مطمح نظر نہ بنائیں گے اس وقت تک نئی دنیا ہماری سعی کی کچھ بہت قدر و منزلت کرنے پر آمادہ نہ ہوگی۔ علوم میں بھی جن شعبوں کی محققانہ تعلیم کی طرف توجہ کرنا جامعہ عثمانیہ کا سب سے مقدم فرض ہے، وہ ہمارے قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم طبعی ہیں، جو ہماری دماغی اصلاح کے ساتھ ہماری معاشرت کی بھی اصلاح کریں گے، جو ہمارے ملک میں دولت و ثروت کا دریا بہادیں گے اور ہماری سرزمین کو لہلہاتی کھیتیوں اور ہمارے بازاروں کو حرفت و دستکاری کی صناعیوں سے مالا مال کردیں گے۔ ان علوم کے سمجھنے اور سمجھانے سے نہ صرف ہماری قوم بلکہ درحقیقت نوع انسان کا ذہنی اور خارجی ارتقاء وابستہ ہے۔ اس لئے ہم سب کا فرض ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی عظمت و شان بڑھانے میں تا مقدور کوشش کریں۔ اب تک اشاعت علوم کے لئے یہاں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے وہ سب اعلیحضرت واجد الدین خسرو دکن (خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ) کے دست کرم کا مرہون احسان ہے۔ اور یہی سبب تھا کہ جامعہ عثمانیہ کی جانب سے سب سے پہلا اور سب سے اعلیٰ خطاب فضیلت، یعنی "سلطان العلوم" کمال شکرگزاری اور انتہائی عقیدت و ارادت کے ساتھ اپنے سرپرست دمربی کے حضور میں پیش کیا گیا۔

حضرات! یہ ایک مشہور قول چلا آرہا ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور دونوں کا ملنا محال ہے لیکن اب حالت عالم دگرگوں ہیں، واقعات نے ایک دوسرا پلٹا کھایا ہے، نئے انقلاب، زندگی کے ہر شعبے میں بپا ہو رہے ہیں اور ہمیں اپنے مسلمات اور اصول میں جدید تبدیلیاں کرنی پڑی ہیں اور اب اس قول کی صحت میں بھی قوی شبہ پیدا ہوگیا ہے۔ اہل مشرق خوب جان گئے ہیں کہ ہمیں کن چیزوں میں اہل مغرب کی احتیاج ہے اور اہل مغرب بھی اب سمجھنے لگے ہیں کہ ہمیں مشرق سے کیا سیکھنا چاہئے۔

آپس کی کمی پورا کرنے کے لئے ان دونوں کا ملنا لازم ہے۔ اور ان دونوں کے اتحاد میں دنیا کا امن اور نجات ہے۔ کیا تعجب ہے کہ مشرق و مغرب کا یہ سنگم موسیٰ ندی کے کنارے اسی جامعہ عثمانیہ میں ہو جس نے مشرق و مغرب کے علوم و معلومات اور تہذیب و تمدن کو ایک جا جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور جس کی تکمیل میں سب سے زیادہ حصہ یہاں کے فاضل اساتذہ اور ہونہار طلبا کا ہوگا۔

حضرات! میں آپ کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا ہمارے جلسہ کا خاص مقصد اسناد فضیلت کی تقسیم ہے اس سلسلے میں سب سے پہلے جو نام میں لیتا ہوں، وہ جامع علوم مشرقی و مغربی نواب عماد الملک بہادر کا اسم گرامی ہے جنہیں میں قلبی مسرت کے ساتھ جامعہ عثمانیہ کی طرف سے "ایل۔ایل۔ڈی" کے خطاب کی اعزازی سند دیتا ہوں اس نامور فاضل اور دیرینہ سال ماہر تعلیم سے آپ کا تعارف کرانا تحصیل حاصل ہے کہ اس بزرگ کے اوصاف اور کارناموں سے ملک کا ہر باخبر شخص آگاہ ہے۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس ریاست میں تعلیم جدید کی ساخت و پرداخت بہت کچھ صاحب موصوف ہی کے ہاتھوں ہوئی جو تیس برس تک ناظم تعلیمات سرکار عالی کے فرائض ادا کرتے رہے آج جبکہ ہم اپنے ملک میں جدید تعلیم کے فروغ و ارتقا کا مشاہدہ اس جلسہ تقسیم اسناد میں کر رہے ہیں، عین مناسب ہے کہ مذکورہ بالا ڈگری کے پیرائہ میں ہم نواب عماد الملک کی تراسویں سالگرہ منائیں۔

اب اے فارغ التحصیل نوجوان طالبعلمو! میں تمہیں علمی سند کے حاصل کرنے پر مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ سند تمہاری طویل محنت اور عرق ریزی اور ذہانت و ہوشمندی کا انعام ہے۔

برطانوی عساکر میں زمانہ قدیم سے یہ رسم عزیز جاری ہے کہ اُس فوجی جمعیت کا نشان سب سے کم عمر افسر کے تفویض کیا جاتا ہے جس میں وہ داخل ہوتا ہے۔ تاکہ وہ اس کی

عزت کو نگاہ رکھے اور اپنی شجاعت و مردانگی سے اعلیٰ مدارج پر پہنچے۔ تم بھی ایک علمی جمعیت کے سب سے کم عمر سپاہی ہو اور اس کی عزت تمہارے ہاتھ میں دیجاتی ہے۔ جس طرح اس فوجی نوجوان کی شجاعت و مردانگی پوری جمعیت کے لئے باعث فخر و ناموری ہوتی ہے، خدا کرے کہ علم و فن کی دنیا میں تمہاری سرگرمیاں بھی تمہاری جامعہ کا نام روشن اور تابناک کردیں۔

مگر یاد رکھنا کہ اپنی زندگی علم کی خالص طلب میں وقف کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے جس قدر تم زیادہ غور اور مطالعہ کروگے اسی قدر تمہیں یہ معلوم ہوگا کہ نفیس ترین جواہر افکار اسی طرح وجود میں آتے ہیں جس طرح فطرت بے شمار عناصر صرف کرکے ایک پارۂ الماس تیار کرتی ہے وہ نئے خیالات جو تم دنیا کے نامور حکما اور فضلا کی تحقیقاتوں کے مطالعہ کے بعد اپنی جانکاہی اور تحقیق سے پیدا کروگے وہ تمہاری مادر علمی یعنی جامعہ عثمانیہ کے تاج فضیلت کے سچے موتی ہوں گے اہل علم کے وارث اُن کی اولاد نہیں بلکہ رشید شاگرد ہوتے ہیں۔ اس لئے تم بھی سعادت مند طالب علموں کی طرح کامل جدوجہد اور سعی سے علمی سرمایہ جمع کرو اور جاتے وقت یہ ارث اُن جانشینوں کے لئے چھوڑتے جاؤ جو تمہارے بعد جامعہ میں آئیں گے تاکہ تمہارے کام سے انہیں فخر اور تمہارے نام سے انہیں مسرت ہو۔ تم میں سے ہر شخص جامعہ عثمانیہ کا سفیر ہے، اور تمہارا فرض ہے کہ اس پیام کو ملک کے ہر حصے میں پہنچاؤ اور نور علم سے تاریک ترین کونوں میں اُجالا کردو۔ جامعہ کی عزت تمہارے ہاتھ ہے لوگ تمہیں دیکھ کر جامعہ کے حسن و قبح کا اندازہ کریں گے۔ اس لئے تم عالی ظرفی، رواداری، خوش اطواری اور ملک کی محبت ہمیشہ پیش نظر رکھو۔ کہ یہی تمہارا اصل امتحان اور یہی تمہارے علم و اخلاق کی کسوٹی ہے۔ اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ ابنائے وطن افسوسناک جہل اور اوہام میں گرفتار ہیں۔ اور جہالت، افلاس اور تمام بداخلاقیوں کی جڑ ہے۔ اب اس تربیت گاہ سے جس نے تمہیں مادر شفقہ کی طرح پالا ہے، یہ مشعل ہدایت لیکر جاؤ

اور جب تک زندہ رہو ملک سے جہالت اور اوہام کی ظلمت کو زائل کرنے میں سعی کرتے رہو کہ اس سے بڑھ کر ملک کے حق میں کوئی کار خیر نہیں ہو سکتا۔

حاضرین:۔

اب آپ میرے ساتھ دست بدعا ہوں کہ خداوند عالم ہمارے آقائے نامدار کا سایۂ عاطفت ہمارے سروں پر تا دیر قائم رکھے۔

عملی جغرافیہ

ابتدائی

مدارس میں

بسلسلہ سابقہ العلم بابتہ ماہ خورداد ۱۳۳۴ف صفحہ ۲

نمبر ۳ تیسرا سبق مدرسہ کی گھڑی

دیہاتی مدارس میں یہ عام شکایت ہوتی ہے کہ مدرسہ میں گھڑی نہیں ہے جس سے نظم و نسق مدرسہ میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اور اگر گھڑی موجود ہو تو یہی عام طور پر درست نہیں ہوتی دیہات میں اس کو صحیح رکھنا ممکن بھی نہیں ہے۔ گھڑی صرف اس صورت میں صحیح رہ سکتی ہے کہ مدرس اس کو درست کرنا جانتا ہو۔ اس وجہ سے دیہاتی مدارس کے نظم و نسق کے اکثر نقائص اس غریب گھڑی پر عائد ہوتے ہیں۔ دیہات کے مدرسین گھڑی کا کام دھوپ گھڑی سے لے سکتے ہیں۔ یہ گھڑی منٹ اور سکنڈ نہیں بتا سکے گی۔ صرف گھنٹے بتائیگی دن کے لئے کار آمد ہوگی۔

اس آلہ کے بگڑنے کا خوف نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا انحصار تمام تر سورج پر ہوگا دھوپ گھڑی کا نقشہ ذیل میں درج ہے۔

۹
نقشہ دھوپ گھڑی

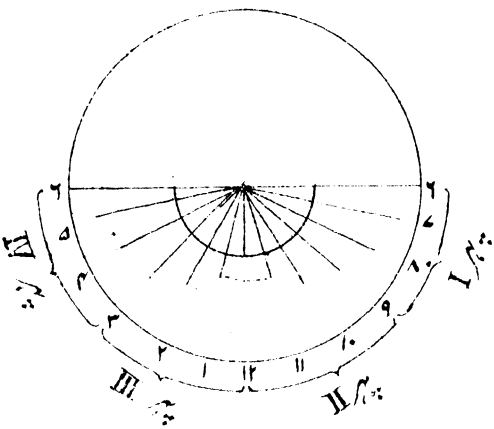

اس گھڑی کے دن کے بارہ گھنٹہ (۱۲) ہوں گے۔ جب آفتاب افق سے اوپر ہو تو مدرسہ کا کام کلاک کی مدد سے نہ کیا جائے۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ سورج کی مدد سے ہونا چاہئے۔ دنیا کے بیشتر کاروبار سورج ہی کی مدد سے چلتے ہیں۔ اگر یہ دھوپ گھڑی بگڑ بھی جائے تو اُس کو کسی گھڑی ساز کی ضرورت نہیں موجودہ زمانہ میں وقت کا اندازہ گھنٹوں کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے دن اور رات کو (۲۴) گھنٹوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مگر دیہات میں یہ طریقہ مروج نہیں ہے۔ وہاں وقت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ دیکھتے ہیں کہ سورج افق سے کس قدر بلند ہوا ہے اس لحاظ سے طلوع سے غروب تک وقت کے چار حصے کئے ہیں جن کی تقسیم ذیل میں درج ہے۔

دھائی پل	ایک منٹ
۶۰ پل یا ۲۴ منٹ	ایک گھڑی
۷½ گھڑی یا ۳ گھنٹہ	ایک پہر
۸ پہر	ایک دن

دیہاتی لوگوں سے وقت دریافت کیا جائے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ سورج ایک ہاتھ اونچا چڑھ گیا ہے۔ یا دوپہر ہو گئی ہے۔ دیہات کی بولیوں میں ایک پھر۔ دوپہر تیسرا پہر چہار پہر وغیرہ الفاظ عام ہیں۔ ولایتی گھڑی کی ایجاد نے اس قسم کے الفاظ و محاورات کو خارج کرنا شروع کر دیا ہے اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیہاتی بچوں کو اُن کے محاورات و الفاظ کے اصلی مفہوم سے آگاہ کیا جائے۔

دھوپ گھڑی کے دو حصہ ہوتے ہیں۔ اور ہر حصہ ۱۲ گھنٹہ کا ہوتا ہے جس میں صرف دن کا حصہ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور دن کے ۱۲ گھنٹے (جو گذشتہ سبق میں بتلائے گئے ہیں دیکھو دائرہ کے مرکز پر لکڑی کا سایہ جب کہ بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے) ہوں گے۔ یہ ۱۲ گھنٹے دو حصوں میں تقسیم کئے جائیں گے۔ جن کا ہر حصہ ۶ گھنٹہ کا ہوگا۔ جب سورج چھ بجے طلوع ہو۔ تو اُس وقت لکڑی کا سایہ ناپ کر نشان کر دیا جائے مشاہدہ سے معلوم ہوگا کہ اُس وقت سایہ بہت ہی بڑا ہے بعدہٗ جوں جوں سورج اونچا ہوتا جائے گا۔ سایہ چھوٹا ہوتا جائے گا۔ چنانچہ ۱۲ بجے سایہ بہت ہی چھوٹا ہو جائے گا برخلاف اس کے دوسرے چوتھائی حصہ میں ۱۲ بجے کے بعد سے شام کے چھ بجے تک سایہ بڑھتا جائے گا۔ عین شام کے چھ بجے سایہ اتنا ہی بڑا ہوگا جتنا صبح کے ۶ بجے طلوع آفتاب کے وقت تھا دیکھو تصویر دائرہ کا ہر چوتھائی حصہ اس طرح چھ حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ جس کے دو حصہ ۱۲ گھنٹے کے مساوی ہوں گے۔ اس مشاہدہ سے یہ نتیجہ ظاہر ہوگا۔ کہ جب سورج ۶ بجے طلوع ہوتا ہے۔ تو غروب بھی تقریباً چھ بجے ہی ہوتا ہے۔ اس گھڑی کے ہر تین گھنٹہ (۶ بجے سے ۹ بجے تک) ایک پہر کے مساوی ہوں گے۔ اور اسی طرح ۱۲ بجے تک دوپہر جو کہ اردو زبان کی روزمرہ میں شامل ہے پورے دن اور رات کے آٹھ پہر ہوں گے۔

یہ گھڑی مدرسہ کے لئے بہت ہی موزوں ہے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اور سورج

قائم ہے۔ اس وقت تک یہ گھڑی کام دیتی رہے گی۔ (باقی آیندہ)

منگیش راؤ

سائنس

(انسانی تمدن کی روح رواں)

ہمیں مسٹر ویدوراج نے ذیل کا مضمون انگریزی میں عنایت کیا جس کا اردو ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ مسٹر ویدوراج سررشتہ تعلیمات میں اپنے درس و تدریس سے مدتوں فیض پہونچاتے رہے ہیں۔ آپ چادرگھاٹ ہائی اسکول میں مدتوں سائنس کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔

مسٹر ویدوراج نے اپنے قابل قدر مضمون میں سائنس کی تعلیم کے متعلق جو امور بتائے ہیں ان سے ہمیں اتفاق ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ پبلک اور خود سرکار عالی مسٹر گردت سنگھ اور ان جیسے اور مفید ملک ارباب کی قدر افزائی فرمائیں گے تاکہ ملک میں سائنس کا مطالعہ ہر دلعزیز ہو اور بچپن سے ہی عملی طور پر تجربہ کا شوق ہمارے ہاں کے نونہالوں کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو جائے

شریک مدیر

دنیا کے بیشتر ممالک میں سائنس نے اپنا سکہ ایسا بٹھا دیا ہے کہ وہاں اعلیٰ سے اعلیٰ دماغ سائنس کے مطالعہ میں منہمک ہیں۔ اس قسم کا مطالعہ کوئی نئی چیز نہیں جس زمانہ میں اور جہاں کہیں کسی قوم نے ترقی کی شاہ راہ پر قدم رکھا وہاں بالواسطہ یا بلا واسطہ سائنس نے اس کو تقویت دینی شروع کردی اور رفتہ رفتہ ہم عصر اقوام میں بلند مرتبہ پر پہونچا دیا انہی اقوام کے تنزل پر نظر ڈالی جائے تو بھی ہم اسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ سائنس کی بدولت

ان قوموں نے جو حکومت اور ثروت حاصل کی تھی۔ اس نے لہو لعب اور عیش و آرام کا ان کو ایسا خوگر بنا دیا کہ ان قوموں کے افراد سائنس کے مطالعہ ہی سے کوسوں بھاگنے لگے اس غفلت کا خمیازہ ہر ایسی قوم کو بھی اٹھانا پڑا کہ دماغ نکمے اور قومی قوت نائل ہو گئی اور وہ قومیں جنہوں نے سائنس کے مطالعہ سے فطرت کی قوتوں پر زیادہ قابو حاصل کر لیا ان پر سیاسی اور معاشی حیثیت سے غالب آگئیں۔ مختصر یہ کہ قوموں کے عروج و زوال کا انحصار محض سائنس کے مطالعہ یا غیر مطالعہ پر رہا ہے۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ پروردگار عالم نے انسان کو جو بڑی نعمت عطا کی ہے وہ اس کی فطرت کا وہ زبردست رجحان ہے جو انسان کو ہر چیز کی تہ دریافت کرنے پر ابھارتا ہے۔ انسان طبعاً مجبور ہے کہ ہر چیز کے متعلق یہ سوال کرے کہ یہ کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ اس تجسس اس ہر چیز کی ٹوہ لگانے کی عملی کوشش کا ہی نام سائنس کا مطالعہ ہے اور لطف تو یہ ہے کہ اس تجسس کے حدود ہر سوال کے حل ہونے کے بعد اور پھیلتے جاتے ہیں جس طرح افق کا خیالی خط انسان کے افق کی طرف بڑھنے کے ساتھ اور پرے ہٹتا جاتا ہے جہاں تک موجودہ تجربہ رہبری کرتا ہے یہ کہنا بیجا ہوگا کہ علم کی کوئی حد ہی نہیں ہے اور اس طرح سائنس کا مطالعہ یعنے فطرت کے رازہائے سربستہ کی تلاش ایک نہ ختم ہونیوالی انسانی سرگرمی ہے۔ جس سے لگاتار محنت مسلسل مسرت کا سرچشمہ بن جاتی ہے اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ اپنی قوم اپنی نوع کے لئے بے شمار برکتیں اور بے اندازہ بہبودی کی راہیں کھل سکتی ہیں۔

یہ ایک بدقسمتی کی بات ہے کہ سائنس کے مطالعہ اور تحقیقات کو لوگ مذہب کے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے اور اس کی بنیاد ناواقفیت ہے۔ مذہب کا سب میں بڑا مقصد یہی ہے کہ اس کائنات کی پیدا کرنے والی ذات کے سمجھنے کے راستے پر انسان کو لگایا جائے یعنے اس کو خداشناس بنایا جائے۔ اس نقطہ نظر سے

دیکھیں تو ہرگز مذہب خدا کی بنائی ہوئی چیزوں کے سمجھنے میں مانع نہیں ہو سکتا۔ خدائے تعالیٰ کے مظاہر قدرت کو سمجھنا بھی خداشناسی کا ایک جزو ہے اور اس طرح سائنس مذہب کا خادم ہے کیونکہ سائنس کے مطالعہ سے حکیم مطلق کے ان عالمگیر قوانین کی معلومات حاصل ہوتی ہے جن پر کائنات کا کارخانہ اپنا کام کر رہا ہے۔

سائنس کے مطالعہ سے کائنات اور اس کے خالق کی بزرگی اور عظمت ایسی دل نشین ہوتی ہے کہ کبھی نہیں مٹتی۔ دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مطالعہ کرنے والے کے دل میں سچائی کی تلاش راسخ ہو جاتی ہے اور حق طلبی ایک ذہنی عادت بن جاتی ہے سائنس کا طالب علم عادتاً جویائے حق ہو جاتا ہے اور اظہار خیال میں اس بات کی سعی کرتا ہے کہ اس کے الفاظ واقعات اور صداقت سے دور نہ جا پڑیں رفتہ رفتہ یہ عادتیں عزت اور شرافت کے ایسے رجحانات بن جاتی ہیں کہ انسان دروغ بافی مبالغہ اور ریاکاری سے انجان طور پر پرہیز کرنے لگتا ہے۔ ان خصوصیات اور فوائد کی وجہ سے سائنس کا مطالعہ شہری اور دیہی مدارس کے لئے ایک نہایت ضروری مضمون ہے۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ سب سے اہم مضمون سائنس ہی ہے کیونکہ ملک اور ابنائے ملک کی ترقی کا مدار جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا ہے تمامتر سائنس کے صحیح مطالعہ ہی ہے۔ دیہی اور شہری مدارس میں لحاظ حالات سائنس کے نصاب کا جداگانہ ہونا ضروری ہے لیکن برقیات سائنس کا ایسا شعبہ ہے جو دونوں جگہ مشترک رہے گا کیونکہ بجلی کی برکتیں اس قدر دنیا میں انسان کی خدمت اور بہبودی میں کارآمد ثابت ہو رہی ہیں کہ سائنس کے تعلیمی نصاب میں دیہی اور شہری مدارس دونوں جگہ برقیات کا ہونا لازمی ہے۔

حکومت کا منشا بھی یہی ہے کہ بچپن سے ہی ملک کے بچے سائنس سے روشناس ہوتے جائیں اور اسی لئے ریڈروں میں سائنس کے کرشموں پر آسان آسان سبق ہوتے ہیں تاکہ بچوں کو ابتدا ہی سے دلچسپی ہو جائے لیکن اس سے بھی زیادہ کارگر طریقہ

یہ ہوگا کہ ابتدائی جماعتوں سے ہی بچوں کو سائنس کے آلات سے کام لینا آجائے محض سائنس کے بڑے بڑے کارناموں کا پڑھ لینا بھی اس میں شک نہیں کہ سائنس کا شوق پیدا کرسکتا ہے لیکن اپنے ہاتھ سے کامیابی کے ساتھ تجربہ کرنا ایسی چیز ہے کہ اس سے بچوں کے ننھے دماغوں میں سائنس کی صحیح اسپرٹ اور تحقیق کے جوش وخروش کے بیج پڑ سکتے ہیں۔

مدارس میں یورپ اور امریکہ کے آلات کا فراہم ہونا اور ان آلات کی مدد سے استادوں کا تجربہ کرانا بھی اس میں شک نہیں کہ سائنس کا شوق دلانے کے لئے اچھی چیزیں ہیں لیکن اس سے وہ بات حاصل نہیں ہوتی جو ہونی چاہئے۔ ہوتا یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کے نفیس آلات طلبار کو مرعوب کردیتے ہیں اور بچے یہ سمجھنے لگتے ہیں چونکہ ہم خود ایسے آلات بنا نہیں سکتے لہذا ہم آیندہ چلکر سائنس کا مطالعہ اپنے طور پر جاری نہیں رکھ سکتے حالانکہ سائنس کی جان یہ ہے کہ طالب علم اپنے گرد وپیش کی چیزوں سے کام لے اور طرح طرح سے اپنے مطالعہ کو اپنے گھر میں اس طرح جاری رکھ سکے کہ کھیل کا کھیل ہو اور مطالعہ کا مطالعہ۔ یورپ اور امریکہ کے آلات اور استادوں کے دکھلائے ہوئے تجربوں سے عموماً یہ ہوتا ہے کہ بچوں میں سائنس دانی کا گھمنڈ تو ضرور ہوجاتا ہے لیکن وہ اپنے دماغ اور اپنے گرد وپیش سے صحیح معنوں میں سائنٹفک مطالعہ کا کام نہیں لے سکتے۔ زبانی جمع وخرچ ضرور کرنے لگتے ہیں۔ اور عملاً کچھ کر دکھانے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔

اگر مدارس میں بچوں کو سائنس کی تعلیم اس طرح دیجائے کہ وہ آلات تجربہ کے بنانے میں خود حتی الوسع حصہ لیں اور ایسے تجربے کریں جن سے روزمرہ کی کارآمد چیزیں بنا سکیں تو اس سے طلبار صرف مدرسہ کی حد تک تجربے دیکھکر اپنے آپ کو لاچار نہیں سمجھیں گے بلکہ گھر میں بھی تجربے کرنے کی کوشش کریں گے۔ مثلاً بچوں کو صابن بنانا

سکھایا جائے اور اس طرح سکھایا جائے کہ وہ اپنے گھر کے لوگوں کے سامنے بھی صابن بنائیں اور ان کا بنایا ہوا صابن ماں یا بہن کو کپڑے دھونے میں کام دے تو بچے کے دل میں جو فخر اور شوق پیدا ہوگا وہ طرح طرح کے کار آمد تجربوں پر اس کو ابھارے گا اور گھر کے لوگ بھی اس کے اس شوق میں اس کی ہمت افزائی کریں گے۔ جو طلبا گھروں میں سائنس کا شوق نہ بھی کریں انہوں نے جو کچھ سائنس کے تجربے اپنے آپ مدرسہ میں کئے ہوں گے ان سے ان کے دلوں میں سائنس کی وقعت اور اس کا کار آمد ہونا نقش ہو جائے گا۔ غرض اس طرح کی سائنس کی تعلیم سے دیہات اور شہروں میں ایسے بچے نکلیں گے جو آئندہ سوچنے والے کسان اور کاریگر بنجائیں اور ان میں صحیح سائنٹفک اسپرٹ اس قدر اثر کر جائے گا کہ صنعت و حرفت کی قدر اور ترقی لازمی ہو جائے گی۔

سائنس کی اس طرح کی تعلیم مدارس میں پھیلانے کے لئے صرف ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو سائنس کے آلات بنا سکتے ہوں اور ان کا بنانا سکھا سکتے ہوں اور ان آلات کو بیشتر انہیں گرد و پیش کی چیزوں سے بنا سکیں جو آسانی سے طلبا کو دیہات یا شہروں میں مل سکتی ہیں۔ اس سے جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ہے لڑکے آلات سے مرعوب نہ ہوں گے اور ان کے دلوں میں یہ امنگ پیدا ہوگی کہ ہم اپنی معمولی چیزوں سے سائنس کا کام لے سکتے ہیں اس سے جو جستجو کا چسکا خود اعتمادی اور اپنے حوالی سے کام لینے کی قوت پیدا ہوگی وہ ملک کی آئندہ بہبودی کے لئے ایک انمول چیز ہوگی

ایسے آدمیوں کو دور دراز تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اس قسم کے آدمی بہت سے تو نہیں اکا دکا اب بھی یہیں مل سکتے ہیں۔ اس قسم کے ایک آدمی مسٹر گرمکھ سنگھ ہیں۔ جو بلدہ فرخندہ بنیاد میں موجود ہیں انہوں نے اپنی زندگی کو اس کام کے لئے وقف کر دیا ہے کہ سائنس کے مطالعہ کو ملک میں ہر دلعزیز

بنائیں۔ افسوس ہے کہ وہ بھی جیسا کہ عام طور پر زمانہ واقعی قابل اور دردمند لوگوں کے ساتھ سلوک کیا کرتا ہے گمنامی کے پردہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس کسی یونیورسٹی کی سند نہیں ہے اور بدقسمتی سے آج کل اصلی کام سے زیادہ سند کو دیکھا جاتا ہے۔ گردت سنگھ صاحب مدت سے خشک اور تر برقی مورچے بنا رہے ہیں اور یہ مورچے محض یورپ اور امریکہ کے مورچوں کی نقل نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں جدت سے کام لے کر ان کو ایک نئی چیز بنا لیا ہے ان میں جو اجزا کام میں لائے گئے ہیں وہ سب ملکی پیداوار ہیں۔ اور یہ مورچے بدیسی ساخت کے مورچوں سے اگر بہتر نہیں تو ان کے مساوی تو ضرور کام دیتے ہیں۔ انہوں نے جو سیل (CELL) بنائی ہے اس میں بڑی خوبی کے ساتھ ڈے نے ال (DANIEL) اور بائی کرومیٹ (BI-CHRO-MATE) رسل کے اصول کو ملا کر کام لیا ہے۔ اس سیل سے آدھ گھنٹہ تک مسلسل برقی رو حاصل ہوتی ہے۔ اس میں انہیں چیزوں سے کام لیا ہے جو ہمارے ہاں کے بازار میں مل سکتی ہیں۔ تین سیل والا مورچہ اتنی کافی برقی رو دے سکتا ہے کہ اس سے آٹھ شمعی قوت کی بتی روشن کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے ایک اور قسم کی سیل بھی تیار کی ہے جس کی بنا گروو (GROVE) اور بن سن (BUNSEN) کی سیل والے اصول ہیں یہ سیل زیادہ قوی اور اول الذکر سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔ اس کی رو سے آٹھ شمعی قوت والی دو بتیاں روشن ہوتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ گردت سنگھ صاحب کی یہ سل گروو (GROVE) کی سل سے سستی پڑتی ہے کیونکہ گروو کے ہاں پلاٹی نیم (PLA-TINUM) کے پتروں کی ضرورت پڑتی ہے جو ایک قیمتی دھات ہے۔ ان کی سل بن سن (BUNSEN) والی سل سے بھی بہتر ہے اس لئے کہ بن سن کی سیل میں سے شورے کے تیزاب کے بخارات نکلتے ہیں اور نہایت ناگوار ہوتے ہیں۔

ان مورچوں کے علاوہ گردت سنگھ صاحب قسم قسم کے خشک سیل بھی بناتے ہیں

کاربن کی سلائیاں اور اور ضروری چیزیں اپنے آپ تیار کر لیتے ہیں۔ یہ تو صرف برقیات کا ذکر تھا۔ ان چیزوں کے علاوہ گردت سنگھ صاحب صابن سیاہیاں۔ رنگ پارے کے پیالے۔ گندک کے گلاس تیشے اور چینی برتنوں کو جوڑنے کا مسالہ اور بیسیوں کارآمد چیزیں بناتے ہیں اور بنانی سکھاتے ہیں۔ حیدرآباد اور اضلاع میں گردت سنگھ صاحب نے طلبا کو ان چیزوں کو بنا کر دکھایا اور لڑکوں کو ان کا بنانا سکھایا۔ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی اور سرکار عالی کے دیگر سررشتوں کے عہدہ داروں نے ان کے کام کو دیکھا اور ان کو ہر طرح کی امداد بھی دی۔ دور دراز گاؤں میں بھی جہاں گردت سنگھ صاحب ایک آدھ دفعہ بھی ہو آئے ہیں۔ بعض لڑکے ایسے ملیں گے جو ان چیزوں میں سے چند چیزیں بنانی سیکھ گئے ہیں۔ سائنس کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے گردت سنگھ صاحب جیسے لوگوں کی سخت ضرورت ہے چونکہ میں بھی اپنی ملازمت کے دوران میں سائنس کی تعلیم دیتا رہا ہوں۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ملک کے ننھے بچوں میں سائنس کا صحیح ذوق اور اصلی شوق گردت سنگھ کے سے لوگ ہی پیدا کرا سکتے ہیں۔ "المعلم" کے قارئین سے گردت سنگھ صاحب کا میں نے اس مضمون کے ذریعہ اس لئے تعارف کرایا ہے اُن کا نام گمنامی کی تاریکی سے نکلے اور ہماری علم پرور اور فیض گستر سرکار عالی اور پبلک امداد اور دست گیری کر کے ان سے ملک کے بچوں میں سائنس اور صنعت و حرفت کا ذوق و شوق پھیلانے کا کام لیں جس سے آیندہ ملک کی معاشی اور صنعتی اور علمی ترقی کی صحیح داغ بیل پڑ جائے

ویدوراج

*

تکان

تھکا ماندہ ہونے کی حالت کے لئے خاص لفظ تکان ہے۔ بدن کا تھکنا اور طبیعت کا پست ہونا ایسی حالتیں ہیں جو قریباً ہر کام کرنے والے کو روزمرہ پیش آتی رہتی ہیں۔ ان کے اسباب و علل کی ماہرین سائنس نے گذشتہ چند سالوں میں تحقیق کی ہے اور ہم کو تکان کے متعلق بہت سی دلچسپ اور کارآمد باتیں معلوم ہوئی ہیں۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ جسم میں طاقت اور قوت غذا ہی سے پیدا ہوتی ہے اس لئے ماندگی یا تکان کے اسباب کے متعلق پہلے یہ خیال تھا کہ اس کا اصلی سبب غذا کی ضرورت ہے۔ استدلال یہ تھا کہ تھکے ہوئے آدمی کی غذا اگر حلال ہو چکتی ہے، تو اُسے اور غذا کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ گویا تکان بھوک کی ایک صورت ہوتی۔ اس نظریہ کے ثبوت میں بعض انجن کی مثال دیجاتی جبکہ فائر میں اُس میں کوئلہ جھونکنے۔ اگر یہ خیال درست ہوتا تو ہر ایک تھکا ماندہ آدمی زیادہ کھانے سے تازہ دم ہو جایا کرتا۔

لیکن ہمیں اس کا علم ہے کہ یہ قدیم خیال بالکل غلط ہے۔ ہمیشہ ہم میں غذا کی اتنی مقدار موجود رہتی ہے کہ اُس کے تمام ہونے سے بہت پہلے کسی نہ کسی اور وجہ سے آدمی تھک جایا کرتا ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تکان کی حالت میں غذا اچھی طرح سے ہضم نہیں ہو سکتی۔ اور اس لئے کسی تھکے ماندے شخص کو زیادہ خوراک دینا اُس کے لئے مضر ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس میں تو خوراک کے ہضم کرنے کی قوت ہی موجود نہیں بلکہ وہ تو اُسے بیمار کر دے گی۔ جب ہم تھکے ہوئے ہوں تو ہمیں بہت کم اور نہایت احتیاط کے ساتھ ہی کچھ کھانا چاہئے۔ تکان میں سب سے نافع چیز آرام ہے اور آرام کی بہترین صورت نیند ہے

ہم کیوں تھک جاتے ہیں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ کام کرنے یا دھوپ اور گرمی میں

زیادہ رہنے سے دماغ اور اعصاب پر ایک سمی اثر طاری ہو جاتا ہے اور ہم کو تھکن معلوم ہوتی ہے
ہمارے روزمرہ کے مشاغل جن میں ذرہ بھر محنت بھی درکار ہو اس قدر سمی مادہ پیدا کرتے
پیہم کرتے چلے جانے سے یہ زہر بآسانی دور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی کا اثر رات کو ہمیں
سُلا دیتا ہے اور اچھی نیند میں وہ مادہ بالکل زائل ہو جاتا ہے اور ہم تازہ دم ہو کر اٹھتے ہیں

اس نئے نظرے کی صحت کو ثابت کرنا بہت آسان ہے۔ ایک تھکے ہوئے جانور
مثلاً کتے کا تھوڑا سا خون لے کر یا عمل کتے کو زیادہ تکلیف پہنچائے بغیر کیا جا سکتا ہے
پھر اس خون کو ایک اور کتے میں جو تھکا ہوا نہ ہو انجکٹ کرو۔ اس دوسرے کتے میں تکان کی
سب علامتیں پیدا ہو جائیں گی گویا کہ وہ بہت مسافت طے کر کے آیا ہے اور تھک کے
چُور ہو گیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ پہلے کتے کا سمی مادہ دوسرے کتے میں سرایت کر گیا ہے
اس لئے اس کو بھی تھکن ہو گئی ہے۔

تکان کا بہترین علاج کیا ہے اس سوال کا جواب پچھلے پیراگراف پڑھنے کے بعد ناظرین
خود دے سکتے ہیں۔ تھکے ہوئے کو زیادہ کھانا نہیں کھانا چاہئے کیونکہ اس میں تحلیل غذا کی
قوت نہیں۔ البتہ پانی یا لیمنیڈ یا نارنگیوں کا استعمال کر سکتے ہیں۔ پانی جسم میں سے سمی مادے کو
دھو کر اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور اس طرح زہریلے اثر کو زائل کرنے میں ممد ہوتا ہے۔

لیکن نافع ترین چیز آرام و سکون ہے۔ اور نیند سے بہتر اور کوئی چیز آرام دہ
نہیں ہے۔ جو شخص محنت کرتے ہیں وہی اچھی نیند سوتے ہیں۔ جو آدمی دن بھر کھیت میں
محنت کرتا ہے دنیا بھر میں سب سے زیادہ میٹھی نیند سوتا ہے اُن لوگوں سے زیادہ فرحت بخش
نیند جو بہت کم یا بالکل نہیں کام کرتے اور نیند لانے کے لئے خواب آور دوائیں استعمال
کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکیم نظرت سے جو سب طبیبوں میں بہترین طبیب ہے محنت
مشقت کرنے والوں کی تھکن دور کرنے کے واسطے ایک اپنا نسخہ خاص تجویز فرمایا ہے جو
بلا مانگے کارخانہ قدرت از خود اپنے مریضوں کو بہم پہنچاتا ہے اور جو اپنی تاثیر میں لاثانی

اور تیر بہدف ہے۔ یعنی محنت کرنے سے تندرست آدمی میں جو میٹھی میٹھی تھکن پیدا ہوتی ہے اُس سے خون کے اندر ایک ایسی چیز پیدا ہو جاتی ہے جس سے نہایت سکون بخش نیند آتی ہے۔ کیا عجب ایک دن اکتشافات سائنس اُس چیز کے کیمیاوی اجزا کا پتہ بتا دیں اور پھر ہم اُس کو اپنی لبارٹیریوں (معمل کیمیا) میں تیار کر کے اپنے شفاخانوں میں استعمال کر سکیں ایسی دریافت بلاشبہ نوع انسانی کی صحت اور راحت کے واسطے ایک عجیب نعمت ہوگی

ٹراونکور میں تعلیم

ٹراونکور کی مجلس قانون سازی (لے جس لیٹو کونسل) میں اس مسئلہ پر کہ سررشتۂ تعلیمات کو ۲۳،۵۲ لاکھ روپیہ دیا جائے دن بھر بحث ہوتی رہی۔ بحث کے دوران میں یہ سوال بھی چھڑ گیا کہ نظامت تعلیمات کو برخواست کر دیا جائے اور اس کے بجائے ایک معتمدی قائم کی جائے۔ اِس مشورہ کی سرکاری اور غیر سرکاری ممبروں نے پرزور مخالفت کی اور یہ دکھایا کہ حکومت کو ایک ذمہ دار مشیر کی ضرورت ہے تاکہ نئی نئی پالیسی معرض عمل میں آسکے اور مہتمان مدارس انگریزی اور ورناکیولر اور مہتممہ مدارس نسواں کے کام کی نگرانی اور ان کے فرائض کی ترتیب و تنظیم قائم رہے۔ یہ بات بھی واضح کی گئی کہ اب تعلیم ایک مستقل فن ہو گئی ہے اور جو لوگ اس فن کے ماہر نہیں ہیں وہ تعلیمات کا کام بخوبی انجام نہیں دے سکتے علاوہ اس کے زمانہ کی موجودہ رفتار کے پیش نظر یہ تحریک ایک طرح کی رجعت قہقری ہے

صدر نشین۔ مسٹر دانس۔ نے اس بات کو واضح کیا کہ فی الوقت اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ تعلیم کی اساسی پالیسی میں تبدیلی کی جائے اور تبدیلی میں اس نئے زاویۂ نگاہ کو ملحوظ رکھا جائے جس کا اظہار ممبروں نے کیا ہے۔ اور یہ یاد رہے تعلیم کے مقصد اور پالیسی کے

مسئلہ پر دوبارہ غور کرنا لازمی ہے اور ایسی صورت میں ناظم تعلیمات جیسے تعلیمی مشیر کی ضرورت ناگزیر ہے۔

اس کے بعد ورناکیولر تعلیم کے مسئلہ پر بحث چھڑی اس بارے میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ کالج کی تعلیم میں تخفیف کی جائے اور جو روپیہ اس طرح ہاتھ آئے وہ ورناکیولر تعلیم پر صرف ہو اس تجویز کی بڑی زور سے مخالفت ہوئی کئی ممبروں نے تقریریں کیں جن کا منشا یہ تھا کہ تعلیم کے قومی بنانے کا یہ مفہوم نہ ہونا چاہئے کہ کالجی تعلیم کو صدمہ پہونچے۔ کالجی تعلیم کی توسیع کی اصلی وجہ یہ تھی کہ ٹری وانڈرم (پایۂ تخت ٹراونکور) کے لوگوں نے سونچ سمجھکر اس بارے میں بڑی سرگرمی سے کوشش کی تب یہ بات حاصل ہوئی ہے سائنس کالج میں اس وقت ۸۵۰ طلبا ہیں اور جنوبی ہند کے کسی کالج میں اتنے سائنس کے طلبا نہیں ملتے چونکہ پبلک کی یہ خواہش تھی کہ اس کالج کو توسیع دی جائے حکومت نے اس کام کے لئے رقمی گنجایش نکالی اور اسٹاف سائنس کے آلات اور کتب خانہ پر بیش قرار رقومات صرف کی گئیں۔ ان اخراجات میں تخفیف مناسب نہیں اس لئے کہ سائنس کے اور چند شعبوں کی تعلیم بھی شروع کردی گئی ہے۔ صدر نشین نے پرجوش الفاظ میں اپیل کی اور سررشتہ تعلیمات کی مطلوبہ رقم پوری کی پوری منظور کی گئی۔

---

*

تبصرہ

کلیات اقبال

مولوی محمد عبدالرزاق صاحب ایچ۔ سی۔ یس نے کئی برس پہلے اقبال کے کلام کو اکٹھا کرنا شروع کیا اور کئی اسباب ایسے ہوئے جن میں سب سے بڑا سبب خود ان کی طولانی علالت تھی کہ یہ مجموعہ اتنی مدت کے بعد طبع اور شائع ہو سکا۔

مولوی محمد عبدالرزاق صاحب حیدرآباد کے سوی لی اَن احباب میں پہلے فرد ہیں جنہوں نے اپنی دماغی اور ادبی نشو و نما کا پھل پبلک کے سامنے پیش کیا ہے۔ برٹش انڈیا کی سول سروس ایک عالمانہ زمرہ سمجھا جاتا ہے اور اس زمرہ کے اکثر ارباب نے اپنی ادبی اور علمی سرگرمیوں سے اپنے طبقہ کا لوہا منوا دیا ہے۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ مولوی عبدالرزاق صاحب کی پیش قدمی کے بعد حیدرآباد کے سوی لی اَن زمرہ کے ارباب ادبی اور علمی میدان میں اپنے کارنامے پیش کریں اور اس طرح اپنے طبقہ کی قابلیت اور ذوق علمی کا سکہ بٹھا دیں۔ عہدہ داران سول یا فوج دونوں کیلئے دماغی ارتقا ناگذیر ہے۔ جو اصحاب عہدہ علمی انہماک اور قلبی سرگرمی کو اپنا شعار بنالیتے ہیں وہ اپنی دماغی نشو و نما کی بدولت علاوہ اس کے کہ ملک و ملت کو ادبی یا علمی فائدہ پہونچائیں خود اپنے فرائض منصبی کو بالغ نظری وسعت دل اور ہر پہلو پر احاطہ کی ہوئی سوجھ کیساتھ انجام دے سکتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب اس قسم کے کلچر میں رچے ہوئے دماغ ملک کے عہدوں پر فائز اور کارگزار رہیں گے تو نظم و نسق کی عملداری حکومت کی ہر دلعزیزی اور رعایا کی بہبودی میں کس قدر ناقابل اندازہ اضافہ ہو سکتا ہے ہم خوش ہیں

مولوی عبدالرزاق صاحب نے اس خصوص میں تعریف اور تقلید کے قابل ایک مثال پیش کی ہے۔

اقبال ایک اصلی شاعر ہیں اور ان کے کلام کو اس وقت جمع کرنے اور مجموعہ کی صورت میں شائع کرنے کا خیال کرنا جبکہ اقبال کی مقبول شاعری کا کوئی ذخیرہ حلیہ طباعت سے نہ آراستہ تھا مرتب کے عمدہ ادبی ذوق کا پتہ دیتا ہے صرف یہی نہیں کہ کلام کو اکٹھا کر دیا جائے بلکہ مولوی عبدالرزاق صاحب نے اس کی بھی ضرورت محسوس کی اور صحیح محسوس کی کہ اقبال جیسے زمانہ شناس شاعر کے شور انگیز اور انقلاب زا پیام کی تعبیر بھی اس طرح کی جائے۔ کہ عامۃ الناس ان کے کلام کو سوچ سمجھکر پڑھ سکیں اس غرض سے قابل مرتب نے ایک طولانی مقدمہ تحریر کیا۔ اب تک اقبال کی زندگی کے حالات لوگوں کو بہت کم معلوم ہیں۔ مولوی عبدالرزاق صاحب نے ان حالات کو وضاحت اور عمدہ تحریر میں پیش کیا ہے۔

دیباچہ کے اس حصہ کے دیکھنے سے جو اقبال کے کلام کے متعلق ہے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مرتب نے کس قدر غور اور محنت سے اپنے محبوب شاعر کا مطالعہ کیا ہے۔ اقبال کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا میں ترقی اور برتری کا راز قوت ہے مسلمان اس لئے گر گئے کہ ان کے قلوب سے قوت جاتی رہی یہ قوت پھر حاصل کرنی ضروری ہے لیکن کس طرح حاصل کی جائے موجودہ مسلمان پھر اس خیرالقرون کے مسلمانوں کی سی آگ دلوں میں پیدا کریں جہاں سے مسلمانوں کی قوت اور ترقی کی ابتدا ہوئی اور جو اصلی قوت کا ابدی سرچشمہ ہے۔ اس غرض سے مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑے گا تاکہ بھٹک کر جو بے راہ ہو گئے ہیں پھر اپنے اصلی مرکز پر آکر صراط مستقیم کو آسانی سے پالیں اور ان معنوں میں یہ پیچھے ہٹنا اسی طرح کا ہوگا جس طرح سامنے کسی رکاوٹ کے حائل ہو جانے پر اس پر پورے زور سے پل پڑنے کے لئے پیچھے ہٹنا پڑتا ہے تاکہ زور زیادہ کارگر ہو۔

یہ ہے ہمارے ناچیز خیال میں اقبال کی شاعری کی جان اور اس جان ڈالنے والے مطمح نظر نے ان کی شاعری کو ایک جلانے اور جگانے والی زبردست قوت بنا دیا ہے۔ ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ مولوی عبدالرزاق صاحب نے اقبال کی شاعری کی اس زبردست روح کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔ چونکہ یہ مولوی صاحب کی پہلی کوشش ہے اور اقبال کی شاعری کو مولوی صاحب عشق کی حد تک چاہتے ہیں لہذا سارے دیباچہ میں جہاں جہاں موقع آیا ہے تعریف اور تحسین کے جملے بے ساختہ نکل پڑے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ اس غرض سے مولوی عبدالرزاق صاحب نے نظم سے کام لیا ہے ان اشعار میں اقبال کی تعریف کے علاوہ سب میں بڑی اور نازک بات یہ ہے کہ آپ نے اقبال کے رنگ کی تتبع کی ہے۔

تیرے ناموں نے کیا پیدا عجب جوش و خروش
قلزم اسلام کا ہر قطرہ ہے طوفان بدوش
نطق میں تیرے پیام عزت اسلام ہے
تیری حکمت سے بقا سامان ہمارا نام ہے
جسم حکمت میں مثال دیدۂ بینا ہے تو
یادگار ابن رشد و بو علی سینا ہے تو

یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ تعریف اور توصیف محض اخلاص مندی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اقبال اور ان کی شاعری اس کی مستحق بھی ہے تو بھی ایک قسم کی مشرقی تقریظ کا رنگ روپ جھلکنے لگا ہے۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے اور خود مولوی عبدالرزاق صاحب کا منشا بھی ہے کہ اقبال کی شاعری اس بات کی مستحق ہے کہ اس کا عمیق مطالعہ کیا جائے اور اس کی تعلیم کو عامۃ الناس کے ذہن نشین کیا جائے۔ اس تفہیم سے عام مسلمانوں میں اقبال کی شاعری مسیحائی کرے گی اور اس مسیحائی سے جو بہتر علمی زندگی پیدا ہوگی

وہی اقبال کی شاعری کا بہترین پھل ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ یہ خفیف سی بات آیندہ اشاعت میں ذرا لب و لہجہ کو قابو میں کر لینے سے حاصل ہو جائے گی۔

کلیات اقبال ان تمام باتوں کے مدنظر جو اوپر بیان کی گئی ہیں ایک قابل قدر انمول کتاب ہے۔ ہمارے اساتذہ اس سے بہتر جوشش اور سرگرمی کا منبع اور کسی موجودہ زمانہ کی اردو کتاب میں نہ پا سکیں گے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ہمارے اساتذہ کا مطمح نظر بلند ہوگا اور اس کی زبردست باتیں ان کو آنے والی پود کی بہترین تعلیم پر ابھاریں گی جس سے ان کے زیر تعلیم ملک کے نونہال بڑے ہو کر اس آنے والی دنیا کی تعمیر میں حصہ لیں جس کو شاعر کی پیش بیں نظر نے دیکھ لیا ہے۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

یہ کتاب ذیل کے پتہ پر دستیاب ہو سکتی ہے۔

کاغذ ولایتی چکنا لکھائی چھپائی نہایت نفیس۔ قیمت عوام سے غیر مجلد (صہ)

مجلد (لے)

۱۔ محمد نجم الدین احاطہ سید جنگ مرحوم ترپ بازار۔ حیدرآباد دکن

۲۔ دکن اسٹورس، ترپ بازار حیدرآباد دکن

شریک مدیر

*

شذرات

مدراس یونیورسٹی کے لکچر ڈاکٹر جی۔ پی۔ ایچ دوگل پروفیسر سنسکرت نے سنٹ ہوس میں قدیم زمانہ بدھ کے فن پر سب سے پہلے لکچر دیا۔ لکچر کے ساتھ تبدیل کی تصویریں بھی کثرت سے دکھائی گئی تھیں جو زمانہ بدھ کے فن کے نمونوں سے متعلق تھیں۔

ڈاکٹر دوگل لاہور یونیورسٹی میں سنسکرت پروفیسر بننے سے پہلے ہندوستان کے صیغہ آثار قدیمہ میں بارہ سال تک ملازم رہ چکے اور ہندوستان کے آثار قدیمہ کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔

جبری ابتدائی تعلیم حکومت کی اجازت آگرہ، علی گڑھ۔ جھانسی اور متھرا کے بلدیہ جات کے لئے صوبہ جات متحدہ کی حکومت نے سال جاریہ میں لڑکوں کی جبری تعلیم کی ترویج کی منظوری دیدی ہے اس طرح ایسے بلدیہ جات کی کل تعداد اب ۲۳ ہوگئی ہے

اندھوں اور بہروں کی تعلیم گاہ اندھوں اور بہروں کی میسور سنٹرل انسٹی ٹیوٹ کے تقسیم انعامات کا جلسہ مسٹر کے آر سرنیواس آئنگر سینیر ممبر اسٹیٹ کونسل منعقد ہوا۔ سالانہ رپورٹ سے واضح ہوتا ہے کہ گزشتہ ۲۴ سال کے دوران میں اس انسٹی ٹیوٹ نے نہایت شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ اس وقت ۴۶ اندھے اور ۲۹ بہرے انسٹی ٹیوٹ میں زیر تعلیم ہیں۔ مسٹر ڈھل راؤ نے ۳۰ ہزار۔ مسٹر اے ڈبلیو پرک لی نے ۲ ہزار اور مسٹر سرنیواس راؤ نے ایک ہزار روپیہ انسٹی ٹیوٹ کو چندہ عطا فرمایا جملہ ۳۳ ہزار ۴ سو کی رقم تعمیر عمارت کی غرض سے جمع کی گئی۔

راجہ رطھونندن پرشاد صاحب آیندہ اجلاس اسمبلی میں ایک قرارداد بدیں غرض پیش کرنے والے ہیں کہ تمام ہندوستان میں ابتدائی تعلیم لازمی کردی جائے۔

کلکتہ یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ نے مدارس میں ورزش اور یونیورسٹی کے طلباء کے لئے فوجی تعلیم لازمی کردی ہے۔

مدرسہ تحتانیہ درجہ اوّل قصبہ ملکھیڑ تعلقہ سیڑم ضلع گلبرگہ شریف کا تیسرا جلسہ تعلیمی بتواریخ ۷ و ۸ مہر سنہ ۱۳۳۴ف بصدارت جناب مولوی سید یٰسین صاحب بخشی انسپکٹر انجمن اسلامیہ حلقہ سیڑم منعقد ہوا تھا جس میں شرکاء کی تعداد تخمیناً ہر دو دن دو سو سے زیادہ تھی۔ علاوہ مقامی باشندوں کے اطراف کے مواضعات کے علم دوست اشخاص بھی شریک جلسہ تھے۔ جلسہ کا آغاز قرارت اور حمد سے کیا گیا۔ مولوی محمد رکن الدین صاحب صدر مدرس مدرسہ نے ابتداء قیام مدرسہ سے تا حال یعنے اپنے زمانہ کی کارگزاری سے متعلق مدرسہ کی رفتار پر کافی روشنی ڈالی۔ طلباء مدرسین صاحبان و دیگر ہمدردان قوم نے علمی فوائد کو بخوبی واضح کیا۔ آخر میں صدر صاحب نے مقامی اعتبار کے لحاظ سے پرزور اور موثر الفاظ میں اخلاقی اور قومی ابتری پر تقریر کی اور مدلل طور پر بتایا کہ ان کا استیصال صرف علم ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس جلسہ کے تین خصوصیات لایق اظہار ہیں۔

(۱) تمام طلباء مدرسہ کو جناب شیو لنگپا صاحب دیسکھہ ملکھیڑ نے شیرینی تقسیم کرائی اور حمد پڑھنے والے بچوں کو اسی وقت پانچ روپیہ انعام دیا۔

(۲) مڈل پاس بچوں میں سے ایک نے حق استادی میں ایک موزوں لباس اور سونے کا کڑا صدر مدرس صاحب کو نذر کیا اور صدر صاحب نے جملہ مدرسین و معزز صاحبان کو پھول پہنائے۔

(۳) کتب خانہ کے قیام کے لیے (۵۰) کا چندہ ہوا جس میں صدر صاحب جلسہ و صدر مدرس صاحب
و انور علی بیگ طالب علم مڈل نے بیس بیس روپیہ چندہ دیا

مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ نام پلی کا پہلا سالانہ جلسہ

بتاریخ ۲۲ ر مہر ۱۳۳۳ف یوم جمعہ مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ نام پلی میں مدرسہ مذکور کی پہلی سالگرہ کا جلسہ ترتیب دیا گیا تھا۔ مدرسہ کی حدود میں مختلف رنگ کی جھنڈیاں لگائی گئی تھیں اور مدرسہ کا میدان اسپورٹس کے آلات و لوازمات سے آراستہ تھا۔ میدان کے محاذی برآمدہ اور زیریں حصہ میں مہمانوں کا کافی مجمع تھا ان میں زیادہ تر طلبا کے سرپرست تھے ۲ ½ بجے سے ۴ ½ بجے تک مختلف دلچسپ کھیلوں میں طلبہ کے مقابلے ہوتے رہے اور ۴ ½ بجے تحریک و تائید صدارت کے بعد جناب مولوی سید علی اکبر صاحب (بی اے (کنٹب) ایف آر۔ ای۔ یس صدر مہتمم تعلیمات بلدہ نے کرسی صدارت کو زینت بخشی۔ جلسہ کا آغاز قرأت سے کیا گیا پھر ۵-۵ طالبعلموں نے انگریزی نظم اور ایک طالب علم نے اردو نظم جو اسی تقریب سے متعلق تھی حاضرین کے گوش گزار کی بعد صدر محترم نے طلبا کو انعامات تقسیم فرمائے اس کے بعد مسٹر رامانوجاچاری بی۔ اے۔ بی۔ ٹی صدر مدرس مدرسہ ہذا نے سالانہ رپورٹ پڑھی اور صدر جلسہ نے ایک مبسوط اختتامی تقریر کی مدرسہ کی جانب سے حاضرین کا شکریہ ادا کیا گیا اور جلسہ دعا پر ختم ہوا پھول پان سے حاضرین کی تواضع کی گئی۔

ناظرین المعلم کی آگاہی کی غرض سے سالانہ رپورٹ کی چند باتیں اور صدر جلسہ کی تقریر کا ضروری اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے۔

افتتاح مدرسہ فوقانیہ تاریخ ۲۶ ر فروردی ۱۳۳۱ف کو جبکہ مسٹر چاری نے مشقی تعلیم المعلمین کا جائزہ حاصل کیا عمارت اور اکثر لوازمات مدرسہ ناکافی و ناموزوں تھے مدرسہ مشقی ۲۱ ر آذر ۱۳۳۲ف کو مدرسہ تعلیم المعلمین بلدہ سے علیحدہ کیا گیا اور نام پلی میں منتقل کیا گیا اور مدرسہ سلطانیہ

نام پڑی سے موسوم ہوا چونکہ چار درگھاٹ اور اس کے نواح میں کوئی مدرسہ عثمانیہ فوقانیہ نہ تھا اس لئے اس مدرسہ کو فوقانیہ بنانے کی تحریک پیش کی گئی جس کو منجانب سرکار ۱۵ ار شہریور ۱۳۳۳ف کو عملی جامہ پہنایا گیا اور اس مدرسہ کو فوقانیہ عثمانیہ کہلانے کا شرف حاصل ہوا۔ جناب مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ اور عالیجناب نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات کی توجہات سے بتدریج اس مدرسہ کی اصلاح ہوتی رہی۔

(۱) اسٹاف ۱۳۳۱ف..... بی اے۔ بی۔ ٹی (۱) بی۔ اے (۱) ایف۔ اے (۱) میٹرک ٹرینڈ (۲) میٹرک (۴) مڈل ٹرینڈ (۳) مڈل (۴) غیر سند دارندہ (۲) ڈرائنگ ماسٹر (۱) ڈرل ماسٹر (۱)

۱۳۳۴ و ۱۳۳۵ف..... بی اے۔ بی۔ ٹی (۲) بی۔ اے (۲) میٹرک ٹرینڈ (۴) میٹرک (۱) مڈل ٹرینڈ (۴) مڈل (۴) غیر سند دارندہ (۲) ڈرل ماسٹر (۱) ڈرائنگ ماسٹر (۱) اہلکار دفتر (۱)۔

---

(۲) موازنہ | باستثنائے منظوریات بابتہ وظائف فرنیچر آلات سائنس ۱۳۳۱ف کا موازنہ گیارہ ہزار سات سو (۱۱۷۰۰) ستہتر تھا اور اب حسب اسکیم منظورہ حال ۱۳۳۵ف کا موازنہ بائیس ہزار ایکسو (۲۲۱۰۰) ہوگیا ہے۔

(۳) تعداد طلبا | تعداد طلبا گزشتہ سال (۳۲۲) تھی اور اب (۴۴۳) ہے مزید اضافہ کی توقع ہے۔

(۴) نتایج | سال گزشتہ مڈل کا ۴۲٫۷ اور میٹرک کا ۱۶٫۶ فیصد نتیجہ تھا

اس سال مڈل کا	۶۸	فیصد نتیجہ رہا
میٹرک کا	۱۶٫۶ کل گروپ میں	״
	۲۳٫۳ دو ״ ״	״
	(۱۰۰) ایک ״ ״	״

بوجہ شیوع مرض طاعون وغیر متوقع تعطیل ماہ صیام تعلیم میں غیر معمولی ہرج واقع ہوا اس لئے نتائج ایسے بہتر نہیں رہے جیسی کہ توقع تھی

(۵) دارالمطالعہ | مدرسہ میں طلبا اور مدرسین کے لئے کوئی دارالمطالعہ نہ تھا مگر اب قائم کر دیا گیا ہے سرکار کی طرف سے صرف رہبر دکن۔ القریش۔ اردو۔ وصول ہوتے ہیں اساتذہ اور طلبا کے چندہ سے مختلف زبانوں کے (۳) روزانہ (۵) ہفتہ واری (۹) ماہانہ جملہ (۱۷) اخبار و رسالہ جات منگوائے جارہے ہیں۔

(۶) کتبخانہ | ۱۳۳۱ف میں کتابوں کی تعداد (۱۱۲) تھی اور اب (۵۲۹) ہے لیکن یہ تعداد بھی مدرسہ فوقانیہ کے کتبخانہ کے لئے ناکافی ہے ۱۳۳۱ف سے ابتک کتبخانہ اور دارالمطالعہ پر (۵۰) روپیہ صرف ہو چکے ہیں جس میں سرکاری امداد صرف (۳۴۰) کی ہے

(۷) فرنیچر | مدرسہ میں فرنیچر ناکافی فرنیچر مہیا کئے جانے کے لئے صدر سے کارروائی جاری ہے امید کہ جلد منظوری صادر ہوگی۔

(۸) انجمن اساتذہ | مدرسہ کے ٹرینڈ اور اَن ٹرینڈ اساتذہ کی توسیع معلومات کے لئے مدرسہ میں انجمن اساتذہ کا قیام عمل میں آیا تھا جس کے مقاصد کے تحت مختلف اوقات مختلف مباحث پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا مگر جب سے صدر انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کا انتخاب ہوا ہے مقدم الذکر انجمن کا وجود غیر ضروری سمجھا گیا۔

(۹) گیمس | مدرسہ کا کوئی خاص بازیگاہ نہیں ہے بلکہ طلبا مدرسہ کے میدان کے علاوہ پولیس ٹریننگ سکول۔ وای۔ ایم سی۔ اے کے میدانوں میں کھیلتے ہیں ایک قریبی بازیگاہ کی سخت ضرورت ہے جس کے حصول کے لئے کوشش جاری ہے۔

گیمس اور اسپورٹس میں ایکہزار تین سو کی رقم صرف کی گئی ہے اس میں سرکاری امداد صرف تین سو ہے۔

(۱۰) دارالتجارب | سائنس کے تجربہ خانہ کے لئے صرف ایکہزار کے آلات خریدے گئے ہیں

کم از کم مزید دو ہزار کے آلات خریدنے کی ضرورت ہے۔

(۱۱) انتظام نماز | نماز کے لئے کوئی سامان نہ تھا اساتذہ نے چندہ سے موقتی ضرورت پوری کرلی ہے مگر اس خصوص میں صدر سے کارروائی جاری ہے۔

(۱۲) السنہ ملکی کی تعلیم | کنڑی اور مرہٹی کی تعلیم کا انتظام نہ تھا مگر اب جناب صدر مہتمم صاحب کی توجہ سے ہو گیا ہے۔

(۱۳) دستکاری | مدرسہ میں دستکاری کے بعض طریقوں کو رواج دیا گیا ہے طبقہ ستحانیہ کے طلبار۔ کاغذ موڑنے۔ کاغذ کترنے۔ مقوی اور مٹی کے نمونے بنانے کا کام کرتے ہیں اور ان طلبار کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے جنہیں کسی مخصوص فن سے دلچسپی ہے جیسے نجاری وغیرہ۔

(۱۴) نمائش گاہ | مدرسہ میں ایک نمائش گاہ قائم کی گئی ہے جس میں طلبار اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے علاوہ سکہ جات۔ آثار قدیمہ (حیوانی نباتی۔ جاداتی) جمع کر رہے ہیں۔

(۱۵) انجمن مباحثہ | طلبار کی ترقی تحریر و تقریر کے لئے انجمن مباحثہ کا افتتاح ہوا ہے جو اپنا کام خوبی سے انجام دے رہی ہے۔

(۱۶) غریب فنڈ | چندہ سے ایک فنڈ قائم ہے جس سے غریب طلبار کی مدد کی جاتی ہے

(۱۷) انجمن اتحادی | مدرسین کو کفایت شعار بنانے کی غرض سے انجمن اتحادی قائم کی گئی ہے اس کی ایک شاخ شاخ تجارت بھی ہے۔

صدر نشین نے فرمایا | چونکہ رود موسیٰ کے شمال میں کوئی مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ نہ تھا اس لئے مدرسہ وسطانیہ نام پلی کو فوقانیہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ اور بتدریج اس کے چند ضروریات کی تکمیل کی جاچکی ہے مگر پھر بھی اکثر ضروریات کی تکمیل ہونی باقی ہے ازاں جملہ ایک عمارت کا نقص ہے کیونکہ مدرسہ کی عمارات ناموزوں و ناکافی ہے کوشش کی جائے گی کہ منجانب سرکار

اس مدرسہ کے لئے ایک عمارت تیار ہو۔ دوسری کمی بازیگاہ کی ہے اس کے دور کرنے کے لئے بھی میں اور مسٹر چاری صدر مدرس مدرسہ کوشاں ہیں۔ مدرسہ میں ایک باغیچہ کی بھی کمی ہے کیونکہ اس کے ہونے سے نہ صرف مدرسہ کو رونق ہوتی ہے بلکہ دل و دماغ کو فرحت ہوتی ہے اور مطالعہ قدرت میں مدد ملتی ہے۔

اس مدرسہ کے لئے واقعی مزید آلات سائنس۔ فرنیچر۔ علمی کتابوں کی ضرورت ہے جن کی طرف صدر مدرس صاحب نے اپنی رپورٹ میں اشارہ کیا ہے انشاء اللہ آئندہ سال تک اِن چیزوں کی بھی تکمیل کر دیجائے گی۔

مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ اس مدرسہ نے اپنی آپ بہت کچھ مدد کی ہے جس سے کھیلوں اور دارالمطالعہ کے لوازمات میں زیادتی ہوئی ہے۔

لڑکوں کے کھیل دیکھکر بھی خوشی ہوئی کہ اس مدرسہ نے ورزش جسمانی میں خاصی ترقی کی ہے اس کے بعد آپ نے طالب علموں کو اور پھر مدرسین کو مخاطب کرکے چند بیش بہا باتیں ان کے غور کے لئے پیش کیں۔ یہ باتیں بیشتر مدرسین کے فرائض سے متعلق تھیں لیکن سادے الفاظ میں تجربہ اور غور و فکر کا نچوڑ تھیں۔ صدر صاحب نے بعد میں طلبا، کے والدین اور سرپرستوں سے خطاب کیا اور یہ دکھلایا کہ مدارس کی آیندہ بہبودی اور ترقی مدرسین کے شوق اور محنت کے لئے کس قدر ضروری ہے کہ وہ لوگ بھی مدرسین کا ساتھ دیں اور اتحاد اور اتفاق ہمدردی اور ملنساری سے ان کی ہمت افزائی کریں۔

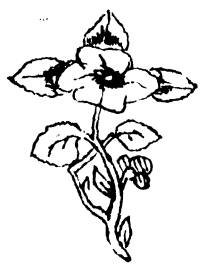

*

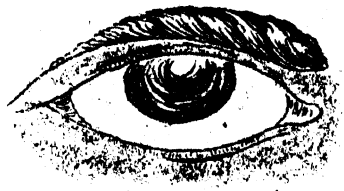

آنکھ کی تندرستی

چند ضروری باتیں

بہت چمکیلی چیزوں کو زیادہ دیر تک گھورنا نہیں چاہیئے

روشنی ٹھیک ٹھیک ہونی چاہیئے یعنے نہ تو ضرورت سے زیادہ تیز ہو اور نہ بہت دھندلی دھندلی روشنی پیچھے سے اس طرح آنی چاہیئے کہ روشنی کتاب پڑے آنکھ پر نہ پڑے مثلاً کھڑکی کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھا جائے تو یہ بات حاصل ہوگی۔

باریک خط یا موٹے موٹے حروف والے چھاپے کی کتاب یا اخبار سے بچنا چاہیئے آپ کی صورت میں حروف کی اونچان (¼۱) اور موٹائی (½۱) ملی میٹر سے کم نہ ہونی چاہیئے۔

سامنے سے دھوپ آنکھوں پر پڑتی ہو یا جھٹپٹے کا وقت ہو تو پڑھنا نہیں چاہیئے۔

بچوں کی مدرسہ کی پڑھائی تندرستی کا لحاظ کرتے پانچ یا چھ برس کے سن سے قبل شروع نہ ہونی چاہیئے

کتب بینی کے دوران میں آنکھوں کو کتاب پر سے ہٹا کر اُن کو آرام دینا ضروری ہے جس وقت صفحہ الٹنا ہو تو اس وقت اس طرح آرام بھی دے لیا جائے۔

ریل یا گاڑی میں یا پلنگ پر لیٹ کر کبھی نہ پڑھنا چاہیئے۔

لکھتے اور پڑھنے کے وقت سر اور جسم کو سیدھا رکھنا چاہیئے میز اور کرسی ایسی ہونی چاہیئے کہ بیٹھنے میں آرام ملے اور بچوں کو کتاب پر جھکنا نہ پڑے بچوں کو یہ عادت ڈالنی چاہیئے کہ

وہ لکھنے یا پڑھنے میں جھکیں نہیں۔ میز اتنی اونچی ہونی چاہیئے کہ آنکھیں اور اس میں بارہ سے اٹھارہ انچ کا فاصلہ رہے۔ میز کا تختہ اتنا ڈھلواں ہو کہ ۳۰ درجہ کا زاویہ بنائے تاکہ جھکنا نہ پڑے گردن کی کبھی کمر کی ٹیڑھ جو مدرسہ کے بچوں میں پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ نشست کے صحیح طریقہ سے استاد اور شاگرد دونوں غفلت برتتے ہیں۔

بڑی دانشمندی کی بات یہ ہے کہ **نظرت کی انتباہ پر کان دھرنا چاہیئے**

فطرت حسب ذیل طریقوں سے تنبیہ کرتی ہے۔

آنکھوں میں پانی کا آنا۔ آنکھوں کا جلنا۔ روشنی کا نہ سہنا۔ کھجلی۔ سرخی۔ پلکوں کا جھپکنا۔ ایک آنکھ کا دوسری سے چھوٹا ہونا۔ پھڑکنا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور جھریاں ترچھاپن۔ پیشانی پر شکنیں۔ تلانا۔ اعصابی بے چینی۔ آنکھیں مچ مچانا۔ دوران سر۔ دردسر کتابوں سے نفرت۔ پڑھنے میں اونگھنا۔ سرع۔ توجہ کا انتشار۔ بدمزاجی بھول پتی۔ تکان پڑھنے کی چیزوں کو ۱۴ انچ سے دور یا پرے رکھنا۔ رات کو مہین خط یا ٹائپ کے پڑھنے میں تکلف آنکھوں میں ترمرے یا کالے دھبوں کا پھرنا

مشیر

ڈاکٹر کے۔ پی۔ پوپٹ

ایل آر سی پی ایس ایل ایم (ایڈنبرا)

جراح چشم لندن

ہارڈی اینڈ کمپنی

ماہرین نظریات و عینک ساز۔ لندن

جیمس اسٹریٹ۔ سکندرآباد (دکن)

رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور شمالی ہند کا نامی گرامی تعلیمی رسالہ ہیں سال سے پوری شان و شوکت کے ساتھ شہر لاہور سے شائع ہو رہا ہے اس کی خوبیاں اس کے مطالعہ سے ظاہر ہو سکتی ہیں

قیمت سالانہ تین روپیہ سکہ کلدار مجلد ماہانہ (۱۲۰) صفحہ ملنے کا پتہ

ماسٹر جگت سنگھ پروپرائٹر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

*

رجسٹرڈ شدہ بسرکار عالی نشان ۷۸۶ مجردیہ انگریزی یم نشان ۱۰۶۵

جلد دوم نمبر ۵

المعلم

اع

ماہ دے سنہ ۱۳۳۵ ف

مدیر ..... محمد سجاد مرزا یم۔ اے (کنٹب) .....

شریک مدیر ..... محمد عظمت اللہ خاں۔ بی۔ اے .....

اعظم اسٹیم پریس چاینا

حیدرآباد دکن

قواعد

(۱) یہ محض تعلیمی رسالہ ہے جس میں تعلیم کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے سیاسی یا مذہبی مضامین شریک نہ کئے جائیں گے۔

(۲) یہ رسالہ ہر ماہ فصلی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۳) پرچہ وصول نہ ہو تو ہر ماہ فصلی کی ۲۵ تاریخ تک خریدار صاحبان بحوالہ نمبر خریداری مطلع فرمائیں

(۴) جو مضامین ناقابل طبع متصور ہوں گے ان کی واپسی خرچہ ڈاک کی روانگی پر منحصر ہوگی۔

(۵) اس رسالہ کی قیمت سالانہ (بیسے) مع محصول ڈاک ہے جو پیشگی لی جائے گی۔

(۶) نمونہ کا پرچہ پانچ آنہ کے ٹکٹ وصول ہونے پر ارسال کیا جائے گا۔

(۷) جو اہل طلب مور کے لئے جوابی کارڈ وصول ہونا چاہئے ورنہ ادائی جواب میں مجبوری رہے گی

(۸) اجرت طبع اشتہارات درج ذیل ہے رقم وصول ہونے پر اشتہارات طبع کئے جائیں گے۔

تعداد مدت	صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
ایک بار	۱	۰ ۸ ر	۰ ۴ ر
سہ ماہ	۲ ۱	۱	۰ ۸ ر
ششماہ	۱ ۸	۲ ۱ ۰ ر	۱ ۲
سالانہ	۲ ۸	۱ ۸	۲ ۱

(۹) جملہ مراسلت و ترسیل رقوم منی آرڈر وغیرہ ہو سو مدیر شریک مدیر پتہ ذیل پر ہونی چاہئے

محمد عظمت اللہ خاں بی اے شریک مدیر

دفتر رسالہ المعلم بلگرامی ہوس سانچہ توپ

حیدرآباد دکن

*

*

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مندرجات

المعلم

(۱) خطبہ کانووکیشن (جلسۂ اسناد) ..... شریک مدیر (۱ تا ۱۸)

(۲) وراثت وماحول ..... از مولوی محمد عبدالرشید صاحب صدیقی مدرس مدرسہ جاگیرداران گلزار علی (۱۸ تا ۲۵)

(۳) ہمارا طرز عمل ..... از مولوی محمد اعظم خاں صاحب متعلم جماعت انٹرمیڈیٹ عثمانیہ کالج بلدہ (۲۵ تا ۲۷)

(۴) تبصرے ..... شریک مدیر (۲۷ تا ۲۹)

(۵) شذرات (۲۹ تا ۳۲)

جلد ۲	بابتہ ماہ دے سنہ ۱۳۳۵ ف	نمبر ۵

خطبہ کانووکیشن (جلسۂ اسناد)

جو

(بتاریخ ۲۰ اگست سنہ ۱۹۲۵ء جامعہ مدراس کے جلسۂ اسناد میں آنریبل سر سرے کوٹس ٹراٹ ٹرایم اے بار ایٹ لا میر مجلس عدالت العالیہ مدراس نے پڑھا)

جناب امیر جامعہ۔ خواتین اور حضرات اس سال کے سند یافتگان۔

جب آپ کے امیر جامعہ نے مجھے یہ بڑا اعزاز بخشا کہ مجھے اس سال جامعہ کے کانووکیشن خطبہ کے پڑھنے کی دعوت دی تو میرے دل میں اس دعوت کے قبول کرنے کے بعد جو پہلی لہر اٹھی وہ یہ تھی کہ میں نے ان الفاظ کے معنوں پر غور کرنا شروع کیا جو اس چیز کے لئے

معین ہیں جس کی انجام دہی میں نے اپنے ذمہ لی تھی۔ یہ میری ایک پرانی اور پکی عادت ہوگئی ہے
میں الفاظ کے مفہوم پر پہلے نظر دوڑا لیتا ہوں جب کہیں میں ان سے آزادی کے ساتھ کام
لے سکتا ہوں۔ یہ ایک ایسی عادت ہے جس کی میں اپنے تجربہ کی بنا پر آپ سے سفارش کرتا ہوں
آپ اکثر یہ بات پائیں گے کہ اس طرح نظر دوڑا لینے سے آپ کے دماغ میں تازہ خیالات کی
دولت زیادہ ہوتی جائے گی اور اس سے بھی زیادہ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ آپ اس طرح
الفاظ کے مفہوم کی جانچ پڑتال کر لینے سے بہت سی غلط فہمیوں اور ذہنی نظر کے غلط
اندازوں سے بچ جائیں گے۔

اس موقع پر میرے زیر غور دو لفظ ہیں یہ دونوں کے دونوں سیدھے سادے
لاطینی لفظ ہیں۔ کان وکے شن اور یونیورسٹی

کان وکے شن کے معنے ہیں "ایک ساتھ بلانا" اور ہمیں اس پر
غور کرنے کی ضرورت نہیں کہ اور جامعوں میں دیگر مقامات اور مختلف عہدوں میں اس "ایک
ساتھ بلانے" کی کیا کیا صورتیں تھیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے یہ "ایک ساتھ بلانا" ان مختلف
عنصروں کا بلانا ہے جن کی تنظیم سے جامعہ مدراس صورت پذیر ہوئی ہے یعنے جامعہ کے
ارباب حل وعقد۔ اساتذہ اور طلباء۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہمیں جو ایک ساتھ بلایا گیا ہے
اس کا کوئی مقصد ضرور ہے۔ اس مقصد کا ایک جز تو یہ ہے کہ فارغ التحصیل اصحاب کو
اسناد عطا کی جائیں تاکہ ان کے تکمیل شدہ مطالعہ پر جامعہ کی مہر ثبت کر دی جائے اور ان
کامیابی کی دعا زندگی کی ان راہوں پر قدم رکھنے کے وقت دیجائے جن پر وہ گام زن
ہونے والے ہیں۔ اسی تقریب کا ایک اہم جز یہ بھی ہے کہ ہم اپنی ذہنی فرد جمع وخرچ
غور کریں اور اپنے سالانہ تعلیمی کام کی تنقیح بالاگ طور پر کریں۔ جہاں تک میں غور کرتا ہوں
مجھے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے تعلیمی میدانوں میں ثابت قدمی کے ساتھ کارنمایاں
کئے گئے ہیں اور یہ سالانہ کارناموں کا تختہ زبان حال سے اساتذہ اور طلبا کے عمدہ کام کی

گواہی دیر ہے۔ جو مسئلہ میں آپ کے سامنے غور و خوض کے لئے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ ان سب چیزوں سے وسیع تر ہے۔ ان تمام باتوں کے دہرانے اور آپ کے سن لینے اور اسناد لیکر اپنے ناموں کے ساتھ مناسب حروف کے اضافہ اور تعلیم جامعہ کے چھاپہ سے ممتاز ہو جانے کے بعد یہ سوال باقی رہتا ہے کہ ان اسناد اس تعلیم جامعہ کی اصلی قدر و قیمت زندگی کی گرم بازاری میں کیا ہوگی۔ آپ نے کیا چیز ان لوگوں سے زیادہ حاصل کی ہے یا آپ کو حاصل کرنی چاہئے تھی جو آپ کے مساوی یا آپ سے زیادہ سنسکرت فلسفہ ہندسہ یا حیاتیات کا علم رکھتے ہیں۔

شاید ہم دوسرے لفظ۔ یونیورسٹی۔ پر غور کریں تو اس کا مفہوم اس راہ میں ہماری رہنمائی کر سکے۔ سر آرتھر کلر کوچ نے بجا طور پر اس بات کی تنبیہ کی ہے کہ یونیورسٹی (جامعہ) اور یونی ورسالٹی (آفاقیت) میں کوئی تعلق نہیں۔ یونیورسٹی (جامعہ) کے معنے صرف ایک سماج (سوسائیٹی) کے ہیں یعنی "ہم سب" یا چونکہ یونیورسٹی ایک مجرد لفظ ہے اس کے مفہوم کو غور کرنے والے یہ الفاظ دیگر یوں ادا کر سکتے ہیں "ہم بحیثیت مجموعی" خواہ ہم کتنی ہی بے احتیاطی اور بے توجہی سے اس لفظ کو لکھنے یا بولنے میں برتیں ہم یہ محسوس کرتے ہیں یہ مانا کہ بہت دھندلے طور پر ہی کہ یونیورسٹی سے ہماری مراد جملہ اساتذہ اور طلباء کے محض مجموعہ سے نہیں ہوتی بلکہ اس لفظ کے مفہوم میں ایک عضو بند جسم کا تصور گھلا ملا ہے یعنی ایک ایسا جسم جو اپنے ترکیبی اعضاء سے بالا اور جداگانہ شئے ہے۔ اس عضو بند جسم کی تعریف یا خصوصیات یا منطقی اصطلاح میں جسے فصل کہتے ہیں اس وقت میرے موضوع کے احاطہ اور میری قابلیت سے باہر ہے یہ بات بھی میرے قابو کی نہیں کہ ایسا معیار آپ کو بتلاؤں جس پر کسی ایسی درس گاہ کو کس کر آپ یہ بتا سکیں کہ آیا جو چیز اپنے آپ کو جامعہ سے موسوم کرتی ہے وہ اس لقب کی مستحق ہے یا نہیں۔ فی الحال یونیورسٹی سے یہ مراد لینی کافی ہے کہ وہ ایک عضو بند سماج ہے جس میں ایک خاص قسم کی تعلیم دی اور حاصل کی جاتی ہے۔ اور جس کا مطمح نظر یہ ہے

نفس پر ایک خاص رنگ چڑھایا جائے اور اگر ہم یہ معلوم کر سکیں کہ یہ خاص رنگ کیا ہے تو
گویا ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ جامعہ کا صحیح کام کیا ہے اور اس کی جان کیا شئے ہے
اور اس طرح ان امور کے متعلق اتنی معلومات ہو جائے گی جتنی کہ ہمارے موجودہ مقصد کے لئے
کافی ہے۔

مجھے پھر ایک دفعہ ذرا قطع کلام کرنا پڑے گا۔ اور اس نئے لفظ "ایجوکیشن (تعلیم)" پر
غور کرنا ہوگا۔ ایجوکیشن ایک اور سیدھا سادہ نفیس لاطینی لفظ ہے جس کے اشتقاقی معنی سے
ہمیں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ آج کل کی فضا گلے اور پچھلے سیاستوں کی گرد سے غبار آلود ہے
اور یہ جھگڑے صرف اس بات پر تھے اور ہیں کہ ایجوکیشن (تعلیم) کا صحیح مدعا کیا ہے
سکھانے کے لئے بہترین چیزیں کیا ہیں اور جب یہ بہترین چیزیں دریافت ہو جائیں تو پھر
ان کے سکھانے کے بہترین طریقے کیا ہونے چاہئے۔ مناسب ہوگا کہ اس گرد و غبار کی
لاٹھ سے ہم اپنے آپ کو بچائیں کیونکہ محض گرد کی لاٹھ یقیناً روشنی کا سہارا نہیں بن سکتی کہ
رات کے وقت بھی ہماری رہنمائی کر سکے۔ اور پہلے اس لفظ (ایجوکیشن) کے معنوں کی
جانچ پڑتال کریں۔ ایجوکیسر کے لاطینی میں معنے ہیں رہنمائی کرنا یا باہر نکالنا اور اس لاطینی
فعل کا مفعول جو محذوف ہے یہ ہے۔ شاگرد کا ذہن یا نفس۔ اس طرح ابتدا ہی سے
ہمارا یہ لفظ جس مطمح نظر کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ طلبا کے نفوس میں
کوئی چیز ٹھونسی جائے بلکہ ان نفوس میں کی کوئی چیز باہر لائی جائے۔ اگر ایجوکیشن (تعلیم)
مراد وہی بات ہے جو اس لفظ سے مترشح ہوتی ہے تو ہم اپنی منزل کی جانب خاصی دور
محض اس لفظ کے مفہوم سمجھنے کی کوشش میں نکل گئے کیونکہ اس مفہوم کے مان لینے کے
یہ معنے ہیں کہ ہم نے تعلیم کے مقصد اور کام کے متعلق اُن جملہ خیالات کو یک لخت
اس بحث کے احاطہ سے نکال باہر کر دیا جن پر لوگوں کی بہت بڑی تعداد ابھی تک مصر ہے
میری مراد اس نظریہ سے ہے کہ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ شاگرد کے نفس میں اس قدر خیالا

بھرے جائیں جس قدر اس میں سما سکیں۔ اس عقیدے کے حامی تقریباً ہمیشہ یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ ہم جس چیز سے شاگرد کے نفس کو لبریز کرنا چاہتے ہیں وہ کارآمد علم ہے حالانکہ اس مسئلہ کا کارآمد کے لفظ کے ساتھ پیش کرنا ایک منطقی مغالطہ ہے یعنی جس چیز کو ثابت کرنا ہے لفظ کارآمد اس بات کو ثابت کرنے سے قبل مان لیتا ہے۔ ان اصحاب کو اس کا خیال نہیں رہتا کہ آپ کسی شئے کو اس وقت تک کارآمد نہیں کہہ سکتے جب تک آپ یہ نہ قرار دے لیں کہ اس شئے کو آپ کس کام میں لا سکتے ہیں۔ دیا سلائی کا بکس اس آدمی کے لئے جو اندھیرے میں راستہ دیکھنا یا چرٹ سلگانا یا اپنے دشمن کا گھر جلانا چاہتا ہے ایک کارآمد چیز ہے۔ لیکن یہ دیا سلائی کی ڈبیہ پرانے زمانے کے بی آلڈر یا اس زمانہ کے برگس کے لئے بھرا ہوا برٹش چانل کے پار تیرنے میں کارآمد نہیں کہا جا سکتا۔ حال ہی میں اس استدلال کو ایک صاحب نے تقریر یا تحریر میں یہ مجھے یاد نہیں رہا نہایت عامیانہ طور پر یوں پیش کیا۔

ہومر یا معاشیات کی واقفیت ایک ایسے شخص کے لئے کیا کارآمد ہو سکتی ہے جو ایک ویران جزیرہ میں جا پڑا ہو" ہم اسے مان لیتے ہیں کہ ہومر اور معاشیات کی واقفیت ایسے شخص کے لئے مطلق کارآمد نہ ہوگی اور اس استدلال کے اس جواب پر قناعت کر سکتے ہیں کہ ہمارا منشا یہ نہیں ہے کہ ہم طلبار کو ویران جزیروں میں اطمینان سے عمر ٹیر کرنے کی غرض سے تربیت دیں بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اپنے طلبار کو متمدنہ اور عضو بند سماج کے قابل قدر افراد بنائیں۔ تاہم اس بات کے دکھانے سے کہ اس تعلیمی عقیدے کے بعض حامی کس قدر غیر منطقی دلیلیں کام میں لاتے ہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس عقیدے کی تہ میں کوئی اصلیت نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جو لوگ اس اپنے چاہیتے فقرے "عملی تعلیم" کو دہراتے ہیں ان کا اصلی مدعا کیا ہے۔ میں جہاں تک غور کرتا ہوں مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات پر جو خیال دباؤ ڈال رہا ہے وہ یہ ہے کہ طلبار کو ایسی چیزیں

سکھائی جائیں کہ وہ فارغ ہوتے ہی کسی کام یا پیشہ میں لگ جائیں اور اس کام یا پیشہ کے ضروری فنی امور اور تفصیلوں سے کماحقہ آگاہ ہوں۔ سیدھے سادے لفظوں میں یوں کہئے کہ جامعہ کا بڑا کام یہ ہونا چاہئے کہ طالب علم جامعہ کے دروازہ سے باہر نکلتے ہی اس پیشہ ورانہ تعلیم کی بدولت جو اسے جامعہ میں دی گئی ہو روٹی کمانے لگے۔ حیات کی کشتی بہت زور شور کی ہو گئی ہے اور اس میں بھی شک نہیں روز بروز اس کا زور شور اور پیچیدگی زیادہ ہوتی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی میں یہی کہونگا کہ جامعہ محاسبوں انجینیروں اور وکیلوں کی تیاری کا اکھاڑا نہ ہونا چاہئے جہاں ہر مضمون کو علم کے اور شعبوں سے علیحدہ اور بے تعلق کر کے پڑھا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں جامعہ کو محض فنی تربیت کے کالجوں کے مجموعے کی حیثیت سے تصور کرنا ہوگا جن کو سہولت کی غرض سے ایک عمارت یا ایک ہی جگہ کئی عمارتوں میں رکھ چھوڑا ہو۔

میں اس موقع پر یہ خیال کئے لیتا ہوں کہ اس جامعہ کے تصور کو آپ حضرات طبعاً جامعہ کے صحیح تصور کے خلاف محسوس کریں گے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ جامعہ کا یہ فرض ہے کہ کھانے کمانے کا بھی اہل بنائے لیکن جامعہ کے اور بھی فرائض ہیں جو اس پیٹ پالنا سکھانے سے کسی طرح کم اہم نہیں ہیں۔

آپ نے غالباً پا لیا ہوگا کہ میرا استدلال ضرورت سے زیادہ یکفنی بن جانے کے خلاف ہے لیکن شروع ہی میں ہم کو یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ موجودہ زمانہ نے ان حالات کو جو اس مسئلہ کے پس پشت ہیں بہت کچھ بدل دیا ہے۔ علم انسانی کی حدود صدیوں کے دوران میں بہت پھیل گئی ہیں اور روز پھیلتی جاتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے بھی عہد گذرے ہیں جن میں یہ ممکن تھا کہ ایک غیر معمولی قابلیت کا آدمی غیر معمولی محنت سے مروجہ علم پر احاطہ کر لے۔ یہاں علم سے میری مراد ایسے علم سے ہے جو قطعی ہو ارسطو نے یہ بات بھی حاصل کی اور یورپ میں احیائے علوم کے بعد دے کارتے اور خود ہمارے بے کن نے

اس طرح کی جامعیت تا بہت بڑی حد تک حاصل کر دکھائی۔ اس زمانہ کے بعد تک آپ یہ پائیں گے کہ یورپ میں جدید طب کے بانی سب کے سب یونانی سے واقف تھے بلکہ یوں کہئے کہ مجبور تھے کہ یونانی پڑھیں کیونکہ یورپی تاریخ کے تاریک عہد پر سے گذر کر ان کو بقراط اور جالینوس تک پہونچنا پڑتا تھا جو طب کے سرچشمے ہیں۔ اس امر سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جتنی فنی اصطلاحیں جدید طب میں پائی جاتی ہیں وہ جان بوجھ کر یا ساخت کے لحاظ سے یونانی ہی رکھی گئی ہیں مثلاً پانکریاٹوجی۔ کلی نکل وغیرہ ایک جدید عمل جراحی امعاء پر کیا جاتا ہے اس کی اختراع کو تیس برس سے زیادہ کا عرصہ نہیں ہوا اس کے لئے بھی جو اصطلاح وضع کی گئی ہے وہ بھی خالص یونانی لفظ ہے۔ وہ زمانہ کہ آدمی ہر چیز کی بابت کچھ جان سکتا تھا اب ہمیشہ کے لئے گیا۔ اب ہم میں سے ہر ایک کو بس اس پر قناعت کرنی چاہئے کہ اس وسیع میدان کے کسی ننھے سے گوشہ میں کچھ جوت بولیں اس سے آگے اگر ہم نے پیر پھیلائے تو پھر سوائے اس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ ہم بے مصرف نمودی عالم بنجائیں بہت سے علوم میں کچھ شُدبُد سی تو ہو جائے لیکن کسی ایک شعبہ پر حاوی نہ ہوں۔ ایسے لوگ اپنے لئے بھی اتنے ہی ناکارہ ہوتے ہیں جتنے اوروں کے حق میں وہ یقیناً بے سود ہوتے ہیں ایک جامعہ میں یہ کیفیت نظر آتی ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے کونے میں ہل جوتتا ہے برابر یا ذرا دور مگر آنکھوں کے سامنے۔ اس کھیت کے بعض کونے ایک دوسرے سے بھڑے ہوئے ہوتے ہیں مثلاً تامل کا حصہ تلنگی اور امراضیاتی گوشہ عضویاتی کے لگ بھگ ہے۔ کھیت کے ان حصوں سے میکانیاتی اور ہیئت کے کونے بہت دور ہوتے اور ایک دوسرے کو دھندلے دھندلے سے دکھائی دیں گے۔ یہ میرا استعارہ بھی اگر ایک خاص حد کے بعد بھی اسی سے کام لوں تو اور استعاروں کی طرح ناکافی ثابت ہوگا۔ لہٰذا میں اسے بدلے دیتا ہوں اور یوں کہئے کہ اگر تامل اور تلنگی کے درسی کمروں میں کوئی دیوار حائل نہ ہو تو نتیجہ یہ ہوگا کہ برج بابل کی طرح زبانوں کی نیرنگی اور خیالات کی الجھن پیدا ہو جائے گی تو کیا

اس حیثیت میں ہم نے اپنے آپ کو ایسی بھول بھلیاں میں پہونچا دیا ہے جہاں جدھر دیکھو نری خالی خولی دیواریں ہی نظر آتی ہیں۔ لیکن صبر بڑی چیز ہے اور بقول سقراط ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ استدلال ہمیں جس رُخ پر لے جائے اُدھر چپ چاپ چلے چلیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس بھول بھلیاں سے ہم اس طرح نکل سکتے ہیں۔ یہ مانے لیتے ہیں کہ استاد اور اس کا شاگرد در اصل تو ایک ہی علمی شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں تاہم اس شعبہ کی ٹھیک ٹھیک پڑھائی اسی وقت کہی جائے گی جبکہ اس خاص شعبہ کی تعلیم جملہ علمی شعبوں کی مناسبت کے مدنظر دیجائے۔ اس طرح پڑھانا وہ چیز ہے جس سے ہم اصل پڑھانے اور محض رٹانے میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ اس کہنے سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ سب علم ایک شئے ہے یہ ایسی ہی مسلمہ بات ہے جیسے یہ اجتماع ضدین کا اصول کہ ایک ہی شئے ایک ہی وقت ایک ہی مقام پر ہو بھی اور نہ بھی ہونا ممکن ہے۔ اس اصول۔ اجتماع ضدین ارسطو کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص تسلیم نہ کرے تو ایسے شخص کے ساتھ آپ ہرگز استدلال نہ کریں کیونکہ یہ شخص نباتات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ علمی شعبوں میں مناسبت اور مطابقت استاد کی جانب سے ہوگی اس لئے کہ اس کی نظر اور تجربہ وسیع تر ہوگا لیکن جوں جوں شاگرد اپنے مضمون کی گرفت میں آگے قدم بڑھاتا جائے گا وہ اس بات کو محسوس کرتا جائے گا کہ اس مضمون کی جگہ کل علمی دنیا میں کیا ہے۔ جامعہ کے امتیاز کی ایک اور بات یہ ہے کہ جامعہ کے سبق صرف درسی کمروں تک ہی محدود نہیں ہوتے۔ استاد آپس میں ملتے جلتے ہیں شاگرد ایک دوسرے سے گھلے ملے ہوتے ہیں اور پھر استاد اور شاگرد شیر و شکر ہوتے ہیں اور اس طرح کا آپس کا میل جول زیادہ تر درسی کمروں کے باہر بیسیوں طرح کی سرگرمیوں میں ہوتا ہے اور خیالات کا تبادلہ جاری رہتا ہے۔ اس تبادلہ خیال سے اس احساس میں مضبوطی ہوتی ہے کہ ایک قسم کا مطالعہ دوسرے مطالعوں سے تعلق رکھتا ہے اور اگر ہمارے اس تمام استدلال کو صحیح مان لیا جائے

جو ہم اب تک کرتے آئے ہیں تو یہ احساس ہی تعلیم جامعہ کی جان ہے۔ اسی احساس کی بدولت ضمناً ایک اور اخلاقی انمول بات بھی حاصل ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ مرد ہوں یا خواتین ان کو ایک دوسرے کے نقطہ نظر کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور وہ آفاقی بے تعصبی کا نہ سہی اس صفت کا عملی سبق ضرور حاصل کرتے ہیں کہ آپس میں رواداری سے کام لینا چاہئے۔ جامعہ کے اور انمول رخ بھی اس صفت کو پختہ کرنے میں ممد اور معاون ہوتے ہیں وہ رخ یہ ہیں کھیل کود اور فوجی تربیتی کور میں مل جل کر شریک ہونا اور ایسی ہی اور باتیں جن سے تندرست بدن حاصل ہوتا ہے اور تندرست بدن ہی وہ جگہ ہے جہاں تندرست نفس رہ سکتا ہے۔ لیکن ان چیزوں سے صرف یہ ہی نہیں کہ ایک صحیح اور تندرست بدن مل جاتا ہے ان سے جو انمول روح پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک مقصد کے لئے بہت سے ملکر کام کریں نہ یہ کہ ہر شخص اپنے ذاتی مدعا کے حاصل کرنے میں منہمک رہے طلبا کی انجمنیں (کلب) اور مباحثہ کی بزمیں تبادلہ خیالات اور نظر کو پھیلانے کے لئے بڑے عمدہ میدان ہیں۔ لیکن میں ایک اور ہی بات کو یہاں واضح کرنے کی کوشش میں ہوں۔ میں طالب علموں کے آپس کے تبادلہ خیال پر بہت زور دینا چاہتا ہوں یوں تو ہر جامعہ میں اس طرح آپس کا تبادلہ خیال نہایت قیمتی چیز ہے لیکن ہندوستانی جامعہ میں یہ چیز انمول ہے اور اس کی خاص وجہ یہ ہے۔ یہ ایک ایسا موقع ہے جو شاید پھر کبھی آپ کو اپنی زندگی میں نصیب نہ ہو۔ میں مثال سے اس خیال کو واضح تر بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس قسم کی کوشش اکثر کامیاب ثابت ہوئی ہے اور میں سفارش کرتا ہوں کہ آپ بھی جب کبھی موقع ملے واقعی مثال سے اپنے خیالات کو واضح کرنے کی کوشش کیا کریں۔

انگلستان کے کسی ضلع کے شہر کو لیجئے۔ وہاں آپ ڈاکٹر وکیل انجنیر اور میونسپل عمارت (ماہران فن عمارت) وغیرہ پائیں گے۔ ان میں کہیں ایک آدھ نقاش یا اہل قلم یا اخبار (روزنامچی) بھی آپ کو مل سکے گا۔ اگر اس شہر میں کوئی جامعہ بھی قائم ہو تو اس تھوڑی سی

فہرست میں پیشہ وروں کے نام بھی لکھ لیجئے۔ زندگی کے اصلی عملی رخ کے لوگ یعنے تاجر اور کارخانہ دار بھی ان میں شامل ہوں گے۔ ان لوگوں کے نفوس (ایک دوسرے سے مٹھ بھیڑ ہوگی اور ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ ضرور سبق لے گا اور اس طرح ایک دوسرے کے نقطہ نظر کی قدر و قیمت اپنے آپ ذہن نشین ہوتی جائے گی اس طرح کی مٹھ بھیڑ اور رگڑ سے مقامی پبلک رائے کا ایک مرکز پیدا ہو جائے گا اور اس مرکز کی رائے نہ صرف سائنس اور فنون لطیفہ بلکہ مقامی اور قومی دونوں اعتبار سے سیاسی اہمیت بھی پیدا کر لے گی۔ یہ لوگ یعنے اس ایک ضلع کی مقامی پبلک رائے کے مرکزی ارکان اپنے زمانہ طالب علمی کے تبادلہ خیال کے عمل کو آخر عمر تک جاری رکھ سکتے ہیں۔ اس عمل سے میری مراد یہ ہے کہ ایسے نفوس سے رگڑ کھا کر جو اپنے اپنے شعبہ زندگی میں تربیت پا چکے ہیں یہ لوگ اپنے نفوس کی وسعت میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کی وسعت اور یہ مجبوری کہ یہاں تربیت یافتہ اصحاب کو بڑی بڑی دور بکھر جانا پڑتا ہے وہ بات جو میں نے ابھی بیان کی ہے حاصل ہونی ممکن نہیں۔ آپ میں سے اکثر صاحبوں کو اس مجبوری کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ آپکی اپنی زندگی بھر معدودے چند اصحاب کے ذہنی تنہائی میں گزارنی ہوگی۔

کتابوں کے ذریعہ آپ ایک حد تک یہ بات حاصل کر سکیں گے کہ اس وسیع دنیا کے خیالات سے نامانوس نہ رہیں اور مجھے امید ہے کہ آپ جہاں کہیں ہوں کتب بینی کریں گے لیکن کتاب آپ سے بول سکتی ہے آپ اس سے بات چیت نہیں کر سکتے یعنے کتاب کے ساتھ باتیں کرنا اس معنے میں کہ تبادلہ خیال ہو ممکن نہیں اور تبادلہ خیال ہی تو سب میں بڑی بات ہے۔

ہم نے مثال کے لئے انگلستان کے ضلع کا ایک ننھا سا شہر اور وہاں کے ایک چھوٹے سے گروہ کو لیا تھا اس گروہ کے متعلق میں ایک اور بات آپ کے سامنے پیش کرنی چاہتا ہوں۔ اس شہر میں قریب قریب سب ایسے شہری بستے ہیں جو اپنے خانگی کاروبار میں

مشغول ہوں وہاں سرکاری عہدہ دار گویا ہوتے ہی نہیں۔ ایک آدہ ضلع کا افسر بندوبست یا افسر صحت عامہ ہو تو ہو لیکن ان افسروں کو مقامی کہنا چاہئے۔ اس لئے کہ ان کی تقرری کا دست کرتی ہے یہ مرکزی (شہنشاہی) حکومت کے جانب سے مقرر نہیں کئے جاتے ہاں البتہ اس شہر کی زندگی کی منجھدار سے پرے ہٹے ہوئے آپ کو ایک مہتمم تعلیمات (انسپکٹر مدارس) اور ایک کرور گیری کے کمشنر بھی نظر آئیں گے لیکن ہے صاحب یہاں بعض تعلیم کی نگرانی کے کام کے ہیں کیونکہ انگلستان میں تعلیم در اصل مقامی حکومت کا کام ہے۔ رہے دوسرے صاحب ان سے فطرتاً ہر محتاط آدمی دور ہی رہنا پسند کرتا ہے اس میں شک نہیں لندن میں سرکاری عہدہ دار بہت ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ اس جنگ کے بعد سے ان کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود بھی لندن میں عہدہ داران سرکاری کی تعداد آزاد پیشہ وروں کے مقابلہ میں مٹھی بھر ہی ہے۔ صرف ڈاکٹروں یا وکیلوں کی ہی گنتی کی جائے تو عہدہ داروں سے کہیں زیادہ نکلیں۔ سرکاری عہدہ داروں کی اتنی کم تعداد تعلیم یافتہ پبلک رائے پر اپنا رنگ نہیں چڑھا سکتی۔ اس کا مقابلہ ہندوستان کی حالت سے کیجئے۔ یہاں تعلیم یافتہ مردوں اور عورتوں کا بڑا حصہ سرکاری ملازمت کے زمرہ میں ہے خواہ ملازمت مرکزی (شہنشاہی) ہو یا صوبہ داری صرف وکیل البتہ اس زمرہ سے خارج ہیں۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر بہ حیثیت ایک وکیل کے چلتے چلتے یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ آزاد پیشہ جماعتوں میں وکیلوں کا بلحاظ تعداد چھایا ہوا ہونا نہایت بری چیز ہے اور پیشوں میں سرکاری ملازموں کی کثرت کے بظاہر دو سبب ہیں۔ ایک سبب ناگزیر امر ہے اور دوسرا کم از کم ایک فطری رجحان ضرور ہے پہلے تو یہ بات قابل غور ہے اس ملک کی آبادی کا بہت بڑا حصہ مفلس ہے اور اس قدر مفلس ہے کہ اگر حکومت تخواہ دے کر ڈاکٹروں انجنیروں اور استادوں کو مقرر نہ کرے تو پھر ان پیشوں کے لوگ سوائے بڑے بڑے شہروں کے اور کہیں اپنے گذارے کے لائق بھی روپیہ نہ کما سکیں

دوسرا سبب یہ ہے کہ ہر ہندوستانی کے دل میں حتی الامکان سرکاری ملازمت میں داخل ہونے کا ایک شوق ہوتا ہے کچھ تو اس وجہ سے کہ سرکاری ملازمت سے ذرا ناک اونچی ہو جاتی ہے کچھ اس باعث۔ اور یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے کہ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ایک مستقل آمدنی ہو اور پھر ملازمت کے ختم ہونے پر بڑھاپا کاٹنے کے لئے بندھی ہوئی پنشن بھی ہوتی ہے آزاد پیشہ وروں کی تعداد کی قلت سے اور دو باتوں کی حقیقت بھی کھل جاتی ہے۔ ایک تو اس سے اس وجہ کا پتہ چل جاتا ہے کہ کیوں یہاں کی حکومت کو۔ بورو کریسی۔ (دفترشاہی) کہکر برا بھلا کہا جاتا ہے۔ ایک ذرا سا جملہ معترضہ اور سن لیجئے۔ بورو کریسی۔ ایک دو لفظ ہے اور قابل نفرت ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اب زبان انگریزی سے اس کا کا لامنہ نہ ہوگا۔ کیا آزاد پیشہ وروں کی قلت تعداد کے یہ معنے ہیں کہ حکومت کو اس آزاد طبقہ کی تنقید اور آزاد رائے سے استفادہ کرنے کا موقع ہندوستان میں حاصل نہیں اور حکومت کو مجبوراً محض اپنے بل پر معاملات کی گتھیاں سلجھانی پڑتی ہیں؟ میں نے جان بوجھکر لفظ استفادہ استعمال کیا ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ کوئی حکومت ایسی نہیں جو اس قسم کی آزاد رائے دینے والی جماعت کو اپنے حق میں نعمت نہ خیال کرے اس نکتہ سے یہ بات بھی حل ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں پبلک کے راہنما کیوں اس امر کی شکایت کرتے ہیں کہ ان کی سرگرمیوں پر حکومت کی جانب سے جو تنقید ہوتی ہے وہ بے لوث نہیں ہوتی اور ناواقفیت پر مبنی ہوتی ہے اس لئے کہ جو سرکاری لوگ تنقید کرتے ہیں وہ خود سیاسی اکھاڑے میں اترے ہوتے ہیں اور اخبار بھی جس طرح کی تنقید کرتے ہیں وہ انہی لوگوں کے سکھائے پڑھائے ہوتے ہیں ایسے لوگ اور ایسے اخبار کبھی غیر جانب دارانہ نقطہ نظر سے پبلک مسائل پر بحث نہیں کر سکتے حالانکہ کسی قسم کی فرقہ بند (پارٹی) حکومت کیوں نہ ہو ہر شخص کا غیر طرفدارانہ نقطہ نظر کا اختیار کرنا ایک اخلاقی فرض ہے۔ مجھے اس بات کا یقین ہے جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ ہندوستانی پبلک کے راہنما اور حکومت دونوں کو

یہ بات باعث مسرت ہوگی کہ ایک ساحب الرائے گروہ یہاں کے شہروں میں بھی پیدا ہو جائے جو اس گروہ سے حکومت اور پبلک کے رابطہ دونوں تعلق رکھ سکیں گے اور اس تعلق سے دونوں کی تنقید میں استواری پیدا ہوگی اور جان کی بڑھ جائے گی۔

یہ نہ خیال کیجئے کہ میں سیاسیات کی گفتگو کر رہا ہوں۔ مجھے سیاسیات سے کوئی بحث نہیں۔ میں جس چیز پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ کی آئندہ زندگی کے مقابلہ میں آپ نے اپنے زمانہ طالب علمی میں جو فائدہ اٹھایا ہے یا فائدہ اٹھانے کا موقع پایا تھا وہ کس قدر مغتنمات سے تھا۔ آپ طالب علمی کے زمانہ میں ایسے نفوس کے جھرمٹ میں تھے جو آپ سے دنیا بھر کے کسی مسئلہ پر بحث کرنے کو آمادہ تھے۔ یہ لوگ اس قسم کے ذہنی سورما تھے جو کسی رائے کے حامی نہ تھے اور حامی کیونکر ہو سکتے تھے۔ ان کو نہ تو اپنے سرکاری عہدوں کی لاج تھی اور نہ پبلک کو رام کرنے کی حاجت۔ اگر اس موقع کو آپ نے ہاتھ سے جانے دیا تو یقین جانئے کہ آپ نے اپنے آپ کو حاصل کے نہایت قیمتی عطیہ سے محروم رکھا۔ آپ کی تعلیم کی بنیاد بیشتر ادبی اسی لئے رکھی گئی ہے کہ آپ اس گراں بہا عطیہ سے فیضیاب ہو سکیں۔ آپ کسی کی صحبت سے اس وقت تک فیض نہیں پا سکتے کہ آپ اور وہ دونوں ایک ہی زبان میں بات چیت اور اپنے مافی الضمیر کو واضح اور معقول طور پر اس زبان میں ادا نہ کر سکیں۔ یہ بات تضادی معلوم ہوگی مگر تقریباً ہر معلم اس کی تصدیق کرے گا کہ اپنی زبان میں قادر الکلامی اور عام فہمی تحصیل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنی زبان کے علاوہ بھی کوئی زبان سیکھیں۔ اس مقصد کے لئے میں کسی مردہ زبان مثلاً سنسکرت یونانی یا لاطینی سیکھنے کو ترجیح دونگا کسی نے کیا بات کہی ہے۔ میں ایسے حالات میں یہ لکھ رہا ہوں کہ میرے پاس حوالہ کے لئے کتابیں موجود نہیں اور میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اس بات کا کہنے یا لکھنے والا کون تھا اور اس کے اصلی لفظ کیا تھے۔ ہاں کیا خوب بات کہی ہے کہ اگر یہ شرط لگا دی جائے کہ جتنے بحث مباحثہ کرنے والے ہیں وہ اپنے استدلال کو لاطینی نثر میں بیان کریں تو دنیا کے

لصف مناظروں اور مناقشوں کی جڑ ہی کٹ جائے۔ اس قول کا تہ میں جو اصول ہے وہ
یہ ہے کہ ہم اپنی زبان میں زیادہ آسانی سے اُن متعدی الفاظ اور رو ئی خیالات کے ذہنی
طور پر غلام بن جاتے ہیں جو عام طور پر رواج پا گئے ہوں۔ جب آپ کسی غیر زبان [illegible]
اس سے بہتر صورت یہ ہے کہ اپنی زبان سے غیر زبان میں ترجمہ کریں تو پھر آپ کو جیسا کہ
بازاری لوگ کہتے ہیں ناکی کوڑی لانی پڑتی ہے۔ لازم ہو جاتا ہے کہ آپ الفاظ کے صحیح
معنوں تک پہونچیں اور یہ تعلیم کی ایک بہترین صورت ہے اور اس سے آپ یہ سبق حاصل کریں گے
روزمرہ زندگی میں آپ جو لفظ برتتے ہیں ان کے صحیح معنوں پر غور کریں۔ آپ کی زبان جتنی سیدھی
سادی اور میر بھیے سے خالی ہوگی اتنی آسانی سے آپ کی بات لوگوں کی سمجھ میں آئے گی جب
آپ ایک سیدھی سی بات بیان کرنی چاہیں تو آپ کی زبان بھی سیدھی سادی ہونی چاہئے
مبالغہ سے پاک ہو اور غیر ضروری لفظوں سے بھی آزاد۔ جن بنگالی صاحب نے اپنی والدہ صاحبہ
کی موت کی خبر ان الفاظ میں دی "وہ ہاتھ جو میرے گہوارے کو جھٹکے دیتا تھا اب دنیا کو
لات مار چکا ہے" وہ اگر صرف یہ کہتے کہ "میری اماں مر گئیں" تو زیادہ زود فہم بات ہوتی
انگلستان میں ایک طبیب عدالت میں گواہی دینے آئے جس آدمی کا انہوں نے طبی امتحان
کیا تھا اس کے متعلق فرمانے لگے۔

"معالج کی طرف اعلیٰ کا بوجہ عسر بہ انجماد دم سے متورم ہونا"

جج نے جوری کی طرف مڑ کر اکھل کھرے لہجہ میں کہا آپ یہ کہنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس
آدمی کی آنکھ چوٹ کھا کر سوج گئی تھی" آپ اپنی اصطلاحیں اس وقت کے لئے اٹھا رکھئے
جب کہ ان کی ضرورت اٹل ہو جائے۔

رنگین بیانی اس وقت مناسب ہوگی کہ آپ کا موضوع مطالب کی بلندی اور جذبات کی
شدت کے لحاظ سے اس امر کا متقاضی ہو کہ آپ کی نثر شاعرانہ زبان سے پنکھ مستعار
لے کر ہوا میں اڑ سکے اور اڑے بھی اگر آپ میری رائے مانیں تو بہت ہی تھوڑی دیر کے لئے

اب کہ ہمارا استدلال اس نوبت پر آگیا ہے اگر آپ اجازت دیں تو ہم تعلیم کی غایت کے بارے میں اُس انتہائی نظریہ کو مختصر طور پر ٹھکانے لگا دیں جس پر اس بحث کی ابتدا میں ہم نے سرسری نظر ڈالی تھی۔ وہ نظریہ یہ ہے کہ اگر آپ صحیح طریقہ سے پڑھاتے ہیں تو پھر یہ بحث باقی نہیں رہتی کہ آپ اپنے شاگرد کو کیا چیز پڑھائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ خواہ کچھ ہی پڑھائے لیکن طریقہ صحیح ہو تو نفس کی تربیت ہر حالت میں ہو جائے گی تو بس یہ فرض کر کے کہ آپ صحیح طریقہ پر پڑھاتے ہیں پھر شاگرد کی ذہنی غذا شطرنج کے مسائل ہوں یا ہندسی اشکال مرہٹوں کی لڑائیوں یا مدراس یا ئد ہرن (جنوبی) مرہٹہ ملکوں کی تاریخ ہو سب یکساں ہے۔ ارسطو کے قول سے کوئی شخص ایسی انگریس باتیں اسی وقت کر سکتا ہے کہ اس نے اپنے کسی دعوے کو لینے ایسے مسئلہ کو جس پر اُسے اپنی رائے کی بہت کی ہو گئی ہے ہر طرح قائم رکھنے کا تہیہ کر لیا ہو اور ارسطو نے یہ بات مہذب پہلو میں ادا کی جس کے سیدھے سادے معنے یہ ہیں کہ ایسا آدمی نامعقول بکواس کرتا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے شاگرد کے سامنے کیا چیز پیش کی جائے جسے وہ اپنے ذہن کا جز بنائے ایک نہایت ہی اہم سوال ہے ہم سب عموماً اس مسئلہ کی موٹی موٹی باتیں تو جانتے ہی ہیں اور اس وقت یہ میرا کام بھی نہیں کہ نصاب تعلیم تیار کروں۔

آئیے کے پہلو سے تعلیمی نصاب میں اس زبردست اور غیر محدود کتاب کے چند ورق ہونے چاہئے جس میں قدرت کے راز تحریر ہیں۔ فنون کے پہلو سے اعلیٰ انسانی کارناموں کا تذکرہ یا اعلیٰ انسانی خیالات یا اعلیٰ انسانی ادب کے نمونہ ہونے چاہئے بے کن کے زبردست الفاظ ان چیزوں کے بارے میں یہ ہیں "ایسی چیزیں جو انسان کے دلوں میں گھر کر لیں اور ان کے آپس کے معاملات میں سرایت کر جائیں" یہاں معاملات سے محض تجارتی کاروبار مراد نہیں ہے۔ اس قسم کے مضامین کو پرانے زمانہ میں ہیومانی ٹیز (HUMANITIES) علوم انسانیہ پکارتے تھے میری رائے میں یہ لفظ عہد حاضر کے لفظ آرٹس (فنون) سے بدرجہا بہتر ہے اور

آکسفورڈ میں اب تک شعبہ السنہ قدیم کو شعبہ ادبیات انسانیہ (SCHOOL OF LITERAE HUMANIORES) اور اے ڈی برامیں لاطینی کے پروفیسر کو اب بھی پروفیسر انسانیت کہتے ہیں

اب اگر ہم ٹھیک رستہ پر پڑ گئے تھے تو منزل مقصود ہماری نظروں سے اوجھل نہیں میں نے اس خطبہ کے شروع میں عرض کیا تھا کہ ہمیں جس چیز کی جستجو ہے وہ یہ ہے کہ وہ کیا امتیازی رنگ ہے جس کو نفس پر چڑھانا جامعہ کی تعلیم اور تربیت کا مقصود ہونا چاہیے اور میں اب اس بات کو علی الاعلان کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ہماری جستجو ختم ہو چکی اور ہم منزل مقصود کو پہونچ چکے ہیں۔ اس رنگ کی جو جامعہ کے کارخانہ میں نفوس پر چڑھایا جاتا ہے میں اس موقع پر صرف یہی تعریف کر سکتا ہوں کہ وہ تنقیدی روح ہے تنقیدی روح وہ روح نہیں جو دنیا کو چلاتی ہے۔ یہ زبردست کام تخلیقی روح کا حصہ ہے جو انسانوں کے راہنماؤں اور قافلہ سالاروں کے منہ سے نکل کر اپنا کرشمہ دکھاتی ہے یہ راہنما کون ہیں؟ پیش بیں ہستیاں پیغمبر اور اکثر اوقات وہ بزرگ روحیں بھی جو شہادت کا رتبہ حاصل کرتی ہیں۔ لیکن کبھی دنیا بہت تیز چلتی ہے اور کبھی دنیا ٹھیک راستہ سے بھٹک جاتی ہے اور ایسی صورتوں میں وہ فرزندان آدم کام دیتے ہیں جن میں تنقیدی روح موجود ہو۔

اس قسم کے لوگ رجعت قہقری اور ضرورت سے زیادہ پیش قدمی دونوں کو روکنے میں مدد دے سکتے ہیں اور سب میں بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ اس کام میں بڑی مدد دیتے ہیں کہ دنیا کا کارخانہ جب بے ڈھنگا سا ہو جائے لوگ غلط راہ پر پڑ لیں تو کاروبار کو ٹھیک ٹھکانے لگا دیا جائے اور بھٹکے ہوؤں کو ٹھیک راستہ پر ڈالا جائے۔ ایسے زمانہ میں جب لوگوں کے جذبات بہت بھڑک اٹھے ہوں اور بدگمانی اور غلط فہمی کی کوئی حد نہ رہی ہو ان تنقیدی روح والے اصحاب کی کوئی شنوائی کچھ دنوں تک نہیں ہوتی اور ان کی آواز صدا بصحرا ہے زیادہ وقعت نہیں پاتی فرانسیسیوں میں تنقیدی روح کی بہتات رہی ہے لیکن خود فرانس میں

سینٹ بارتھولومیو کا قتل عام اور صدیوں بعد کالاس (CALAS) اور ورے فوس (DREYFUS) کے المناک حادثہ گذرے ہیں عقل سلیم اور رواداری کی سنگت سے تنقیدی روح پیدا ہوتی ہے اور عقل سلیم اور رواداری کی شناوائی جس وقت ہونے لگتی ہے تو پھر کہیں لوگ صحیح دماغی اور سلامت روی کی جانب لوٹتے ہیں اور جو غلطیاں سرزد ہوئی تھیں ان کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ تنقیدی روح کو جیسا کہ گتھے نے کہا ہے انکاری روح سمجھیں یا یہ تصور کریں کہ تنقیدی روح فی نفسہ تخلیقی روح کی مخالف یا ضد ہے اس روح کی ابتدا کو دیکھئے قبل مسیح کی چھٹی اور ساتویں صدیوں میں ایونین یونانیوں کے اس عجیب و غریب گروہ میں یہ روح پیدا ہوئی جس نے دنیا میں ایک نئی ذہنی روشنی کی کرنیں دور دور پھیلا دیں۔ ان لوگوں کا یہ اصول تھا کہ ہر چیز کی لم دریافت کی جائے اور جہاں تک بس چل سکے سچائی کا کھوج لگایا جائے۔ لطیفہ تو یہ ہے کہ ان میں سے ہی ایک کا مقولہ ہے کہ سچائی کنوئیں کی تہ میں رہتی ہے۔ اسی گروہ نے فلسفہ اور علوم طبیعی کی بنیاد ڈالی۔ انہیں ایونیون نے شاعری اور ادب کی مشعل کو ہومر کے ہاتھوں سے لیا اور اس کو اپنے ایونی اور اٹی کی یا ران آیندہ کے حوالہ کر دیا۔ ان سبھوں نے یونانی ادبیات کو ڈھالنا شروع کیا یہ یونانی ادب اب تک دنیا کی کسی اور زبان کے ادب سے ہٹیا نہیں ہے اور کچھ اوپر دو ہزار برس سے دنیا کا ایک اعجوبہ تصور کیا جاتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اور چیزیں جو اعجوبے سمجھی جاتی ہیں وہ اس لقب کی اتنی مستحق نہیں۔

مارک پاٹی سن کے الفاظ پر میں اس خطبہ کو ختم کرتا ہوں۔ مارک پاٹی سن ایک عالم متبحر تھا اور اس سے بڑھیا فاضل ابل اب تک خود میری جامعہ آکس فورڈ سے بھی کوئی اور نہیں نکلا ہے مارک پاٹی سن نے تنقیدی روح کی یوں تعریف کی ہے۔

"نفس کو پوری طرح عمیق وسیع اور بلند یعنے آزاد کرنے والی تعلیم اور ایک عمدہ قوت فیصلہ فلسفیانہ مزاج کی ساخت پرداخت ایک ہی چیز ہے اس قسم کی چیز کا پیدا کرنا انسانی دماغ کی

اعلیٰ تریں اور بزرگ تریں پیداوار ہے اور اعلیٰ تعلیم کی درسگاہ ایسی ہی چیز کے بنانے اور سنوارنے کے لئے علم کے نفیس اوزاروں سے کام لیتی ہے"

یہ روح یا یہ قوت فیصلہ یا یہ مزاج آپ اسے جو چاہے کہے جس حد تک آپ میں یہ [illegible] ہو تک آپ اپنی ماں اور جامعہ کے قابل بیٹے اور بیٹیاں کہلائیں گے اور اس بات کے لئے تیار ہوں گے کہ جامعہ سے بھی بڑی ماں یعنی مادر وطن کے بھی اسی حد تک آپ قابل بیٹے اور بیٹیاں بنے جائیں اس بات کے اہل ہوں کہ وطن کے اعلیٰ حقوق شہریت سے بہرہ ور ہوں اور ساتھ ہی اعلیٰ فرائض شہریت کو بھی انجام دے سکیں۔

شریک مدیر

وراثت و ماحول

وراثت لفظ عام ہے اردو میں جس کے معنے تقسیم ترکہ سمجھے جاتے ہیں اس موقع پر ترکہ ہی کے معنوں میں استعمال ہوگا مگر ترکہ میں جائداد کا خیال نہیں ہے بلکہ وہ تمام خواص و خصوصیات جسمانی و دماغی مراد ہیں جن کو بچہ اپنے اجداد سے بطور ترکہ لے کر دنیا میں پیدا ہوتا ہے ماحول سے مراد وہ مادی اور غیر مادی اشیا ہیں جن کو بچہ اپنے گرد و پیش پاتا ہے یہی اشیاء بچے کے عادات و خصائل کے مرتب ہونے کا باعث ہوتے اور اس کے تعلیم و تربیت پر موثر ہوتے ہیں۔

ہمارے بعض بزرگ جن کا ماحول ہم سے بالکل مختلف رہا ہے ہمیشہ اس بات کے گویا شاکی رہتے ہیں کہ ان کے اولاد کے مناکحت اپنے ہی خاندان میں ہو کیونکہ وہ دوسرے غیر خاندان والے کو عجیب نہیں سمجھتے اگر اتفاق زمانہ ان کو اپنے خاندان میں ازدواج سے

ناکامیابی ہوئے تو نسل خاندان کی جستجو کرتے ہیں۔ غرضکہ وہ تمام ذرائع اختیار کرتے ہیں جن سے ان کے خاندان اور نسل پر دھبہ نہ آنے پاوے۔ گو یہ بزرگ سائنٹفک اصولوں سے ناواقف ہیں مگر تجربہ اور قدیمی روایات سے ان کو معلوم ہے کہ خاندان میں شادیاں نہایت برکت اور خوش زندگی بسر کرنے کا باعث ہوتی ہیں۔ علمی تحقیقات بھی اسی نتیجہ پر پہونچی ہے کہ انسان کو اپنے محفظ شرافت لازمی ہے لہذا ہر شریف کو چاہئے کہ توریث کی طرف خاص توجہ مبذول رکھے تاکہ اس کے اولاد آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رہے اور زندگی کے جدوجہد میں کامیاب ہو۔

بچہ کی تخلیق اللہ جل شانہ نے ایسے عجیب و غریب قوانین کے تحت فرمائی ہے کہ اس میں اس کے باپ اور اجداد کے تمام خواص و خصائل موجود رہتے ہیں۔

گو بچہ اپنے والدین اور ان کے اجداد کے ممکنہ خواص و خصوصیات لیکر پیدا ہوتا ہے تاہم بہت ممکن ہے کہ یہ خواص بعض زیادہ ہوں جو کافی طور سے بچوں میں نمایاں پائے جائیں اور بعض اس قدر کم مقدار میں ودیعت ہوں کہ انسان کے زندگی بھر میں ان کا ظہور عمل میں نہ آوے۔

جب بچہ اپنے والدین کے خصوصیات جسمانی و دماغی لیکر پیدا ہوتا ہے تو یہ بتلا دینا آسان ہونا چاہئے کہ فلاں خصلت اپنے باپ کی اس کو ملی ہے یا اجداد میں سے کس کی؟ حقیقت میں ایک شخص کو دیکھ کر اس امر کا اندازہ کر لینا بہت مشکل ہے کہ فلاں فلاں قوائی اس کو اپنے باپ سے ملے ہیں اور فلاں اپنے دادا سے وہو ہذا اگر ایک باپ کے کئی بچے ہیں چند ان میں لانبے چند پست قد ہوں گے۔ چند دبلے چند موٹے چند ذہین اور چند کودن نیز یہ بھی کچھ ضروری نہیں ہے کہ ایک قوی الجثہ کے تمام اعضائے جسمانی مضبوط اور بے عیب ہوں اسی طرح ایک ذہین شخص ممکن ہے کہ بڑا ریاضی داں ہو مگر لیڈر بننے کے قابلیت نہ رکھتا ہو۔ اگر مختلف القوم بچے مثلاً چاپانی انگریز اور ہندی جمع کئے جائیں

ناک نقشہ میں قوائے جسمانی اور دماغی میں غرضکہ ہر چیز میں فرق ملے گا۔ اگر ان کو ایک ہی جگہ رکھا جائے۔ ایک جگہ تعلیم دئے جائے یعنے ان کا ایک ہی ماحول ہو تو معلوم ہو جائے گا کہ اختتام تعلیم کے بعد وہ اپنے قوی خصوصیات کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔

ماحول کسی قدرتی خصوصیت جسمانی یا دماغی کو پیدا نہیں کر سکتا مگر ضائع کر سکتا ہے سر پر ضرب لگنے سے ممکن ہے کہ حافظہ غائب اور نسیان کا غلبہ ہو جائے۔ ایک اعلیٰ ترین درسگاہ کسی فطرتی قوت کے پیدا کرنے کی جگہ نہیں ہو اکرتی اس کا کام صرف اس قدر ہوتا ہے کہ قدرت کی دی ہوئی قوتوں کو ضائع نہ ہونے دے اور ان کا ارتقا کرے۔ ایک بھرے مدرسے کے ہر طالب علم سے توقع رکھنا کہ وہ اپنے چند بہترین ساتھیوں کے برابر علم و فضل حاصل کرے فعل عبث ہے۔ باوجود محنت و ذکاوت اہم مدرسین اپنے سب طلبا میں ایک ہی پایہ کا فضل و کمال پیدا نہیں کر سکتے۔

ماحولی اثرات بعض وقت فطرتی قوائی کو ضائع کر دیتے ہیں۔ مگر اس طرح ضائع شدہ قوائی کا اثر توریث پر بہت ہی کم ہوتا ہے مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک شخص درخت سے گرا اس کی آنکھ ضائع ہو گئی۔ اس کا بچہ ایک آنکھ کا پیدا نہ ہوگا۔ ہاں بے شک جو نقائص کہ بذریعہ مادہ تولید وراثتاً بچے کو ملے ہیں ان کا ظہور پذیر ہونا ممکنات سے ہے مثلاً شش انگشت کے تولید۔ یا کرنجی آنکھ وغیرہ۔ ماحول کے اُن اثرات کا جو بذریعہ غذا انسان کو پہونچتے ہیں بچے میں منتقل ہونا بہت ممکن ہے۔ اگر ایک شخص مقوی غذائیں کھا کر اور ڈنڈ کسرت کر کے اپنے کو قوی ہیکل بنائے تو اس کے اولاد میں بڑھنے اور قوی ہونے کا مادہ منتقل ہو سکتا ہے نیز اس کے اولاد کا ہم عمر اور ہم ماحول والے بچوں سے زیادہ قوی ہونا تو یقینی ہے۔

منڈال صاحب ایک بڑے فلاسفر ہیں جنہوں نے کئی تجربوں کے بعد یہ امر معلوم کیا ہے کہ مختلف نوع کے نواسل سے عادات و خصائل میں بھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اولاد میں

وہی خصوصیت غالب رہے گی جس کا اثر خود ماں باپ میں زیادہ پایا جائے۔ انہوں نے اپنے تجربوں کے تشریح ایک نقشہ کی مدد سے کی ہے جس کا ضبط تحریر میں لانا اس وقت اس لئے بیکار ہے کہ وہ عام فہم نہیں ہے۔ لیکن ان کی کد و کاوش کا لب لباب درج ذیل ہے

ماں اور باپ مختلف الخاندان

(جسمانی اور دماغی خصوصیات) اولاد کے باپ سے مشابہت ۲۵ فیصدی

" ..... " ماں ..... "

" ..... ماں اور باپ اور ان کے اجداد سے مشابہت ۵۰ فیصدی

اصول منڈال کے لحاظ سے حسب ذیل خصوصیات کا وراثتاً منتقل ہونا ممکن اور بعض حالات میں لازمی ہے۔

(۱) آنکھ کا رنگ (۲) بالوں کا رنگ (۳) بھینگا پن (۴) رنگ کی کور چشمی

(۵) خبط الحواسی (۶) رتوندی NIGHTBLINDNESS

جدید تحقیقات اور متواتر تجربوں سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ والدین کے مادہ تولید میں جوہر علم و فضل نہیں ہوتا اور نہ وہ اولاد میں منتقل ہوتا ہے۔ باپ کو تعلیم دیکر اولاد سے متوقع ہونا کہ اس کے بعد تعلیم و تربیت میں سہولت ہوگی فعل عبث ہے حصول العلم اولاد کو اسی قدر محنت و مشقت کے ضرورت ہے جتنے کہ ان کے والدین نے صرف کی تھی گو تعلیمی عنصر مادہ تولید سے مفقود رہتا ہے مگر فضائے تعلیمی کو باغ و بہار بنانا ہمارا کام ہے جس میں قیام کے وقت ایک طالب علم خوشہائے علم کی، دستیابی سے دامن امید بھرے اور اپنی قوم کے لئے ایک مفید فرد بن سکے بچے کے نفس کو مالا مال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی محبت پسندیدہ۔ مدارس عمدہ اور کتب چنندہ کا اجتماع ہو۔ اس کے ذرائع سیر و سیاحت مہیا کئے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات تعلیم یافتہ اشخاص کی تعلیم یافتہ اولاد ہوتی ہے۔ ماحولی اثرات کا نتیجہ ہے کہ وکیل کا بیٹا وکیل ڈاکٹر کا بیٹا ڈاکٹر ہوتا ہے۔ ملازمت پیشہ کی

اولاد ملازمت کے لئے دوڑتی ہے۔ تاجر کے اولاد تاجر ہوتی ہے۔ ماڑواڑیوں کو دیکھئے کہ پشتہا پشت سے تجارت کرنے چلے آئے ہیں۔

علم کو حاصل کرنے اور دنیا میں ترقی کرنے کے لئے توریث و ماحول کا پچڑا دامن کا ساتھ ضرور ایک بلا دوسرے کے موجودگی کے بیکار محض ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دونوں میں حج کون ہے یورپ اور امریکہ کے سائنس دان توریث کو ترجیح دیتے ہیں جن کے اقوال درج ذیل ہیں۔

گالٹن صاحب کا خیال ہے کہ کسی سوسائٹی میں وہی افراد باعظمت و قابل عزت ہوتے ہیں جن کے توریث اپنے ہم جنسوں کے مقابلہ میں بہتر ہے۔

بنارن ڈاناک صاحب نے چند توام اور چند حقیقی بھائیوں کو لیکر اور ان کو ایک ماحول میں رکھکر تجربہ کیا اور بتلایا ہے کہ توام میں مشابہت جسمانی اور دماغی جس قدر ہوتی ہے اتنی حقیقی بھائیوں میں جو مختلف اوقات کے موجود ہوں نہیں پائی جاتی۔ توام میں مشابہت تقریباً (۸۰) فیصدی اور حقیقی بھائیوں میں (۵۰) فیصدی ہوتی ہے۔

کنڈل صاحب ماحولی ہیں اور ان کے تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ زمانہ حال کے ترقی کا باعث اساعت سائنس ہے۔

گالٹن صاحب نے جن کا ذکر درج بالا کیا جا چکا ہے توریث کے متعلق عمیق تحقیقات کے بعد ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ انہوں نے ۹۷۷ نجیب الطرفین خاندانوں کا معائنہ کیا اور نتیجہ نکالا کہ ماحولی اثرات کے مقابلہ میں وراثتی اثرات بدرجہا مرجح ہیں۔ دوران تحقیقات اُن کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اولاد کے خصوصیات جسمانی و دماغی میں نصف حصہ تو والدین کا ایک چوتھائی دادا کا اور اسی حصہ پردادا کا ہوتا ہے اور اسی طرح بڑھتا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جس طرح ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے اسی طرح رذیلین میں سے کسی ایک کی ذرہ سی خرابی اولاد اور اولاد کی اولاد میں نقائص عظیم کا باعث ہوتی ہے انہوں نے امریکہ کے دو خاندانوں کے حالات پر بابین سنہ ۱۷۷۰ء و ۱۸۷۷ء غور کیا۔ ایک خاندان میکس جیوکس کا تھا جس نے ایک بدطوار عورت سے شادی کر لی تھی

اس کے خاندان میں اس سو برس کے عرصہ میں (۱۲۰۰) افراد پیدا ہوئے جن کی زندگی حسب ذیل نہج پر ختم ہوئی۔

۳۱۰ ..... گداگر

۶۰ ..... چور

۷ ..... خونی

۵۰ ..... عصمت فروش عورتیں

۱۳۰ ..... سزایافتہ

۳۰۰ ..... طفلی ہی میں نذر اجل

۴۴۰ ..... بداطوار و بدچلن

۱۰ ..... نے قید خانہ میں رہکر کاروبار سیکھا

۱۰ ..... نے باہر رہکر کاروبار سیکھا

دوسرا خاندان جناتھن ایڈورڈ کا تھا جس نے ایک شریف عورت سے عقد کیا تھا اُسی بدت صد سالہ میں اُس کے یہاں جملہ (۱۴۰۰) افراد پیدا ہوئے جس کا نتیجہ زندگی درج ذیل ہے۔

۱۲۰ ..... گریجوئیٹس

۱۴ ..... کالج پرنسپل

۱۰۰ ..... پروفیسر

۱۳۵ ..... مصنفین

۱۱۸ ..... نامہ نگار

۱ ..... بزمانہ طفلی نذر اجل

بقیہ نے اپنی عمر اوسط درجہ کے شریفانہ طور پر گزار دی یہ بھی واضح رہے کہ جس زمانہ کی یہ تحقیقات ہے اُسی زمانہ میں تعلیم مفت۔ جبری اور عام تھی یعنی ان دونوں خاندانوں کا ماحول واحد تھا۔

ناظرین مضمون ہذا اس مضمون کا حاصل یہ نکالیں گے کہ صرف توریث ہی انسانی ترقی کا باعث ہے۔ ماحول کوئی چیز نہیں۔ میں ان سے کہونگا کہ ایک درخت کے نشوونما کے لئے بیج۔ زمین۔ پانی۔ ہوا اور روشنی درکار ہے۔ بغیر تخم کے زمین پانی وغیرہ بیکار ہیں اگر زمین ہوا وغیرہ موجود ہیں تو بیج کی ضرورت ہے۔ غرضکہ بلا تخم زمین بیکار ہے اور بلا زمین تخم فضول۔ تخم تو بمنزلہ وراثت کے ہے اور زمین وغیرہ ماحول کے مماثل ہے اگر اچھی قسم کا تخم ہوگا اچھا درخت نکلے گا اور بُرے قسم کا درخت اگائیں گے۔ اگر توریث اچھی ہے تو اولاد میں خصوصیات صفاتی عمدہ پائے جائیں گے اور اگر توریث بُری ہے تو خصوصیات صفاتی بُرے پیدا ہوں گے ماحول ان دونوں کو نشوونما دیگا خصوصیات صفاتی عمدہ رکھنے والے بچہ کو انسان بنا کر فرشتوں کے حدود تک پہونچا دے گا اور خصوصیات صفاتی بد رکھنے کی حالت میں زبردست ڈاکو بدمعاش بدکار۔ بنا دیگا۔ بُرے توریث والے دنیا میں جیلخانوں کے آبادی کا سبب ہیں اور بعد موت دوزخ کے ایندھن بننے کے باعث ہوں گے لہذا توریث اصل چیز اور نہایت پر عظمت چیز ہے اس کے طرف توجہ ہر انسان کو کرنا چاہئے خصوصاً آج کل کے تعلیم یافتہ اور آزاد خیال اشخاص جن کا مطمح نظر ازدواج کے وقت محض مالی فوائد ہوا کرتا ہے۔

خوش قسمتی سے ہند کے آبادی میں کثیر حصہ شریف الخاندان افراد پر منحصر ہے اہل ہنود میں برہمنیں۔ چتری ویش سب کے سب شریف الخاندان ہیں۔ یہ لوگ اپنے نسل کے حفاظت میں ایسے کامیاب ہوئے ہیں کہ شاید ان کے مقابلہ میں عرب قوم بھی ورثہ قدامت خاندانی اور شرافت میں اس وقت دنیا میں ان کا نظیر نہیں۔ مسلمانان ہند شریف الخاندان ہیں ان میں بھی جوہر شرافت اپنے ہندو بھائیوں سے کسی طرح کم نہیں ہے اسی طرح پارسی اور سکھ قومیں بھی شریف ہیں۔ جب ہند کے اکثر و بیشتر آبادی میں عنصر شرافت غالب ہے تو ترقیات علمی اور عملی کا مفقود ہونا اس امر کی بین دلیل ہے کہ یہاں کا ماحول بمقابلہ ممالک یورپ ناقابل اطمینان ہے۔ لہذا جس طرح توریث کی نگہداشت

ضروری ہے اُسی طرح ماحول بھی بہتر اور خوشتر بنایا جا سکتا ہے۔ ماحول کا بہتر بنانا انفرادی کوشش پر مبنی نہیں بلکہ اس کی ترقی کا انحصار محض حکومت کی توجہ غائر پر ہے۔ حکومت کے قلم کی ذرا سی کشش ماحول کو کیا سے کیا بنا سکتی ہے۔ اگر ہند کی حکومتیں تعلیم کو جبری اور عام کر دیں تو بعض گاڑی چلانے والے جن میں جوہر شرافت موجود ہے اپنے وقت کے شکسپیر۔ نیوٹن عالم فاضل اور ضاع بن سکتے ہیں۔ جب تک تعلیم جبری اور عام نہو ہر ہندی پر لازم ہے کہ وہ اپنی نسل کی حفاظت کرے اپنا جوہر شرافت کبھی جانے نہ دے اور اس کہاوت کو اپنے بچوں کے سامنے دہراتا رہے۔

باپ پر پوت پتا پر گھوڑا
بہت نہیں تو تھوڑا ہی تھوڑا

عبدالرشید صدیقی

ہمارا طرز تعلیم

یہ مضمون محمد اعظم خاں صاحب متعلم جماعت انٹرمیڈیٹ عثمانیہ کالج کے قلم سے ہے خود متعلمین کے خیالات اپنے نظام تعلیم کے متعلق نہایت دلچسپی کی چیز ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ہمارے قارئین طلباء کے نقطہ نظر سے طرز تعلیم پر نظر ڈالنے سے نہ صرف محظوظ ہوں گے بلکہ ان کو اس بات کا موقع ملے گا کہ متعلمین کے جذبات جذبات اور تصورات کو سمجھکر تعلیمی امور پر غور کریں۔ ہمیں خوشی ہے کہ محمد اعظم خاں صاحب کی تحریر رواں اور شستہ ہے اور مطالب صاف اور واضح ادا کئے گئے ہیں جس سے یقین ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے مطالب پر غور کیا ہے اور ان کے ادا کرنے میں سنجیدگی اور ادبی ذوق کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔

شریک مدیر

تعلیم کا مقصد اور انسان کا اثر

تعلیم کا مقصد اُن پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لانا ہے جو قدرت نے ہر انسان میں ودیعت کی ہیں اور جس کے ذریعہ انسان کائنات کی ہر طاقت سے اپنے حسب منشا کام لے سکتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک ہر قوم نے اپنی ضرورت اور اقتضائے زمانہ کے مطابق قوت حاصل کرنے کی مختلف طریقوں سے کوشش کی۔ اور اگر حصول قوت کے وہ ذرائع مطابق فطرت ہوئے تو بیشک وہ قوم ترقی کی انتہا منزل تک پہونچ گئی۔ ورنہ حیات کی کشمکش نے اس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ قوموں کا بننا اور بگڑنا، سلطنتوں کا عروج و زوال ملکوں کی بلندی اور پستی۔ عبارت ہے صرف طریق تعلیم کے صحیح یا غلط ہونے سے اور اسی کی بدولت ہر زمانہ میں ایک قوم دوسری سے ممتاز اور برتر رہی ہے۔

ابتداءً انسان قدرت کے پیش بہا خزانوں اور کائنات کی گوناگوں قوتوں سے بالکل بے خبر تھا جس قدر اس کا دائرہ معلومات وسیع ہوتا گیا۔ وہ اُن پر قابو پاتا گیا اس کی قوت بڑھتی گئی۔ اور جب تک دنیا قائم ہے۔ ان انکشافات اور ترقیات کا میدان وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔ چنانچہ اس وقت تک قدرت کے بے انتہا سربستہ راز منکشف ہو چکے ہیں۔ اور دنیا میں وہی قوم سب سے زیادہ موقر و ممتاز ہے جو قدرت کے ان عقدے حل کرنے پر سب سے زیادہ حاوی ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم ہندوستانی حقیقی معنوں میں کس حد تک تعلیم یافتہ ہیں اور اقوام عالم میں ہمارا کیا پایہ ہے؟

اگر ہم درحقیقت اس کشمکش حیات میں سب سے پیچھے ہیں تو اس کے معنی یہ ہے کہ ہم قدرت کی عطا کی ہوئی طاقت سے اچھی طرح کام نہیں لے سکتے۔ بالفاظ دیگر ہماری تعلیم ناقص ہے اس مسئلہ پر غور کرنا ہمارے لیے نہایت ضروری ہے تاکہ ہم اس قعر ذلت سے نکل سکیں جس میں موجودہ تعلیم کے باعث پڑے ہوئے ہیں اور ہر آنے والا دن ہمیں اور گہرائی میں دیکھکر نہایت افسوس ہوتا ہے کہ ہم میں ہماری قومی کشتی صحیح سلامت

تجویز ہوا تھا۔ یہ بیشک صحیح ہے کہ ہماری موجودہ حالت نہایت پست ہے لیکن اس کا سبب یہ نہیں کہ ہم میں تعلیم کا چرچا نہیں یا اگر چرچا ہوئی ہے بلکہ اصلیت یہ ہے کہ ہمیں حقیقی تعلیم دی ہی نہیں جارہی ہے۔ اور جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہ تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں بڑی بڑی عمارتوں اور اعلیٰ درجہ کے فرنیچر کا نام تعلیم نہیں بلکہ تعلیم کچھ اور ہی شئے ہے اور موجودہ نظام تعلیم کی روح کو چھوڑ کر صرف ڈھانچہ سے بحث کر رہا ہے اسی لئے ہم اپنے ہمعصروں میں حد درجہ حقیر و ذلیل بنے ہوئے ہیں۔ محمد اعظم خاں

باقی آئندہ

تبصرے

رپورٹ سالانہ مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ گلبرگہ کوئی ایسا سال نہیں گزرتا جب کہ صدر مدرس تختہ سالانہ کی لازمی ترتیب کے ساتھ اپنے مدرسہ کے مختصر حالات نہ لکھتا ہو یا سالانہ جلسہ کے وقت حاضرین کی خدمت میں مدرسہ کی کیفیت نہ پیش کرتا ہو لیکن جہاں تک ہمارا علم ہے ممالک محروسہ میں کسی صدر مدرس نے اپنے مدرسہ کی سالانہ رپورٹ کے طبع کرانے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ مولوی عبدالستار سبحانی صاحب بی اے بی۔ٹی نے اپنے مدرسہ کی سالانہ رپورٹ کو طبع کر کے اس کی مفت تقسیم کو حاضرین جلسہ تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس کا ایک نسخہ بغرض تبصرہ ہم کو بھی عنایت فرمایا۔ رپورٹ مختصر مگر جامع ہے لیکن اس کا چھاپہ خراب اور کاغذ خراب تر ہے۔ تعداد طلبا سات سو ہے جو غالباً اضلاع کے مدارس میں سب سے زیادہ ہے لیکن افسوس کہ طبقہ فوقانیہ میں تعداد کم ہے جس کا صدر مدرس صاحب کو بھی اعتراف ہے۔ کمی تعداد کی جو یہ وجہ بتلائی گئی ہے کہ ابھی تک تعلیم انگریزی کی اہمیت کو کماحقہ محسوس نہیں کیا یہ درست نہیں۔ اگر کارپردازان مدرسہ ابتدائی تعلیم ہی سے تعلیم انگریزی پر زور دیں جو اُن کا عین فرض ہے تو طبقہ فوقانیہ

نہ تو کمی تعداد ہی کی شکایت رہے گی اور نہ اس امر پر کف افسوس ملنے کا موقع رہے گا
اردو ڈل کامیاب کرنے کے بعد جو دو چار سال تعلیم کے باقی رہتے ہیں بالکل ضائع ہو جاتے
مدرسہ فرقانیہ عثمانیہ گلبرگہ عمدہ نتائج امتحان کے لئے مشہور ہے۔ یہ دیکھکر خوشی ہوتی
۱۳۳۴ف کے نتائج اعلیٰ رہے۔ شیخ احمد امتحان مڈل کی زبان عربی میں اول آیا چنانچہ سررشتہ
اس کو ۵ روپیہ بطور انعام عطا ہوئے۔ سال حال میٹرک میں واجد علی زبان فارسی
اول رہا اور غوث محی الدین بدرجہ اعزازی کامیاب ہو کر ۵ روپیہ ماہانہ وظیفہ اور
محبوب علی عربی میں اول آکر ۵ روپیہ ماہانہ وظیفہ کے عثمانیہ کالج میں مستحق ہوئے۔ یہ نتائج
حقیقت میں صدر مدرس صاحب اور ان کے اسٹاف کے لئے قابل مبارکباد ہیں۔

تکمیل نصاب مقررہ کے علاوہ طلبا کے لئے ایک دار الاخبار۔ نمائش تعلیمی اور
انجمن مباحثہ کا قیام بھی ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بابت اس قدر اختصار سے کام
لیا گیا ہے کہ کوئی رائے نہیں دی جا سکتی۔

ورزش جسمانی کا خاطر خواہ انتظام معلوم ہوتا ہے۔ اس مدرسہ کی یہ خصوصیت ہے کہ
پٹیل پٹواری اس کی مالی مدد کرتے اور اس کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں صدر مدرس صاحب کی
صفات کو نمایاں کرتی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں یہ مدرسہ مولوی عبدالستار سبحانی صاحب کی
زیر صدارت ترقی کر کے ایک اعلیٰ پایہ پر پہونچے گا۔

جونیر کورس آف اردو انگلش ٹرانس لیشن JUNIOR COURSE OF URDU ENGLISH TRANSLATION

مولوی نادر الزماں صاحب بی۔ اے۔ بی ایل۔ بی۔ ٹی نے جو ہائی اسکول گلبرگہ میں
مدرس صدر ہیں اردو انگریزی ترجمہ پر یہ کتاب مدارس ثانویہ کے لئے لکھی ہے۔
اس کتاب کی ترتیب نفسیاتی اصول پر کی گئی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب ہمارے

مدرسین اور طلبا دونوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔

ترجمہ ایک نہایت نازک چیز ہے اور ایسی قوموں کو جن کی زبانیں علمی پایہ رکھتی ہیں اور جنہیں اپنی زبانوں کو اعلیٰ خیالات سے مالا مال کرنے کے لئے دوسری زبانوں سے فیض پانے کی ضرورت ناگزیر ہوتی ہے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ابتدا ہی سے بچوں کو ترجمہ کرنا صحیح اصول پر سکھایا جائے۔ مولوی نادر الزماں صاحب نے اس نقطۂ نظر سے نہایت ہی کارآمد کتاب تیار کی ہے اور ہمارے اساتذہ اور طلبا کو چاہئے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ کتاب اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہے قیمت ۱۲ ار۔ مصنف صاحب سے مل سکتی ہے۔

شریک مدیر

شذرات

ترکی خواتین نے حکومت سے یہ درخواست کی ہے کہ جملہ مساجد ہفتہ میں ایک یوم ان کے لئے مخصوص کردی جائیں تاکہ وہ ایک جگہ جمع ہوکر عبادت کریں اور اس کے ساتھ ہی اپنے طبقہ کے فلاح وبہبود اور اصلاح پر غور و فکر کریں۔

قسطنطنیہ کی مونی سپالٹی نے حکم دیا ہے کہ کوئی ترک اپنی لڑکی کی شادی میں کپڑوں کے دو جوڑوں سے زیادہ جہیز نہ دے اور دعوت میں رقم معینہ سے زیادہ خرچ نہ کرے

کلکتہ میں طلبا کا طبی معائنہ کرنے سے یہ افسوس ناک امر ثابت ہوا کہ ہر نو طلبا میں سے ایک کی صحت خراب اور ان کے قوا ایسے کمزور ہیں کہ وہ فوجی خدمت انجام دینے کا قابل

نہیں رکھتے۔

مدراس کی حکومت نے عرصہ ہوا یہ تصفیہ کر دیا کہ ایک اور یونیورسٹی آندھرا علاقہ میں قائم کی جائے لیکن یونیورسٹی کا مستقر اب تک تصفیہ طلب تھا۔ تازہ ترین اطلاع مظہر ہے کہ بجواڑہ یونیورسٹی کا مرکز قرار دیا گیا ہے حالانکہ راجمندری یا وزیکاپٹم کے لئے بہت زور دیا گیا تھا۔

عثمان آباد میں ارذل اقوام کا ایک تحتانیہ مدرسہ قائم کیا گیا ہے جس کا صدر مدرس مڈل کا سیاب ڈھیڑ ہے۔ صوبہ گلبرگہ میں یہ اپنی قسم کا پہلا مدرسہ ہے۔

مدارس یونیورسٹی نے تصفیہ کیا ہے کہ ایک شعبہ السنہ مشرقیہ کے لئے قائم کیا جائے فی الحال اس کے تین حصے ہوں گے۔ ایک سنسکرت دوسرا عربی فارسی اور اردو اور تیسرا کنڑی تامل اور تلنگی کے لئے

کلکتہ یونیورسٹی کی مقرر کردہ میٹریکولیشن کمیٹی نے نہایت غور و فکر کے بعد یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مادری زبان ذریعہ تعلیم قرار دی جانی ضروری ہے۔ اس کی تجاویز حسب ذیل ہیں۔

(۱) بجز زبان انگریزی اور تاریخ انگلستان تمام مضامین کی تعلیم اور امتحان مادری زبان میں ہونا چاہئے۔

(۲) امیدواروں کے لئے عمر کی قید نہ ہونی چاہئے البتہ کالج میں پندرہ برس سے کم عمر لڑکوں کو شریک نہ کیا جائے۔

(۳) تاریخ جغرافیہ لازمی مضمون قرار دئے جائیں۔
(۴) بوقت شرکت امتحان میٹرک ہر امیدوار کو یہ صداقت نامہ پیش کرنا چاہئے کہ اس نے کچھ عرصہ تک کوئی دستی کام مثلاً نجاری۔ خیاطی۔ پارچہ بافی وغیرہ سیکھا ہے

[illegible] حلقوں میں جو ورزش جسمانی کے دلدادہ ہیں سینڈو کے انتقال کی خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی جائے گی ماجوصوف کے ڈمبل ایسے مقبول عام ہوئے کہ ان کے نام مشہور عالم ہوگیا اور اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک کہ ڈمبل کے استعمال کرنے والے دنیا میں رہیں گے۔

تعلیمی حالت اور ملک کی پیداوار میں بہت گہرا تعلق ہے لیکن افسوس ہمارے وطن میں اس کا بالکل احساس نہیں۔ ہندوستان میں جہاں تقریباً تیرہ فی صدی [illegible] نوشت وخواند کرسکتے ہیں ایک ایکڑ زمین میں سولہ من سے کم گیہوں پیدا ہوتا ہے لیکن انگلستان یا سوئٹزرلینڈ میں جہاں ہر شخص میں لکھ پڑھ سکتا ہے۔ اسی قدر رقبہ میں [illegible] چوبیس اور تیس من گیہوں ہوتا ہے

ہندوستان کی بے پایاں دولت کے افسانے تمام دنیا میں مشہور ہیں لیکن حقیقی حالت امریکہ کے ایک پروفیسر نے ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ۱۹۱۴ء میں مندرجہ ذیل ممالک میں فی کس یہ آمدنی تھی۔

امریکہ میں فی کس [illegible] روپیہ کا زر
انگلستان میں فی کس [illegible] "
فرانس " [illegible] "

جرمنی میں فی کس	ایک صد	روپیہ کا مدار
اٹلی	"	ساٹھ " "
جاپان	"	نوے "
ہندوستان	صرف	"

ایک جاپانی ماہر سائنس مسٹر ناگا اوکا نے اعلان کیا ہے کہ اس نے پارہ کو بجلی سے جلا کر سونا بنا لیا ہے۔

مہینوں کی تیاری کے بعد مدرسہ فوقانیہ نظامیہ گلبرگہ کا سالانہ جلسہ نہایت تزک اور احتشام کے ساتھ ۱۹ مراد ۲۰ مراد کو مدرسہ کے صحن میں زیر صدارت جناب نواب ناظر یار جنگ بہادر منعقد ہوا۔ جلسہ کا پروگرام بہت لمبا چوڑا تھا جس کا سلسلہ دو روز تک جاری رہا۔ جلسے کے ساتھ ایک نمایش تعلیمی بھی کی گئی تھی جس سے مولوی عبد الستار سبحانی صاحب صدر مدرس آنریری مدرسہ کا حسن انتظام، مدرسین کی سلیقہ اور طلبا کی دلچسپی کا پتہ چلتا تھا۔

اس سال کے جلسہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ طلبا نے ایک ایسا ڈراما کیا جو المعلم کے ایک قابل ہمدرد مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب نے خاص اس موقع کے لئے تیار کیا تھا۔ اس کا عنوان ہے بی۔ اے پاس تھا۔ اس کی کتھا یہ تھی کہ دو بی۔ اے پاس نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں ان میں سے ایک تو کچھ پریشانی اٹھا کر تجارت کی طرف رجوع ہو کر مالا مال ہو جاتا ہے لیکن دوسرا نوکری کے پھندے میں پھنس کر غربت اور عسرت کیساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ ان دونوں کا مکالمہ پر لطف اور معنی خیز ہے۔ نوکری کی تلاش میں جو عہدہ دار اور اہلکاروں کی حالت دکھائی دیتی ہے وہ حقیقت میں قابل دید ہے۔ ڈراما خوب ہے لیکن اندر سبھا کے پردوں اور بناوٹی ایکٹنگ نے بہت کچھ اس کی خوبیوں کو کم کر دیا۔

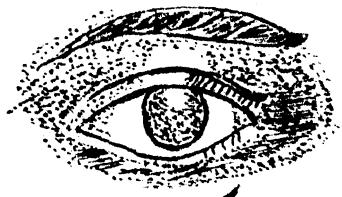

آنکھ کی تندرستی

چند ضروری باتیں

بہت چمکیلی چیزوں کو زیادہ دیر تک گھورنا نہیں چاہیئے۔

روشنی ٹھیک ہونی چاہیئے یعنی نہ تو ضرورت سے زیادہ تیز ہو اور نہ بہت دھندلی دھندلی روشنی پیچھے سے اس طرح آنی چاہیئے کہ روشنی کتاب پر پڑے آنکھ پر نہ پڑے۔ مثلاً کھڑکی کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھا جائے تو یہ بات حاصل ہوگی۔

مہین خط یا موٹے موٹے حروف والے چھاپے کی کتاب یا اخبار سے بچنا چاہیئے ٹائپ کی صورت میں حروف کی اونچان (¼) اور موٹائی (¼) ملی میٹر سے کم نہ ہونی چاہیئے۔

سامنے سے دھوپ آنکھوں پر پڑتی ہو یا چھٹپٹے کا وقت ہو تو پڑھنا نہیں چاہیئے۔

بچوں کی مدرسہ کی پڑھائی تندرستی کا لحاظ کرتے پانچ یا چھ برس کے سن سے قبل شروع نہ ہونی چاہیئے

کتب بینی کے دوران میں آنکھوں کو کتاب پر سے ہٹا کر ان کو آرام دینا ضروری ہے جب صفحہ الٹنا ہو تو اس وقت اس طرح آرام بھی دے لیا جائے۔

ریل یا گاڑی میں یا پلنگ پر لیٹ کر کبھی نہ پڑھنا چاہیئے۔

لکھنے اور پڑھنے کے وقت سر اور جسم کو سیدھا رکھنا چاہیئے میز اور کرسی ایسی ہونی چاہیئے کہ بیٹھنے میں آرام ملے اور بچوں کو کتاب پر جھکنا نہ پڑے بچوں کو یہ عادت ڈالنی چاہیئے کہ

وہ لکھنے یا پڑھنے میں جھکیں نہیں۔ میز اتنی اونچی ہونی چاہئے کہ آنکھ میں اور اس میں بارہ سے اٹھارہ انچ تک فاصلہ رہے۔ میز کا تختہ اتنا ڈھلواں ہو کہ ۳۰ درجہ کا زاویہ بنائے تاکہ جھکنا نہ پڑے گردن کی کبھی کمر کی تکلیف جو مدرسہ کے بچوں میں پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ نشست کے صحیح طریقے سے اُستاد اور شاگرد دونوں غفلت برتتے ہیں۔

بڑی دانشمندی کی بات یہ ہے کہ **فطرت کی انتباہ پر کان دھرنا چاہئے**

فطرت حسب ذیل طریقوں سے تنبہ کرتی ہے۔

آنکھوں میں پانی کا آنا۔ آنکھوں کا جلنا۔ روشنی کا نہ سہنا۔ کھجلی۔ سُرخی۔ پلکوں کا جھڑنا ایک آنکھ کا دوسری سے چھوٹا ہونا۔ پھڑکنا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور جھریاں ترچھاپن پیشانی پر شکنیں۔ تلاتا۔ اعصابی بے چینی۔ آنکھیں مچ مچانا۔ دوران سر۔ دردِ سر کتابوں سے نفرت۔ پڑھنے میں اُونگھنا۔ سرعت۔ توجہ کا انتشار۔ بدمزاجی۔ بھول پسند۔ تکان پڑھنے کی چیزوں کو ۱۴ انچ سے دور یا پرے رکھنا۔ رات کو مہین خط یا ٹائپ کے پڑھنے میں تکلف آنکھوں میں ترمرے یا کالے دھبوں کا پھرنا۔

مشیر

ڈاکٹر کے۔ پی۔ پوپٹ

ایل آر سی۔ پی ایس۔ ایل۔ ایم (ایڈنبرا)

جراح چشم لندن

ہارڈی اینڈ کمپنی

ماہرین نظریات و عینک ساز۔ لندن

جیمس اسٹریٹ۔ سکندر آباد (دکن)

رسالہ **زمانہ** کانپور

"رسالہ زمانہ" اردو کا بہترین باتصویر ماہواری رسالہ ہے جو منشی دیا نرائن صاحب نگم کی ایڈیٹری میں عرصہ ۲۲ سال سے روز افزوں ترقی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ زمانہ میں ملک کے نامور انشاپردازوں اردو کے مسلم الثبوت اساتذہ کے مختلف مباحث پر مفید اور قابل دید مضامین درج ہوتے ہیں یہ رسالہ کسی خاص قوم یا فرقہ یا مذہب کا طرفدار نہیں ہے بلکہ اسکو ملک کی عام بہبودی مذاق سلیم کی ترقی اور معلومات کی توسیع مطمح نظر ہے یہی وجہ ہے کہ یہ نہایت کامیابی کیساتھ ۲۲ سال سے ابتک جاری ہے پانچ روپیہ منی آرڈر بھیجکر سال بھر کے لئے خریدار بنجائے یا پہلا پرچہ وی پی طلب کیجئے۔

منیجر رسالہ زمانہ کانپور

رجسٹرڈ نمبر سرکار عالی نشان ۲۱
اجرا ڈپٹی انگریزی ایم نشان ۱۰۶۵
جلد دوم
نمبر ۶

المعلم

ماہ بہمن سنہ ۱۳۳۵ ف

مدیر..... محمد سجاد مرزا ایم۔ اے (کنٹب) .....

شریک مدیر..... محمد عظمت اللہ خاں۔ بی۔ اے .....

اعظم اسٹیم پریس چاپنا

حیدرآباد دکن

*

ارباب قلم

التماس

چونکہ المعلم نے کامیابی کے ساتھ کچھ اوپر ایک سال سے پبلک اساتذہ کی تعلیمی خدمت گذاری کی ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس اہم کام میں سررشتہ تعلیمات سرکار عالی کے اکثر ارباب قلم نے قلمی اعانت کرکے مدیروں کا ہاتھ بٹایا۔ ان مسنوں اور دیگر ارباب سے جن کو ابھی تک اس اپنے رسالہ کی قلمی اعانت کا موقع نہیں ملا یہ التماس ہے کہ المعلم کے ذریعہ اپنے مضامین سے اپنے ہم فن بھائیوں اور عامۃ الناس کو تعلیمی فائدہ پہونچانے کی طرف توجہ فرمائیں۔ المعلم نظری اور عملی دونوں طرح کے مضامین خوشی سے طبع کرے گا۔ ایسے مضامین کو خصوصیت کے ساتھ المعلم میں جگہ دی جائے گی جن میں مقامی ماحول کو پیش نظر رکھکر درس و تدریس کے طریقوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہو۔

مضامین فولس کاپ کی تقطیع پر ہوں اور نصف حصہ پر لکھے جائیں۔ یہ ضرور نہیں کہ خط خوشنویسانہ ہو لیکن واضح اور کھلا کھلا ہو۔

شریک مدیر

اخبار تعلیم لاہور ہر قسم کے تعلیمی معاملات پر آزادانہ بحث کرنے والا مدرسین کا وکیل اور رحمان طلبا کا معاون و مددگار افسران محکمہ تعلیم کا خیر خواہ سررشتہ تعلیم کا مشیر ہر قسم کے علمی عملی اخلاقی طبی وغیرہ مضامین کا مخزن ہفتہ وار اخبار تعلیم لاہور سے شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ چار روپیہ ششماہی دو روپیہ آٹھ آنہ سہ ماہی ڈیڑھ روپیہ

منشی طالب علی صاحب پابند قریشی ایڈیٹر اخبار تعلیم لاہور سے طلب کیجئے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مندرجات

المعلم

(۱) تدریس کی ناکامیابی۔	از مولوی محمد مبین صاحب صدر مدرس مدرسہ انوار عثمانیہ عثمان آباد	(۱ تا ۷)
(۲) تاریخ اور اُس کی تدریس۔	از مولوی مرزا عبدالحمید بیگ صاحب بی اے	(۸ تا ۱۴)
(۳) ہمارا طرز تعلیم نمبر ۲۔	از مولوی محمد اعظم خانصاحب متعلم جماعت انٹرمیڈیٹ عثمانیہ کالج	(۱۴ تا ۱۹)
(۴) دھوپ گھڑی۔	از مولوی عصمت اللہ بیگ صاحب عصمت	(۱۹ تا ۲۳)
(۵) تبصرے۔	شرکت مدیر	(۲۳ تا ۲۶)
(۶) شذرات۔		(۲۷ تا ۳۲)

جلد ۲ | بابتہ ماہ بہمن سنہ ۱۳۳۵ ف | نمبر ۶

تدریس کی ناکامیابی

"تدریس بماعت کا منشا یہ ہے کہ سعی و کوشش کے قلیل ترین صرف سے کثیر ترین مفید و سبق آموز معلومات کا احضار ہو سکے"۔ بکل۔

ایک تمثیل درس تدریس کی تمثیل سیاحت سے دیجا سکتی ہے متعلم بمنزلہ اس مسافر کے ہے جو کسی اجنبی ملک میں سیر کر رہا ہو۔ اور معلم بحیثیت رہبر کے ہے مسافر نہ منزل مقصود ہی سے واقف ہے اور نہ وہاں پہنچنے کے راستے سے لیکن رہنما جو ہر دو سے واقفیت تامہ رکھتا ہے نظام سفر اس طرح مرتب کرتا ہے کہ سہل ترین راستہ سے منزل مقصود تک مسافر کی رہنمائی ہو جائے

رہبر کا نظام سفر مدرس کے اس لائحہ عمل کے مشابہ ہوتا ہے جس کے تحت وہ مختلف مضامین کی
تبویب و تقسیم کرتا ہے اور عنوانات متنوعہ کو منطقی اور نفسیاتی اصول پر ترتیب دیتا ہے
اگر مسافر خود سفر نہ کرے بلکہ بیٹھا بیٹھا راستہ کی ماہیت اور منازل کی نوعیت کے بارے میں
رہبر کا صرف بیان سنا کرے تو وہ کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا ہے اسی طرح متعلم اگر
ذاتی سعی سے کام نہ لے اور مدرس کے بتائے ہوئے راستہ پر خود گامزن نہ ہو تو اس کی
تعلیم کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

مندرجہ بالا تمثیل سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تدریس صرف اس وقت موثر اور
کامیاب کہی جا سکتی ہے جب کہ وہ طلبا کی ذہنی رہنمائی کے علاوہ ان کے دماغ کے فاعلی
حصہ کو بیدار اور متحرک کرے لیکن اس ذہنی رہبری اور نفسی بیداری و تحریک کا انحصار
کئی امور کا تکمیل پر ہے جن میں سے حسب ذیل مشہور ہیں:- (۱) انتخاب و ترتیب مواد تعلیم
(۲) طریقہ احضار مواد۔ (۳) وسائل تعلیم۔ (۴) امور انتظامی۔ اور (۵) شخصیت معلم۔ ان امور کی
خامی یا نامناسبت ہمیشہ ناکامیابی تدریس کا باعث ہوا کرتی ہے۔

ان ناکامیابی تدریس بلحاظ مواد تعلیم (۱) **انتخاب مواد:**- اس چھوٹے سے مضمون میں
ہر جز کی تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ پھر بھی ہم اس کے مختصر اور مجمل بیان سے یہ دکھانا
چاہتے ہیں کہ کس طرح اس کا نامناسب استعمال تدریس کو غیر موثر بنا دیتا ہے درس کی کامیابی
ایک بڑی حد تک مواد تعلیم کے موزوں اور مناسب انتخاب پر منحصر ہے بوقت انتخاب مواد
مدرس کو چاہئے کہ وہ طلبا کے اوسط ارتقائے ذہنی کا صحیح نقشہ پیش نظر رکھے۔ اور نہایت
حزم و احتیاط کے ساتھ ایسا مواد منتخب کرلے جو متعلمین کے لئے مفید اور کارآمد ہونے کے علاوہ
ان کی ذہنی سمائی کے مطابق بھی ہو۔ بہ الفاظ دیگر مواد منتخبہ طلبا کی عمر اور ادراک کے مطابق
ہونا چاہئے۔ تاکہ وہ ان کی معلومات سابقہ کے ساتھ مربوط ہو سکے۔ اگر مواد تعلیم حد درجہ سہل ہو تو
لڑکے اس طرف زیادہ توجہ نہیں دیں گے۔ کیونکہ ان کا خیال ہوگا کہ انہیں کوئی نئی بات نہیں بتائی

جارہی ہے۔ بلکہ صرف ان کی گزشتہ واقفیت کا اعادہ ہو رہا ہے اس کے برعکس اگر سبق نہایت سخت اور مشکل ہو تو طلبا اس کے سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ لہٰذا ان کا ذوق و شوق زائل ہو جائے گا۔ ان کی رغبت اور دلچسپی جاتی رہے گی۔ اور ان کا جوش عمل سرد پڑ جائے گا علاوہ بریں ایسا سبق ان کی دماغی تکان اور ماندگی کا باعث ہوگا۔ الغرض ہر دو صورتوں میں تدریس پُر تاثیر نہ ہوگی۔

(ب) ترتیب مواد:۔ مواد تعلیم کے متعلق دوسرا اہم نکتہ اس کی مناسب تقسیم و ترتیب ہے۔ مدرس کو چاہئے کہ پہلے وہ مضمون تعلیم کی تبویب کرے اور پھر ہر باب کو بتدریج چھوٹے چھوٹے عنوانات و حصص پر تقسیم کرتا جائے۔ یہاں تک کہ تقسیم کا یہ سلسلہ انفرادی اسباق کے خرد ترین زینہ پر جا کر ختم ہو۔ اصول تقسیم ایسا ہونا چاہئے کہ ایک حصہ دوسرے سے مستنبط ہوتا ہو اور تمام حصوں میں باہمی ارتباط اور لگاؤ ہو۔ تاکہ جمیع اجزا کی شیرازہ بندی کرنے سے ایک مکمل علم کی تشکیل ہو۔ یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ مختلف اسباق کی ماہیت مختلف ہوا کرتی ہے لیکن بعض وقت ایک ہی مضمون کے مختلف اسباق کی نوعیت میں اغراض اور مقاصد کے تغیر و تبدل سے اختلافات رونما ہوتے ہیں۔ بہرحال مضمون سبق کی ترتیب ایسی ہونی چاہئے کہ نئے خیالات و معلومات جو طلبا کو پیش کئے جائیں ان کی توضیح و تشریح متعلمین کی معلومات سابقہ کے حوالہ سے ہو سکے۔ طلبا کی گزشتہ واقفیت اور ان کی ذہنی سمائی و دماغی صلاحیت جاننے کے لئے لڑکوں کے ارتقائے نفسی کا علم ضروری ہے لہٰذا ہر مدرس کو نفسیات میں کچھ نہ کچھ دخل رکھنا لازم ہے۔ طلبا میں شوق اور دلچسپی پیدا کرنے اور سبق کو سہل الفہم بنانے کے لئے مدرس کو چاہئے کہ درس دیتے وقت آسان سے مشکل کی طرف بسیط سے مرکب کی طرف معلوم سے نامعلوم کی طرف اور مقروں سے مجرد کی طرف چلے۔ لیکن اس اصول پر کاربند ہونے کے لئے پہلے مواد تعلیم کی مناسب تقسیم و ترتیب ضروری ہے۔ بہرحال مواد تعلیم کی موزوں اور مناسب تقسیم و ترتیب کو درس کی کامیابی میں بہت بڑا

دخل ہے۔

۲۔ ناکامیابی تدریس بہ لحاظ طریقہ تعلیم | (ا) اظہار مقصد:۔ جب ہم مواد تعلیم سے قطع نظر کر کے طریقہ تعلیم پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر کے بہ نسبت ثانی الذکر زیادہ اہم ہے مواد تعلیم کا انتخاب اور تقسیم و تربیت کیسی ہی خوبی اور ہوشیاری سے کیوں نہ کی جائے۔ لیکن جب تک اس کے استحضار کا طریقہ عمدہ نہ ہوگا۔ تدریس کبھی پُر تاثیر اور سود بخش نہیں ہو سکتی۔ بہر کیف طریقہ تعلیم کے لحاظ سے درس کا پہلا زینہ اظہار مقصد ہے یعنی معلم کو چاہئے کہ وہ سب سے پہلے سبق کی غرض و غایت واضح اور موثر طور سے طلبا کے ذہن نشین کرائے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنے چاہئیں کہ سبق سے حاصل ہونے والے تمام قریب و بعید مفید نتائج سے طلبا کو آگاہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ انہیں صرف یہ سمجھا دینا کافی ہے کہ جو نئی معلومات بتائی جا رہی ہیں وہ کار آمد ہیں اور اس لئے قابل تحصیل ہیں مقصد کے متعلق طلبا کی واقفیت ہمیشہ تیرہ و تاریک ہوا کرتی ہے۔ لیکن معلم کو اس کا صاف اور واضح علم ہونا چاہئے۔ ورنہ اس کی رہبری حصول مقصد میں ناکام ثابت ہوگی۔ یا اگر کسی طرح مطلب حاصل بھی ہو جائے تو وہ بہت دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد اتفاقی طور سے ہوگا۔

(ب) تعجیل آغاز:۔ سبق کا مقصد طلبا کے ذہن نشین کرنے اور انہیں اس کے حصول کی رغبت اور خواہش پیدا کرنے کے بعد مدرس کو چاہئے کہ سبق شروع کرنے میں عجلت کرے۔ ورنہ آغاز سبق کی تعویق اظہار مقصد کے پیدا کردہ اشتیاق و دلچسپی کو زائل کر دے گی۔ بسا اوقات آغاز سبق میں تاخیر کا باعث "روایتی تمہید" ہوا کرتی ہے۔ "روایتی تمہید" وہ قدیم طریقہ مراد ہے جس کے مطابق مدرس طلبا سے اس شئے کا نام اخذ کرنا چاہتا ہے جس پر سبق دینا مقصود ہوتا ہے۔ وہ طرح طرح کے سوالات کرتا ہے تاکہ طلبا کے قیاسی جوابات میں کسی طرح شئے مطلوبہ کا نام یا اشارہ آجائے۔ اگر ناکامیابی ہوئی تو معلم صاحب پہلے بھی ہو جایا کرتے ہیں چنانچہ ذیل کا لطیفہ اس طرز پر پوری روشنی ڈالتا ہے۔

ایک مدرس صاحب جماعت صغیر کے بچوں کو بساعت اسباق الاشیاء "دال" پر درس دیا چاہتے تھے۔ انہوں نے سلسلہ سوالات اس طرح شروع کیا۔

استاد ..... آج تم کیا کھا کر آئے ہو؟

شاگرد ..... گوشت روٹی۔

ا ..... رات کو تم نے کیا کھایا تھا؟

شا ..... خشکہ اور سالن۔

ا ..... اور کل دن کو؟

شا ..... پراٹھے اور خاگینا۔

ا ..... اس کے پہلے؟

شا ..... قلیہ چپاتی۔

ا (جھنجلا کر) ارے کمبخت دنیا بھر کی چیزیں ڈکوسلیں کبھی "دال" روٹی بھی کھائی ہوتی۔

الغرض آغاز سبق کا یہ طریقہ بالکل مہمل اور فضول ہے۔

دوسری شئے جو درس کی ابتدا میں وقت و کوشش کی بربادی کا باعث ہوا کرتی ہے وہ "طویل تفصیلی تیاری" ہے۔ اس کے تحت معلم بذریعہ طویل سلسلہ سوالات طلبا سے وہ تمام معلومات اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جن کا مضمون زیر درس سے ذرہ برابر بھی لگاؤ ہوتا ہے اکثر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبا کی توجہ آگے بڑھنے سے رک جاتی ہے۔ ان کی دلچسپی مفقود شوق زائل۔ اور تمام سعی و کوشش رائیگاں ہو جاتی ہے۔

(ج) **باضابطہ رفتار**۔ موثر تعلیم اس امر کی مقتضی ہے کہ نہ صرف آغاز سبق کے وقت بلکہ پورے دوران درس میں تضیع وقت اور بربادی سعی سے احتراز کیا جائے۔ پہلے مضمون درس کی تقسیم و ترتیب کرنی چاہئے۔ زاں بعد اس کے استحضار کے بہترین طریقہ پر

غور و خوض کرنا چاہیئے۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے نہایت اہم اور ضروری شرط یہ ہے کہ طلبا کی ذہنی رسائی اور دماغی صلاحیت کے مطابق معلومات کے جرعے پیش کئے جائیں۔ اکثر حالتوں میں تقطیع اوقات کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مدرس کسی خاص واقعہ کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے اس پر اس قدر تفصیلی اور طویل بحث کرنے لگتا ہے کہ وہ جادۂ مستقیم سے بہت دور بھٹک جاتا ہے۔ بہرحال جب کبھی معلم اصل موضوع سے بہت دور گریز کر جائے تو مناسب ہے کہ وہ بہت جلد اس طرف واپس آنے کی کوشش کرے۔ لیکن ایسا کرنے میں حزم و احتیاط شرط ہے۔ کیونکہ اگر معلم خود کو جادۂ مستقیم سے دور ہٹا ہوا پاکر یکایک رک جائے اور فوراً اصل موضوع پر عود کر آئے تو خیالات کا تسلسل زائل ہو جائے گا اور طلبا کی معلومات کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

(۵) **تحریک سعی ذاتی**:۔ کامیاب تدریس کی ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ وہ طلبا کی ذاتی سعی کی محرک ہو۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ طلبا کو بالکل چھوڑ دیا جائے کہ وہ ہر شئے بذات خود بغیر کسی رہنمائی کے دریافت کر لیا کریں کیونکہ یہ ناقابل عمل ہے۔ اگر متعلمین کو اسی طریق پر کاربند ہونے کے لئے بغیر کسی امداد رہبری کے چھوڑ دیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بین تحقیقات وہ بسا اوقات صداقت کی شاہراہ سے کوسوں دور بھٹک جائیں گے یا اگر خوش قسمتی سے کوئی سادہ اور معمولی صداقت دریافت بھی کریں گے تو اس کے لئے وقت اور کوشش کا کثیر صرفہ درکار ہوگا۔ لیکن اس اسراف اور فضول خرچی کے لئے طلبا کے پاس نہ وقت اور نہ سعی کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ علاوہ بریں زمانہ سلف کے موجد و مخترع کی دریافت و اکتشاف سے فائدہ نہ اٹھا کر ہر شئے کی تحقیقات کے لئے بذات خود ساعی ہونا بڑی بیوقوفی ہے۔ لیکن اس کے برعکس طلبا کی ذاتی سعی سے کام نہ لے کر ہر شئے پکی پکائی ان کے سامنے رکھ دینا بھی فاش غلطی ہے۔ کیونکہ اس سے طلبا، دوسروں کے خیالات جذب کرنے کے عادی ہو جائیں گے۔ ان میں خود غور و خوض کا مادہ پیدا نہ ہوگا۔ ان کے

قوائے دماغی کی ترقی رک جائے گی۔ ان کے تجربہ و مشاہدہ۔ استدلال و استخراج ایجاد و اختراع۔ اکتشاف و انکشاف کا مادہ تلف ہو جائے گا۔ وہ ہر مشکل کے اندفاع کے لئے مدرس پر بھروسہ کرنے کے عادی ہو جائیں گے۔ اور خود کچھ کوشش نہیں کریں گے۔ لہٰذا معلم کو چاہئے کہ لڑکوں میں خود سے کام کرنے کی عادت ڈالے مدرس کو لازم ہے کہ اپنے زیر نگرانی طلبار کو تجربہ و تحقیقات کرنے دے اور جب ان سے غلطی یا بھول ہونے لگے تو تصحیح و رہنمائی کر دیا کرے متعلمین کو موقع دینا چاہئے کہ وہ بحد ممکنہ اپنی مشکلات خود حل کریں اور تمام مزاحمتوں کو دور کریں۔

(۵) ارتقائے قوائے ذہنی:۔ حقیقی معنوں میں تعلیم اور تدریس اسی وقت مفید اور کارآمد ہو سکتی ہے جب کہ اس سے طلبا کے قوائے ذہنیہ اس طرح ترقی کریں کہ وہ دنیا و مافیہا کے باہمی تعلقات کو محسوس کریں۔ قدرت کی کل چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور تمام ذرات عالم ایک ہی رشتہ میں منسلک ہیں۔ پودی کا شاخ پر ایک مقررہ قانون کا عادی اور سارس ہے سیب کا شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر گرنا۔ سمندر کا مدوجزر۔ رات اور دن کا آنا۔ کسوف و خسوف کا ظہور جیسے مختلف اور متفرق واقعات ہیں ظاہر اکچھ بھی نگاہ نہیں معلوم ہوتا لیکن حقیقت بین نگاہ میں یہ تمام واقعات ایک متحدہ قانون کشش کے تابع نظر آتے ہیں انہیں قوانین کی دریافت اور رموز قدرت کا علم معرفت حقیقی کا سنگ بنیاد ہے۔ طلبہ میں بھی ایسا مادہ پیدا کرنا چاہئے کہ وہ قوانین قدرت کو سمجھیں، مناظرت فطرت کے ساتھ ہمدردی اور دلچسپی حاصل کریں۔ خود کو اپنے ماحول کے مطابق بنائیں اور اس حبل المتین کو مضبوطی سے پکڑیں جس میں کائنات کی تمام مادی اور غیر مادی اشیا بندھی ہوئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ معرفت کسی ایک یا چند درس سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ برسوں کی تعلیم و تدریس کے بعد طلبار فتہ رفتہ نظر سے دور حقائق کو دریافت کریں گے تاہم مدرس کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ تدریس کا مقصد اعلیٰ اور ارفع رکھے (باقی آئندہ)

تاریخ اور اس کی تدریس

تاریخ کیا ہے اور اس کے مطالعہ سے کیا فائدہ ہے؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے جواب پر تاریخ کے دلچسپ ہونے یا نہ ہونے کا دارومدار ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے اور ہمارے طلبا کے دلوں میں یہ بات جم گئی ہے کہ تاریخ خشک واقعات کا ایسا مجموعہ ہے جس میں کسی قسم کی دلچسپی ہی نہیں۔ ہم تاریخ کو جنگ اور معرکوں کے واقعات، معاہدوں کی شرائط، حکمراں اور سنین کی لمبی چوڑی فہرست اور درباری سازشوں کو طوطے کی طرح رٹ لینے کے سوا اور کچھ نہیں خیال کرتے۔ مگر نہیں ان معنوں میں اگر تاریخ کا اطلاق ہو سکتا ہے تو ہمارے نصاب کی تاریخوں پر ورنہ عمدہ تواریخ ان معنوں سے کہیں بالاتر ہیں۔ تاریخ دراصل فلسفہ اور شاعری کا مرکب ہے جو خاص خاص اشخاص اور واقعات کے ذریعہ ہمارے دلوں پر عام صداقتیں نقش کرتی ہے۔

تاریخ بڑے بڑے کارناموں کے علم، واقعات کے نشوونما، زمانہ کے تغیر و تبدل، ملک و قوم کی ترقی، علم و ادب کی ترقی، سائنس اور جغرافیہ کی معلومات و انکشافات ہمارے آبا و اجداد کے مفصل کارنامے۔ عام لوگوں کے کام اور ان کی دلچسپیاں ان کی کامیابیاں و ناکامیابیاں بلند ہمتی کی داستان۔ تخیل کی پرواز۔ اخلاق۔ قوانین۔ صنعت و حرفت غرض انسان کے جملہ کارناموں کو زندہ کرکے ہمارے سامنے پیش کرنا تاریخ کا کام ہے۔

ماضی کو حال بنانا۔ دور کو قریب کرنا۔ مشاہیر دنیا کی سوسائٹی میں ہم کو پہونچانا۔ ہمارے آبا و اجداد کو ان کی جملہ خصوصیاتِ زبان، اطوار، اور لباس کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرنا۔ ہم کو ان کے گھر دکھانا۔ ان کے دسترخوانوں پر بٹھانا۔ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بتدریج ترقی کا حال بتانا۔ اپنے ملک کے صحیح حالات اور اس کی تنظیم کا علم سکھانا

اپنے ملک وقوم کا رشتہ دوسرے اقوام وممالک سے بتانا۔ تعصب کو دور کرنا۔ تخیلات کو بلند کرنا۔ اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنا علم، طاقت، اتحاد معاشرتی وغیرہ کا پتہ دینا جاہل کو علم بے صبروں کو صبر اور مایوسوں کو امید کا سبق دینا تاریخ کا فریضہ ہے۔

کسی قوم کو جاہلیت کا لباس اتار کر علم و تہذیب کا جامہ اگر کچھ چیز پہنا سکتی ہے تو وہ تاریخ ہے۔ مردہ اور بے حس قوموں کو جوش، حمیت، وغیرت کے چھینٹے دے دے کر خواب غفلت سے اگر کوئی چیز بیدار کر سکتی ہے تو وہ تاریخ ہے۔ زندہ قوموں کو ان کے اسلاف کے زرین کارناموں یا غلطیوں سے سبق دینے والی اگر کوئی شئے ہے تو یہی تاریخ ہے۔

ہمت وعالی حوصلگی۔ کم ہمتی وبزدلی۔ وفاداری ونمکحرامی۔ حب وطن وقوم فروشی رحمدلی وسنگدلی۔ ایثار وقربانی وخود غرضی اور لالچ نفس کشی وحرص۔ پبلک کی خدمت وذاتی مفاد وغیرہ وغیرہ صفات وعیوب کی اگر زندہ مثالیں دیکھنی چاہو تو تاریخ کی ورق گردانی کرو۔

تاریخ اخلاقی اسباق کا خزینہ اور سیاسی عقل کا گنجینہ ہے۔ وہ ہزاروں اخلاقی نظریوں کو ہمارے سامنے عملی طور پر پیش کرتی ہے اور سیاست دانوں کی فہم وفراست کو جلا دیتی ہے۔

مگر افسوس کہ ان سب اوصاف کے باوجود بھی ہمارے دلوں میں تاریخ جیسے مضمون کی کچھ وقعت نہیں۔ اے کاش ہم کو یہ احساس ہو جائے کہ ہم زمانہ مستقبل کے بنانے والے ہیں اور زمانہ مستقبل کے جراثیم ہم میں پہلے ہی سے موجود ہیں۔ ہم کو ان جراثیم کی اس طرح نشو ونما کرنی چاہیے کہ ان سے آنے والی پود کو ہمارا سراغ مل سکے۔ جس دن ہم کو یہ احساس ہو گیا تاریخ نہ صرف دلچسپ بلکہ ایک نہایت اہم مضمون ہو جائے گی۔

تاریخ کی غایت فی زمانہ دنیا بالکل عجیب اور انوکھے معنوں میں متحد و یکرنگ ہوتی جارہی ہے ایک طرف اگر جغرافیہ دنیا کے حدود اربعہ کو وسیع کرتا جاتا ہے تو دوسری طرف سائنس اس کی مسافت کو روز بروز گھٹا رہا ہے۔ ریڈیو کی حیرت انگیز ترقی سے واقفیت رکھنے والے اصحاب اس سے بے خبر نہیں ہیں کہ اب ہم ہزاروں میل پرے کی آواز گھر بیٹھے سن سکتے ہیں

غرض فطرت کی قوتوں یعنی ریل۔ جہاز اور طیاروں وغیرہ نے دنیا کے رشتۂ اتحاد کو بہت قوی کر دیا ہے اور ان ہی کی بدولت تمام دنیا کی سیاسی۔ اقتصادی۔ معاشرتی اور مذہبی تحریکات آپس میں اس طرح گتھ گئی ہیں کہ اب ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ دنیا کے مشرق میں اگر کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو اس کا اثر مغرب پر ضرور ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بالفاظ دیگر دنیا کی تمام قومیں آج کل رشتۂ اتحاد کی ایک ہی لڑی میں منسلک ہو گئی ہیں اور اب تمام دنیا کی تاریخ ایک ہی تاریخ ہوتی جاتی ہے۔ ہم کو اب یہ احساس ہونے لگا ہے کہ ہم صرف اپنے خاندان کے ایک رکن یا اپنے شہر یا ملک کے ایک باشندے ہی نہیں بلکہ ہمارا رشتہ تمام اقوام عالم سے ہے اور ہم دنیا کے ایک فرد ہیں۔

زمانہ کی بڑی بڑی تحریکات اور واقعات نے ہم کو یہ سبق سکھا دیا ہے کہ ہم اس دنیا میں ہماری مدد کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ ہمارا تعلق ہماری سوسائٹی سے اور پھر سوسائٹی کے ذریعہ تمام عالم سے ہے۔ تہذیب کی وسعت ذہانت کی تیزی اور اسلاف کے حالات اور کارنامے معلوم کرنے کے شوق نے ہم میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ اب ہماری دنیا صرف ہماری ہی معلومات اور تجربوں تک محدود نہ رہنی چاہئے بلکہ ہم کو دنیا کے دوسرے لوگوں کے خیالات اور تجربوں سے بھی واقفیت حاصل کر کے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ واضح ہو کہ ہمارا یہ احساس صرف تاریخ کے مطالعہ پر مبنی ہے۔ پس تاریخ کی سب سے بڑی غایت یہی ہے کہ وہ ہم کو اس امر سے آگاہ کر دے کہ ہم اپنے شہر اور ملک کے علاوہ بقیہ دنیا سے بے تعلق نہیں ہیں بلکہ ہم اس دنیا کے ذمہ دار باشندے ہیں۔

حب وطن علاوہ ازیں جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں تاریخ اخلاق کا سرچشمہ ہے وہ حب وطن کی تعلیم کی سب سے بڑی درسگاہ ہے اور ہمارے دلوں میں حب وطن کے جذبات کی نشو و نما کرتی ہے۔ مشاہیر قوم کے کارنامے اور اہم تاریخی واقعات ہمارے دلوں میں قومی جوش پیدا کرتے ہیں اور ہم کو وطن و قوم کی خدمت کرنے پر ابھارتے ہیں۔ لیکن واضح ہو کہ یہ جوش

لڑائیوں کے حال یا صلح ناموں کی شرائط اور سنوں کی فہرست رٹے سے پیدا نہیں ہو سکتا اس کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے طلبا کو یہ بتائیں کہ ہمارے وطن نے آزادی کے لئے کیسی جدوجہد کی اور اس کے حصول میں اس کو کیسی کیسی جانی اور مالی قربانیاں کرنی پڑیں نیز یہ کہ ہماری قوم و ملک نے تمدن کے میدان میں کس کس طرح آگے قدم بڑھایا۔ اس کو اس میں کیا رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں اور اس نے ان کا کس طرح مقابلہ کیا۔

حب صداقت حب وطن سے قطع نظر تاریخ ہمارے دلوں میں صداقت اور سچائی کی محبت کو بھی پیدا کرتی ہے۔ مورخ کو صرف واقعات نہیں بلکہ صحیح واقعات کی تلاش رہتی ہے اس کو تعصب اور جانبداری کو دور کر کے انصاف اور غیر جانبداری سے کام لینا پڑتا ہے پس صداقت کی یہ دائمی تلاش نہ صرف اس کے بلکہ اس کی کتاب کے پڑھنے والوں کے دلوں میں بھی صداقت کی قدر اور اس کا احترام پیدا کر دیتی ہے۔

علاوہ ازیں اکثر مورخ کو واقعات کی صحت کرتے وقت اپنے قوت فیصلہ سے بھی کام لینا پڑتا ہے اور اس طرح ان کی قوت فیصلہ بھی ترقی کرتی جاتی ہے۔ تاریخ ہمارے دماغوں کی اصلاح کرنے میں بھی ید طولیٰ رکھتی ہے۔ یعنی ایک ایسا شخص جس کا علم صرف اسی کے گھر کی چار دیواری تک محدود ہے اور ایک وہ شخص جو نہ صرف اپنے ملک بلکہ دنیا کے نشیب و فراز اس کے مصائب اور تغیرات سے اچھی طرح واقف ہے ان دونوں کے دماغوں میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔

پس اب یہ تو معلوم ہو گیا کہ تاریخ میں ہمارے اخلاق کی درستی کی بہت بڑی قوت مضمر ہے مگر اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے تاریخ کے استاد کو ان حالتوں کی تحقیق کی ضرورت ہے جن کے ذریعہ سے یہ اعلیٰ تخیلات طلبا کے دل و دماغ میں راسخ ہو سکیں اور اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے طلبا کو صرف قومی تاریخ اس طرح پڑھائیں کہ واقعات ماسبق کے علاوہ وہ زمانہ کی موجودہ رفتار اور ترقی سے بھی بے خبر نہ رہیں۔ مگر افسوس ہے کہ

فی زمانہ تاریخ جس طرح پڑھائی جاتی ہے اس سے ہم موجودہ زمانہ کی ترقی اور حالات زمانہ ماضی سے ان موجودہ واقعات کے تعلق سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ سیاسی تاریخ میں ہمارے ملک کی دستکاری اور صنعت و حرفت وغیرہ کا بالکل تذکرہ ہی نہیں ہوتا حالانکہ ہر سیاسی اور قومی ترقی کا انحصار اس ملک کی دستکاری کی ترقی پر ہے۔ مگر ہم کو بھی اصل حقیقت نہیں معلوم۔ پس طلبار کو اس امر سے بخوبی آگاہ کر دینا چاہئے کیونکہ جس روز ہم میں یہ احساس ہو گیا کہ ہمارے ملک کی ہر قسم کی ترقی کا دارومدار دستکاری و صنعت و حرفت کی ترقی پر ہے ہمارے نوجوانوں کو اس طرف رجحان ہونے لگے گا کہ اپنے آپ کو صنعت و حرفت کی طرف لگائیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج کل عام لوگوں میں تاریخ کے مطالعہ کا شوق اور اس سے دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ مگر کچھ تو تاریخ کے معنوں کی وسعت۔ کچھ سائنس کی عجیب و غریب معلومات و انکشافات اور کچھ انسان کی موجودہ بڑھی ہوئی سرگرمیوں کی بدولت اگر ایک طرف تازہ تاریخ کے لئے مواد ہیں تو دوسری طرف زمانہ گزشتہ کے متعلق ہمارے علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فن تاریخ کی پیچیدگیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ اب ماہرین فن کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ کہیں تاریخ کے مواد کی کثرت اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو نقصان نہ پہونچائے علاوہ ازیں سائنس کی موجودہ ترقی نے دنیا کے رشتۂ اتحاد کو بہت مضبوط کر دیا ہے اور اس طرح ہر ملک کے تاریخی۔ سیاسی۔ معاشرتی اور اقتصادی معاملات نے آپس میں مل کر فن تاریخ کو قدرے مشکل بنا دیا ہے تاہم اس کا مطالعہ اس قدر دقت طلب نہیں جیسا کہ اس کی تدریس اس کی تدریس نے ماہرین فن کو بھی پریشان کر رکھا ہے۔ تاریخ کا لایق سے لایق طالب علم بھی اس دقت کو محسوس کر رہا ہے کہ تاریخ کا پڑھانا کوئی آسان کام نہیں اس کو سہل اور کارآمد بنانے کے لئے ہزاروں تجویزیں پیش کی جا رہی ہیں مگر اب بھی اس دشوار گزار راستہ کی منازل طے نہیں ہوئیں۔ ہنوز روز اول کا مضمون ہے۔

اس قدر عرض کرنے کے بعد اب ہم تاریخ کے طریقہ تدریس پر غور کرتے ہیں

قدیم و جدید طریقہ تدریس | مدارس میں تاریخ کی تدریس طریقہ قدیم و طریقہ جدید دو طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ قدیم طریقہ کی رو سے تو مدرسہ کے بچوں کو ان کے ملک کی پوری پوری تاریخ مدرسہ چھوڑنے تک تین مرتبہ پڑھائی جاتی ہے تاکہ بار بار پڑھنے سے ان کو وہ مضمون اچھی طرح یاد ہو جائے مگر اس میں نقص یہ ہے کہ ایک ہی مضمون کو بار بار پڑھنے سے طلبا اکثر اس سے اکتا جاتے ہیں اور جب ان کو اس میں کوئی بات نئی یا کارآمد معلوم نہیں ہوتی تو وہ بیزار ہو کر اس مضمون ہی سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ استاد کو اس تاریخ کے خاص خاص عہدوں کی تفصیلی مطالعہ کا وقت بھی نہیں مل سکتا کیونکہ تمام تاریخ ہر مرتبہ پوری ختم کرنی ہوتی ہے۔

طریقہ جدید یہ ہے کہ تاریخ کو دو یا تین (جیسا کہ موقع ہو) حصوں میں تقسیم کر لیا جائے اور ہر حصہ کو مدرسہ کے مختلف طبقوں مثلاً تحتانیہ۔ وسطانیہ۔ و فوقانیہ میں پڑھایا جائے۔ اس طرح اول تو استاد کو تفصیلی مطالعہ کے لئے کافی وقت مل سکتا ہے اور دوسرے طلبا اس مضمون سے اکتا نہیں جاتے اس لئے کہ ہر طبقہ میں تاریخ کے نئے حصہ کا سبق ہوتا ہے۔ بلکہ اس طرح ان کو اس مضمون سے ایک گونہ دلچسپی ہو جاتی ہے۔ پس آج کل مدارس میں عموماً یہی طریقہ رائج ہو چلا ہے مگر ہمارے خیال میں تاریخ کا پروگرام ہر دو طریقوں کے بین بین ہو۔

حقیقی پروگرام | اپنے مطلب کو واضح کرنے کے لئے ہم تاریخ ہند کا ایک حقیقی پروگرام تیار کرتے ہیں۔ چونکہ عموماً ہمارے مدارس تین طبقوں یعنی تحتانیہ۔ وسطانیہ اور فوقانیہ پر مشتمل ہیں لہٰذا ہمارا پروگرام بھی ان ہی کے مطابق ہوگا۔

تحتانیہ:۔ ہمارے خیال میں طبقہ تحتانیہ میں تاریخ کی طرح نہ پڑھائی جائے بلکہ اس کی تعلیم صرف تاریخی کہانیوں کے ذریعہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے طبعاً کہانیوں کو پسند کرتے ہیں اور ان کو اپنے اپنے گھروں میں بھی بہت شوق سے سنتے ہیں۔ پس اگر تاریخ کی تعلیم ان کو صرف کہانیوں کے ذریعہ دی جائے تو یقیناً ان کو اس مضمون سے دلچسپی ہو جائے گی اور

طور پر ہم عرض کریں گے کہ طلبا کو مشاہیر ہند مثلاً رام چندر۔ اشوک۔ اکبر۔ عالمگیر۔ اورنگ زیب وغیرہ کی زندگی کے مختصر حالات اور ان کے کارنامے اور تاریخ ہند کے مشہور واقعات مثلاً مہابھارت۔ رامائن۔ حملہ سکندری۔ جنگ پانی پت وغیرہ کے حالات بصورت قصص سنائے جائیں مگر یہ قصے ایسے دلچسپ اور پر لطف پیرایہ میں بیان ہوتے جائیں کہ ان کے سننے کے بعد طلبا کے دلوں میں ان لوگوں اور واقعات کے مزید حالات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہو جائے۔ یہ قصے عموماً زبانی اور کبھی کبھی بذریعہ کتاب بھی ہوں مگر ان کو دلچسپ اور واضح کرنے کے لئے جماعت میں تصاویر اور نقشے کثرت سے استعمال ہوں۔ قصہ ختم کرنے کے بعد طلبا سے اس کا اعادہ کرایا جائے تاکہ وہ قصہ ان کو یاد ہو جائے۔ اس بات کی بھی کوشش کرنی چاہئے کہ کہانیوں ہی کے ذریعہ بادشاہ۔ پارلیمنٹ۔ انصاف محصول وغیرہ وغیرہ الفاظ بھی طلبا کے ذہن نشین ہو جائیں۔ الغرض اس طبقہ میں تاریخ کی تعلیم کا صرف یہ مقصد ہونا چاہئے کہ طلبا کے دلوں میں اس مضمون سے دلچسپی اور اس کا صحیح مذاق پیدا ہو جائے

(باقی آئندہ)

ہمارا طرز تعلیم ۲

ہماری تعلیم کی ناکامی کے اسباب

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو پرچہ ماہ دے ۱۳۲۵ف)

پہلا سبب۔ مادری زبان کا ذریعہ تعلیم نہ ہونا مادری زبان میں تعلیم کے نہ ہونے کی خرابیوں کو [illegible] بتانا چاہتا ہوں کہ زبان کا کس قدر عظیم الشان اثر انسان پر ہوتا ہے اس کا [illegible] نہیں سکتا

یہی وجہ ہے کہ وہ زبان جو بچہ اپنی ماں کی آغوش میں سیکھتا ہے اُس سے کسی طرح نہیں چھوٹ سکتی اور اُس سے جو دلی انس ہوتا ہے وہ کبھی زائل نہیں ہو سکتا لیکن جب ابتدا ہی سے بچوں کے نرم اور ناپائیدار رجحانات کی باگ دوسری طرف موڑ دی جائے اور ان کے دلوں پر ان کی زبان سے نامناسب خیالات مرتسم کر دیے جائیں تو یہ دلی تعلق بتدریج نسلاً بعد نسلٍ زائل ہوتا چلا جاتا ہے اور آخرکار اپنی زبان سے بجائے الفت کے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے اولوالعزم فاتح ہمیشہ اس حربہ سے نہایت عظیم الشان کام لیتے رہے۔ تاریخ عالم کی ورق گردانی سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس فاتح نے مفتوحہ اقوام میں اپنی زبان کو رواج دیا اُس نے نہ صرف اُن کو اپنی ہی خواہ رعایا بنا لیا بلکہ اُن کے مذہب اُن کے خیالات اور ان کے طرز معاشرت غرض یہ کہ اُن کی کل چیزوں کو اپنا تابع کر لیا۔ جب یونانیوں کو کسب اقبال اوج کمال پر تھا تو اُنہوں نے اپنی زبان ہی کے زور سے تمام یورپ کو اپنا مطیع بنا لیا۔ اُسی کے زور سے اُن کی اور جنبالٹی کو پامال کر کے اُن پر اپنا سکہ جما دیا اور ایسی قوت حاصل کر لی کہ آج تک اُن کا نام صفحات تاریخ پر باقی ہے۔

عرب جہاں جہاں اپنی زبان لیجا سکے وہاں اُن کا اقتدار۔ اُن کا مذہب۔ اُن کا تمدن پہونچا اور ان کی حکومت صرف اُن ہی مقامات پر باقی رہی جہاں اُن کی زبان عام ہو سکی۔ اسکندر اعظم نے تمام ایشیائی مضامین کی تعلیم بھی یونانی زبان میں دلوائی اور اس تدبیر سے اپنی کثیر رعایا کو بخوبی اپنا مطیع و منقاد بنا لیا۔ غرضکہ دنیا کے تمام مدبر فاتح اس تدبیر کو کام میں لاتے رہے اور اس کی بدولت بآسانی اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئے۔

ہماری برطانوی گورنمنٹ بھی اس زرین اصول سے ناواقف نہیں۔ اُس نے بھی اس حربہ سے کام لیا اور لے رہی ہے۔ چنانچہ سر جارج ٹریویلین جو کسی زمانہ میں مدراس کے گورنر تھے

اس بارے میں اپنی رائے ظاہر فرماتے ہیں کہ "انگریزی ادب کی اسپرٹ اُس تعلق کے لئے مفید ہوگی جو ہمارے اور ہندوستانیوں کے درمیان قائم ہے ہندوستانی نوجوان جب ہم لوگوں سے ہمارے ادب کے ذریعہ بخوبی واقف ہو جائینگے تو وہ ہمیں غیر ملکی خیال کرنا ترک کردیں گے جب وہ ہمارے طرز پر تعلیم پائیں گے ہمارے طرز کی چیزوں کو پسند کرنے لگینگے اور ہمارے طرز کے مشاغل میں منہمک ہو جائیں گے تو اُن پر انگریزی رنگ اس قدر چھا جائے گا کہ وہ بہ نسبت ہندی کے زیادہ تر انگریز ہو جائیں گے جس طرح سے کہ روما کے صوبہ جاتی باشندے بہ نسبت گال یا اطالویوں کے زیادہ تر رومی بن گئے تھے"۔ سر چارلس بڑے ولی ان کا یہ خیال بالکل درست ہے اور ایک صدی کے تجربہ نے اُن کی پیشین گوئی کو لفظ بلفظ ثابت کردیا۔

ہمارے خیالات کا اس درجہ بدل جانا کہ اُن میں ذاتی رائے اور اپنی عقل کا کوئی دخل نہ ہو صرف انگریزی لٹریچر کا نتیجہ ہے مسلسل ایک صدی تک انگریزی زبان سے گتھے رہنے کا یہ اثر ہوا کہ اب میڈیم آف انسٹرکشن کے بدلنے کا خیال بھی ہمارے لئے عجیب سا ہو گیا اور اس میں طرح طرح کی پیچیدگیاں نظر آنے لگیں یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ مسئلے جو ذریعہ تعلیم کے بارے میں آج پیدا ہو رہے ہیں نئے ہیں بلکہ ایک صدی پیشتر اُٹھ چکے ہیں اور اُس وقت ان پر نہایت گرما گرم بحثیں ہو چکی ہیں ۱۸۱۳ء سے ۱۸۳۵ء تک یہ معرکۃ الآرا مسئلہ بڑی سرگرمی کے ساتھ معرض بحث میں رہ چکا ہے۔ اور آج کی طرح اُس وقت بھی ایک متنازع فیہ امر تھا۔ مگر ۱۸۳۵ء ہماری ہسٹری آف ایجوکیشن نہایت اہم ہے کیونکہ اسی سنہ میں لارڈ میکالے کا ہندوستان ورود ہوا جس نے بلا کسی مزید قیل و قال کے انگریزی زبان کو تعلیم کا تنہا ذریعہ قرار دے دیا اور گویا اُس وقت سے ہندوستان میں انگریزی زبان کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ متذکرہ صدر فاتحین عالم سے ہماری گورنمنٹ نے صرف اس قدر زیادہ کام کیا کہ اپنی زبان کے ساتھ اپنی نہیں کتاب (بائبل) بھی شریک نصاب کرنے کی کوشش کی چنانچہ ۴ سر جولائی ۱۸۴۶ء عیسوی کو

مدراس کی کونسل آف ایجوکیشن نے مارکوئس آف ٹوئیڈل (گورنر آف مدراس) سے بابیل کو شریک نصاب کرنے کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی۔ اور صاحب موصوف نے اپنی یادداشت مورخہ ۲۴ اگست ۱۸۴۶ء میں اس رائے سے اتفاق کیا۔

کن باشندگان مدراس نے اس عجیب و غریب منصوبہ کے خلاف، اور دسمبر ۱۸۵۲ء کو پارلیمنٹ میں۔ برائے احتجاج بلند کی جسکی بناء پر اس تجویز کو مسترد کر دیا گیا اپنے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے مسٹر چارلس گرانٹ ۱۸۳۳ء کی پارلیمنٹری بلو بک میں تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"ان خرابیوں کو رفع کرنے کی تدبیر ایک یہ ہے کہ ہم اپنے علم کی روشنی ان تیرہ دماغ لوگوں میں پھیلائیں اور اپنے سچے مذہب کے خالص مفید اور دانشمندانہ اصول خصوصیت کے ساتھ اُن کے ذہن نشین کریں" غرض یہ کہ تمام حربوں سے کام لینے کی کوشش قبل از قبل کی جا چکی ہے اور اگرچہ اپنے حسب خواہش اس مقصد میں کوشش کرنے والے کامیاب نہیں ہوئے پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی کوششیں بالکل بار آور نہیں ہوئیں ہمارے خیالات کی غلامی۔ ہمتوں کی پستی۔ کورانہ تتبع کا لپکا۔ اپنے طرز معاشرت اپنی قوم اور اپنی زبان سے نفرت سب نتیجہ ہے اس تعلیم کا جو ایک صدی سے ہم کو دی جا رہی ہے ہماری آنکھوں میں اپنے حکمرانوں کی ہر ادا کے کھپ جانے کا سبب اُن کے ہر قبیح کا حُسن کی شکل میں نظر آنے کا باعث اُن کے طرز معاشرت کی ہمارے خیالات پر غالب ہونے کی وجہ صرف اُن کی زبان ہے جس نے ہماری دماغوں کی صلاحیت کو نیست و نابود کر دیا اور ہماری قوت امتیاز سلب کر لی۔ اب جب تک ہم زبان کے اس طوق کو اپنی گردنوں سے نہ نکالیں گے کبھی حقیقی اور اصلی تعلیم نہیں حاصل کر سکتے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے ایک ممتاز پروفیسر مسٹر جے۔ آر۔ سیلے۔ اپنے ایک لیکچر میں لارڈ میکالے کے خیالات کی تردید کرتے ہوئے۔ بیان کرتے ہیں کہ:-

"اگر ہندوستان کبھی حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ ہوگا تو وہ یقیناً نہ سنسکرت کے ذریعہ ہوگا نہ انگریزی کے بلکہ ملکی زبانوں یعنی اردو۔ ہندی۔ بنگالی۔ وغیرہ کی مدد سے"

انگریزی زبان کے شیدائی مادری زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے میں دو بڑی دشواریاں بتاتے ہیں ایک تو یہ کہ ہندوستان میں کوئی ایک زبان ایسی عام نہیں جس کو ہندی سمجھ سکتے ہوں، دوسرے ہماری ملکی زبانوں میں ادائے مطالب کے لئے ذخیرہ نہایت محدود ہے اور علوم جدیدہ کا اُن میں کہیں پتہ نہیں اس لئے زبان انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانا چاہیئے میرے خیال میں یہ دونوں وجوہ نہایت مہمل ہیں زبان اردو اگر ہندوستان کی لینگوا فرینکا[۲] نہیں تو کم از کم ہندوستان کے ایک بڑے حصہ کی زبان ضرور ہے۔ لہٰذا جن صوبوں میں یہ کثرت سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ وہاں اُس کو میڈیم قرار دینا چاہیئے اور جس جگہ اس کے بولنے اور سمجھنے والے نہ ہوں وہاں اُسی صوبہ کی باشندوں کی زبان میڈیم قرار دی جا سکتی ہے اور جس طرح اب ہر صوبہ کے لئے ایک جدا یونیورسٹی ہے آئندہ بھی ہو لیکن اس میں اُسی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے جو اُس صوبہ میں بکثرت استعمال ہوتی ہے اس طرح پہلی دشواری بہت آسانی سے رفع ہو جائے گی اب رہی دوسری وجہ یعنی "ہماری زبانوں میں کتابوں کا ذخیرہ نہیں اور وہ علوم جدیدہ سے بالکل معرا ہیں۔ لہٰذا ہم کو انگریزی میں تعلیم حاصل کرنی چاہیئے" اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک کمزور آدمی کو ورزش کرنے اور مقویات کے استعمال کی صلاح دینے کی بجائے کوئی شخص اُسے یہ مشورہ دے کہ تم دوسرے آدمی کا خون پچکاری کے ذریعہ اپنے جسم میں پہونچا لو تو یہ کہاں تک قابل قبول ہو سکتا ہے؟

بعینہٖ یہی مثال دوسری قوم کی زبان اختیار کرلینے کی ہے اگر ہماری زبان میں سرمایہ نہیں تو چاہیئے یہ کہ تصانیف و ترجموں کے ذریعہ سے اس کو مالدار بنائیں نہ کہ اُس سے ہاتھ دھو کر انگریزی سے گٹھ جائیں۔ بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ اگر ایک ہندوستانی سے اردو زبان میں

---

۲ LINGUAFRANCA

مکتبہ جامعہ
دہلی 19

تحصیل علم نہ کرنے کا سبب پوچھا جائے تو یقیناً وہ زبان اردو کی بے استطاعتی کا عذر کرے گا۔ دوسرے شخص سے اگر زبان اردو کی بے بضاعتی کی وجہ دریافت کیجئے تو وہ اپنی زبان کے ہم وطنوں کی غفلت اُس کا باعث قرار دے گا۔

لیجئے! وہی طلب و رسد کا مسئلہ آگیا۔ آج اگر ہماری یونیورسٹیوں میں ملکی زبانیں ذریعہ تعلیم بنا دی جائیں تو دس برس کے عرصہ میں بہتر سے بہتر تصنیفات و ترجموں کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ اب اس لغو عذر کو بہانہ قرار دے کے اپنی زبان سے تغافل برتنا کس قدر نادانی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ہمیں چاہئے کہ اپنا "میڈیم آف انسٹرکشن" بدلیں۔ اُس کے بعد دوسری غلطیوں کی اصلاح کی جانب توجہ کریں۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ انگریزی زبان کو یک لخت ترک کر دیا جائے بلکہ اُس کو زبان خیاری یا زبان زائد کی طرح رکھنا چاہئے۔

(باقی دارد)

دھوپ گھڑی

ایک دن وہ تھا کہ لوگوں کو دن اور رات میں تمیز نہ تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کو اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ جب نیند آئی سو رہے۔ اور جب آنکھ کھلی اُٹھ بیٹھے۔ نہ تو اُن کو کچھ دن سے کام تھا اور نہ رات سے مقصد۔ اس لئے کہ وہ اپنی زندگی جانوروں کی طرح بسر کرتے تھے اور کھانا پینا۔ سونا اور جاگنا اٹھنا۔ بیٹھنا اُن کی زندگی کا نصب العین تھا کچھ عرصہ تک تو یہی لیل و نہار رہے لیکن جب وہ مل جل کر رہنے لگے۔ اور اُن میں تمیز آئی۔ ضروریات زندگی بڑھ گئیں تو اُن کو اوقات کی تقسیم کی ضرورت ہوئی۔ سب سے اول اُنہوں نے

دن کو رات اور دن میں تقسیم کیا۔ جب آفتاب طلوع ہوتا۔ تو لوگ اپنے اپنے کاروبار سے لگ جاتے۔ اور جب غروب ہوتا۔ تو آرام کی فکر کرتے۔

جس قدر وہ ترقی کرتے گئے ان کے خیالات میں وسعت اور کاروبار میں زیادتی ہوتی گئی اسی قدر اُن کو دن اور رات کو مزید حصّوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

چنانچہ کچھ عرصہ بعد دن کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا۔ صبح۔ دوپہر۔ سہ پہر۔ اور شام یا فجر۔ ظہر۔ عصر۔ اور مغرب۔

آگے چل کر یہ تقسیم بھی نامکمل ثابت ہوئی اور اس تقسیم کی مزید تقسیم کی گئی مثلاً صبح صادق۔ علی الصباح۔ ضحیٰ۔ چاشت۔ زوال۔ وغیرہ لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلی کا ہوا تھا۔

اس لئے انہوں نے اور بھی بلند نظری سے کام لیا۔ اور ان کو دوازدہ بروج فلکی کے مطابق بارہ گھنٹوں میں تقسیم کر دیا۔ اور اسی قدر رات کے بھی حصّے کر دئے۔ صبح کو چھ بجائے دوپہر کو بارہ سہ پہر کو چار۔ اور شام کو پھر چھ بجا کر ختم کر دیا۔ پھر بقیہ حصّوں کی خانہ پری علی الترتیب (۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲) اور (۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶) کر دی۔

چونکہ اوقات کا تعین آفتاب کی حرکت کے باعث کیا گیا تھا۔ اس لئے ایک ایسا آلہ بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جس سے ان اوقات کا صحیح اندازہ۔ آفتاب کی مدد سے ہر شخص آسانی کر سکے۔

طرح طرح کے آلہ ایجاد کئے گئے لیکن کوئی کارآمد نہ ہوا حتیٰ کہ آج سے (۳۰۰۰) تین ہزار سال پیشتر اہل امیریا نے آفتاب کی مدد سے وقت معلوم کرنے کے لئے دھوپ گھڑی ایجاد کی جو اس زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے۔ ہر طرح سے قابل آفریں ہے۔ اس نو ایجاد آلہ نے تمام دنیا میں اپنا ڈنکا بجا دیا۔ اور آناً فاناً تمام عالم میں دھوپ کی طرح پھیل گیا۔ ہندوستان میں بھی اس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی چنانچہ ۱۷۲۴ء میں راجہ جے سنگھ نے

بقدر جے پور ایک زبردست دھوپ گھڑی بنوائی۔ یہ عظیم الشان گھڑی نہایت ہی بڑے پیمانہ اور صحیح طریقہ پر تیار کروائی گئی ہے۔ جو اس وقت تک تمام عالم میں اپنا نظیر نہیں رکھتی مگر دھوپ گھڑی کی آب و تاب۔ صرف آفتاب کی روشنی پر ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا نقص ہے۔ عموماً بارش کے موسم میں اور خصوصاً رات کے وقت اس کا وجود بالکل بیکار رہے۔

اس عیب کی وجہ سے۔ جبکہ رات کی بھی۔ دن کی طرح تقسیم کی ضرورت ہوئی۔ تو دنیا کی سب سے بڑی پرانی قوم یعنی اہل چین نے "ریت گھڑی" اور اہل ہند نے (پن گھڑی) ایجاد کی جو بغیر آفتاب کی مدد کے شب و روز۔ وقت بتاتی رہتی تھی۔ مگر اس میں ایک خرابی یہ تھی کہ ذرا سی غفلت اور لاپروائی سے پورے نظام الاوقات پر پانی پھر جاتا تھا۔

ریت گھڑی تو بہت جلد خاک میں مل گئی۔ مگر پن گھڑی۔ کچھ روز تک کٹورے کے سہارے تیرتی رہی۔

گذشتہ ایک صدی میں سائنس نے وہ غیر معمولی ترقی کی کہ سائنٹیفک صحت کے ساتھ اوقات کی تقسیم نہایت ضروری سمجھی گئی۔ مختصر یہ کہ اہل ہند نے صحیح وقت معلوم کرنے کے لئے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا۔ جس سے زمانہ ماسبق کی طرح نہ صرف گھنٹے معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ گھنٹے کے کئی حصوں کو بھی پورا پورا پتہ چل جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تھوڑے خرچ کے بعد ہر شخص اس آلہ کو جو کہ گھڑی یا گھنٹہ گے نام سے موسوم ہے۔ حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن ذرائع آمد و رفت نے دنیا کے دور سے دور حصوں کو بھی ایک دوسرے سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ سب جگہ ایک ہی وقت کا رہنا نہایت اہم اور ضروری ہے۔

متمدن دنیا۔ گرینچ ٹائیم کو مانتی ہے۔ اور اپنے اوقات کا اُسی سے تعین کرتی ہے چنانچہ ہمارے ملک میں گھڑیوں کی صحت گرینچ ٹائم سے کی جاتی ہے اور ریلوے اسٹیشن کی گھڑی اسی سے ملائی جاتی ہے۔ لیکن ایسے مقامات پر جہاں کہ یہ سہولت میسر نہ ہو۔ صحیح وقت کا

قائم رکھنا دشوار ہے۔ مدارس میں جہاں پابندی اوقات تعلیم کا اہم جزو ہے اچھی گھڑیوں کے نہ ہونے سے وقت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اور معائنہ کنندگان کو۔ اکثر شکایت ہوتی ہے مدارس اپنی مصلحت کے لحاظ سے گھڑیوں کو آگے پیچھے کر لیتے ہیں۔ گو یہ ممکن ہے کہ خود معائنہ کنندہ ہی کے وقت میں فرق ہو۔

ہم نے اس خیال سے کہ کسی کو شکایت کا موقع باقی نہ رہے۔ اور جہاں کہ تخفیف مصارف کی وجہ سے گھڑی بھی مہیا نہیں کی جا سکتی بآسانی وقت دریافت کر لیا جائے صحیح وقت معلوم کرنے کے لئے ذیل میں ایک ترکیب بتائی ہے گو لارنس اینڈ میسو کمپنی بمبئی سے صرف ماہ، یا ۵ روپیہ کلدار میں عمدہ دھوپ گھڑی خریدی جا سکتی ہے۔ جس سے مدرسین اور معائنہ کنندگان کی نہ صرف دیرینہ شکایت ہی دور ہو جائے گی۔ بلکہ اُس پر عمل کرنے سے مدرسہ اُس مقام پر وہ کام کرنے لگے گا۔ جو گرجی "نیچ" دنیا کے لئے کر رہا ہے

ہر شخص مدرسہ سے صحیح وقت معلوم کرے گا۔ اس طرح مدرسہ کا نام روشن ہو گا اور اس کی عزت قائم ہو گی۔

دھوپ گھڑی بنانے کی ترکیب | ایک مسطح لکڑی کے تختہ۔ یا شاہ آبادی پتھر پر (جو کم سے کم سات انچ لمبا چار انچ چوڑا اور آدہ انچ موٹا ہو) طولانی جانب آدہ انچ فاصلہ سے کنارے متوازی ایک خط کھینچا جائے۔ پھر اس خط کے نقطہ تنصیف کو مرکز قرار دیکر پرکار سے ایک نصف دائرہ کھینچنا چاہئے جس کا نصف قطر تین انچ ہو۔

اس نصف دائرہ کو بارہ مساوی حصوں میں تقسیم کر کے۔ اُس کے سب سے پہلے حصہ پر چھ بجے صبح اور سب سے آخری یعنی بارھویں حصہ پر چھ بجے شام لکھکر۔ درمیانی حصوں پر علی الترتیب (۷ و ۹ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۲) اور (۱ و ۲ و ۳ و ۴ و ۵) لکھدینا چاہئے۔ اور اُس نقطہ سے جس پر کہ بارہ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ نصف دائرے کے مرکز کو ایک خط سے ملا دیا جائے اس نصف دائرہ کے مرکز پر ایک سوراخ کر کے ایک سیدھی نوکدار کیل اس طرح

بٹھائی جائے کہ تختہ کی سطح سے تقریباً ۵۲ درجہ کا زاویہ بنائے۔

اس تختہ کو اسی جگہ نصب کرنا چاہئے جہاں کہ دن بھر اس پر دھوپ پڑتی رہے اور وہ خط جو ہندسہ بارہ کے نقطہ سے نصف دائرہ کے مرکز تک کھینچا گیا ہے ہمیشہ شمال کی جانب رہے چونکہ سورج مشرق سے نکلتا ہے۔ اس لئے کیل کا سایہ مغرب کی طرف رہے گا اور صبح چھ بجے اس کا سایہ (اُس حصہ پر پڑے گا جہاں کہ صبح چھ بجے لکھا ہے) بشرطیکہ یہ تختہ یا پتھر ہدایات مندرجۂ بالا کے بموجب تیار کرکے صحیح طریقہ پر لگایا گیا ہو۔ سورج کی حرکت کے ساتھ ساتھ سایہ بھی حرکت کرے گا۔ نصف النہار کے وقت اس کا رخ ٹھیک شمال کی جانب ہوگا اور بارہ کے ہندسہ پر رہے گا۔ اور شام کے چھ بجے اس کا سایہ مشرق کی طرف ہوگا

مرزا عصمت اللہ بیگ عصمت

تبصرے

ہلن کا چتکبرا بانسری والا رابرٹ براؤننگ انگلستان کا ایک زبردست شاعر ہے اور اس کے معاصرین میں صرف ٹے نی سن ہی ایک شاعر تھا جو اس کی ٹکر کا کہا جا سکتا ہے خیالات کی گہرائی جدت اور انوکھے پن میں براؤننگ ٹے نی سن سے بہت آگے تھا۔ زبان کی شستگی اور بندش کی چستی الفاظ کے انتخاب اور مطالب کی وضاحت میں ٹے نی سن کا کلام بہت بڑھا ہوا ہے۔ براؤننگ کا کلام نہ صرف اعلیٰ درجہ کی شاعری ہے بلکہ ایک فلسفہ بھی ہے۔ البتہ غیر مانوس بندش گرامر سے بے نیازی اور الفاظ کے بن چنے اور اندھا دھند استعمال نے براؤننگ کے کلام کو نہایت مشکل چیز بنا دیا ہے۔ مرزا غالب کا مغلق اور فارسی نما کلام بھی براؤننگ کی الجھی ہوئی اور دھندلی چیزوں کے سامنے آسان کہلانے کا مستحق ہے۔

ایسے ادق گو شاعر نے ایک نظم بچوں کے لئے لکھی اور خوب لکھی ہے اس کا قصہ پر لطف ہے بیان صاف ہے اور بیان میں بہاؤ ہے اور یہ نظم انگلستان کے بچوں میں بہت ہر دلعزیز ہے بچوں کے لئے بہت کم انگریزی نظموں کے انتخابات ایسے ہیں جن کی نظم سنی نہ گئی ہو۔ مولانا ذہین نے اس نظم کا پورا ترجمہ تو نہیں بلکہ اس کا قصہ اسی تسلسل اور ترتیب سے اردو میں نظم کیا ہے۔ مولانا نے جس شستہ اور رواں زبان میں اس قصہ کو ادا کیا ہے وہ داد کے قابل ہے۔ براؤننگ نے بچوں کی نفسیات کے لحاظ سے جہاں جہاں خوف اور استعجاب کی کیفیتیں پیدا کی ہیں مولانا نے بھی ان کیفیتوں کا کامیابی کے ساتھ لحاظ رکھا ہے۔ اردو میں ادب طفولیت اول تو اس قدر کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور جو کچھ ہے اس میں مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کی بے بہا چیزوں کے علاوہ ادبی لطافت مشکل سے ہی پائی جاتی ہے۔ مولانا ذہین کی اس نظم میں ادبی رنگ بھی موجود ہے ہمارے اساتذہ اس نظم کو طلبا میں رواج دیں تو بچوں کو ایک دلکش کہانی کا مزہ ملے گا اور ساتھ ہی ان کو ادب کی چاٹ بھی لگے گی۔ لکھائی اور چھپائی بھی اچھی ہے کاغذ بھی اچھا ہے اور قیمت (۱۰) ہے

سید عبدالرزاق بکسلر اور پبلشر چارمینار حیدرآباد (دکن) سے طلب کی جا سکتی ہے۔

جادو اس نام کا ماہوار رسالہ ڈھاکہ سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے مدیر مولوی خواجہ محمد عادل صاحب ہیں۔ بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ رسالہ اردو ٹائپ میں طبع ہوتا ہے اور ٹائپ واضح اور روشن ہے۔

اس وقت ہمارے پیش نظر (نمبر ۱ جلد ۳) ہے اس میں صرف ایک ہی مضمون ہے نواب سید نصیر حسین صاحب خیال کا خط نواب صدر یار جنگ بہادر کے نام یہ خط گنجان ۳۶ صفحوں پر ہے اور اس کے بارے میں مدیر صاحب نے اعتذار کے تحت خود اعتراف فرمایا ہے کہ رسالہ کا زیر بحث نمبر

"غلو" معمول ایک ہی مضمون پر ختم ہوتا ہے"۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا ہے "اور یہ ایک ہی بہت سوں پر بھاری ہے" اس خط میں بحث یہ ہے کہ میر انیس نے اپنے اس شعر میں

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ساتویں پشت کہا ہے یا پانچویں پشت ؟

اس شاندار مبحث پر نواب خیال صاحب نے وہ بال کی کھال کھینچی ہے وہ منطقی نزاکتیں اور جلت پھرت دکھائی ہے کہ آدمی ایک دفعہ تو ششدر رہ جاتا ہے گو بعد میں اتنا افسوس ضرور ہوتا ہے کہ کاش یہ ساری ذہنی ورزش اردو ادب میں کسی تخلیقی چیز کے اضافہ میں صرف ہوتی۔ یہ مان بھی لیا جائے کہ ساتویں اور پانچویں پشت کا سوال حل طلب ہے تو بھی یہ اس قدر چھوٹی سی بات ہے کہ اس پر اتنی قیمتی استدلالی قوت کا صرف کرنا کبھی جائز نہیں ہو سکتا۔ یہی چھتیس صفحے۔ ان صفحوں کا لکھنا اور پھر ان کا کاغذ کا چھپنا سیاہی اور ان کی طباعت کی محنت۔ کس قدر سود مند ہوتی اگر نواب خیال صاحب انیس کی شاعری کو کسی انوکھے پہلو سے مطالعہ فرماتے۔ اصل بات یہ ہے کہ اب تک نظم و نثر کا جو سرمایہ اردو میں ہے محض اسی کو آسمانی چیز سمجھ کر ہمارے اہل قلم اس دائرہ سے باہر نہ نکلنا چاہیں گے تو پھر اس قسم کے ساتویں اور پانچویں پشتوں کے بحث مباحثہ کے سوا اور رہ ہی کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ اردو نظم اور نثر دونوں میں نیا آسمان اور نئی زمین پیدا کی جائے پرانی چار دیواری کی آسمان سے باتیں کرتی دیواروں کو اس قدر منہدم کیا جائے کہ اس ننھی سی چار دیواری میں محدود رقبہ کے باہر خدا کی غیر محدود خدائی کی وسعت اور دلفریبی پر نظریں پڑنے لگیں۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ اب اردو کے جو زندۂ جاوید شہپارے ہیں ان کو بھلا یا مٹا یا جائے۔ اگر اس وقت کے

ہندوستانی مسلمان مل کر بھی ان چیزوں کو مٹانا چاہیں تو بھی یہ نہ مٹ سکیں گی۔ اگر ہندوستان سے اردو بولنے والی آبادی بھی مٹ جائے تو بھی یہ چیزیں بشرطیکہ یہ واقعی زندہ ہوں نہ مٹیں گی۔ اس وقت دنیائے قدیم کی بعض شایستہ زبانیں مٹ چکی ہیں یعنے ان کا بولنے والا کوئی نہیں لیکن ان زبانوں کے زندہ ادبی جواہر پارے اب بھی سر آنکھوں پر رکھے جاتے ہیں اور نئی زبانوں میں حلول کر کے ان میں جان ڈالتے ہیں

جادو وُہ ہیں یہ توقع ہے کہ وہ ان معنوں میں اسم بامسمّیٰ بن جائے کہ اس کی نئی نئی چیزیں اردو ادب میں تہلکہ ڈالدیں اور اردو بولنے والی دنیا قدامت پسندی کی ڈھٹ بندی کے باوجود ایسی مسحور ہو جائے کہ اسی کی سی گانے لگے اور اس مثل کی کہ جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے کم از کم ادبی دنیا میں تصدیق ہو جائے ظاہری صورت یعنے طباعت میں جادو نے قابل تحسین جدت کی ہے یعنے ٹائپ اختیار کیا ہے۔ اور ہماری دعا ہے کہ باطنی حیثیت سے بھی جدت طرازی اس رسالہ کا شعار رکھی جائے گی اور اُس وقت چھتیس صفحے تو بہت بڑی بات ہے ایک صفحہ کا ہی مضمون جدت میں ڈوبا اور انوکھی ادا کا سو نہیں ہزار پر بھاری ہوگا۔

ہمارے مدارس میں جادو اساتذہ اور طلبا دونوں کو دیکھنا چاہیے ایک تو اس سے ٹائپ کی عادت ہوگی اور اب ٹائپ کا مسئلہ اردو طباعت کے لئے ایک نہایت اہم مسئلہ ہوگیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر جادو میں جدت طرازی نہ بھی ہو تو بھی اس کے مضامین سبق آموز ضرور ہوں گے۔

ملنے کا پتہ:- خواجہ محمد معظم منیجر
دلکشا رمنا ڈھاکہ

شریک مدیر

شذرات

لاہور میں ایک گیریجویٹ نے درزی کا کام شروع کیا ہے تعلیم کا نتیجہ اب ظاہر ہونے لگا ہے۔

مدراس کی ایک مسلمان خاتون بیگم سلطان امیر الدین صاحب کو بی۔ ایل (وکالت) کے امتحان میں شریک ہونے کی اجازت مل گئی ہے۔

اس سال کنیرڈ کالج سے گیارہ لڑکیوں نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ لاہور سے تین لڑکیوں نے اور امرت سر سے ایک لڑکی نے خانگی طور پر بی۔ اے پاس کیا۔

براعظم امریکہ میں حبشیوں کی ترقی تعلیم امریکہ سے مسٹر کیل نے حبشیوں کی ترقی تعلیم کے متعلق ایک مضمون "ماڈرن ریویو" میں لکھا ہے جس میں آپ بتلاتے ہیں کہ دنیا کی کسی قوم نے آج تک اس قدر تھوڑے عرصہ میں ترقی نہیں کی جتنی حبشیوں نے کی ہے ۱۸۶۴ء میں جب امریکہ کی جنگ ختم ہوئی ۲۰ فیصدی حبشی تعلیم یافتہ تھے اس زمانہ میں بیچارے حبشیوں کی حالت اس قدر قابل رحم تھی جو بیان سے باہر ہے ان کی ساٹھ سال کی متواتر عرق ریزی اور جانفشانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ۶۵ فی صد حبشی اچھی طرح لکھ پڑھ سکتے ہیں اور انہوں نے سائنس اور فلسفہ میں جو ترقی کی ہے وہ قابل داد ہے۔ ان کی زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں ترقی ہمارے لئے اور بھی قابل رشک ہو جاتی ہے جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے تین سو سال کی غلامی کے بعد یہ مرتبہ حاصل کیا ہے جن لوگوں نے حبشیوں کی

ترقی تعلیم کا بغور و تعمق مشاہدہ کیا ہے ان کی رائے ہے کہ وہ آیندہ زیادہ تیزی سے زندگی کی دوڑ میں قدم بڑھائیں گے کیونکہ نوجوان جنبشی علمی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کرتے ہیں۔ راکفیلر فولڈیشن نے وعدہ کیا ہے کہ وہ دس لاکھ ڈالر (۳۰ لاکھ روپیہ) جنبشیوں کی تعلیم کے لئے دیں گے بشرطیکہ اسی قدر روپیہ پبلک کی جانب سے فراہم کیا جائے اس وقت چالیس ہزار جنبشی استاد امریکہ میں بیس لاکھ جنبشی بچوں کو تعلیم دیتے ہیں ۱۹۱۳ء میں فقط شمالی کیرولینا ریاست نے دو لاکھ پچاس ہزار ڈالر جنبشیوں کی تعلیم کے لئے فراہم ہوئے تھے ۱۹۲۲ء میں یہ تعداد چالیس لاکھ ڈالر تک پہونچ گئی اسی طرح ان کے سکول کی عمارتوں میں پانچ لاکھ ڈالر سے پچاس لاکھ ڈالر کا اضافہ ہوا ہے۔

سائنس دانوں کے تخیل کی بلند پروازیاں

حیوانوں کے جو ڈھانچے ایک سال پہلے کے زمین میں سے ملے ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ حیوانات کے دماغ خصوصیت کے ساتھ بڑا بھاری تغیر و تبدل اختیار کیا ہے اور اس کا حجم بڑھ گیا ہے زمانہ حاضرہ کے ماہرین سائنس نے اسی قیاس پر انسانی دماغ کی ساخت پر حکم لگایا ہے جو نہایت دلچسپ ہے ان کا خیال ہے کہ دس لاکھ سال کے بعد انسان کا سر بہت بڑا ہو جائے گا یعنی ایک چھوٹے سے غبارہ کی صورت اختیار کرے گا کیونکہ افکار دماغی ترقی کرتے جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا جو اوپر بیان کیا گیا ہے انسان کی آنکھیں بہت بڑی اور کشادہ ہو جائیں گی کیونکہ ان سے بہت کام لیا جاتا ہے ناک چھوٹی ہو جائے گی صرف دو چھوٹے سے سوراخ رہ جائیں گے۔ کیونکہ قوت شامہ سے بہت کم کام لیا جاتا ہے منہ بھی چھوٹا ہو جائے گا اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ چبانے والی اغذیہ مفقود ہوتی جاتی ہیں ٹھوڑی بھی غائب ہو جائے گی اور نیچے کے جبڑے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ شانے بڑے گردن موٹی ہو جائے گی تاکہ سر کے وزن کو آسانی سے اٹھا سکیں سینہ بہت کشادہ ہو جائیگا

جس [illegible] ہوا کی بہت مقدار حاصل کر سکیں گے معدہ اور پیٹ دونوں مختصر ہو جائیں گے کیونکہ غذا کی مقدار کم ہو جائے گی۔ پنڈلیاں بھی چھوٹی ہو جائیں گی جس کی وجہ یہ ہے کہ پیدل چلنے کی رسم اُٹھ جائے گی بازو، کاندھے بھی کمزور ہو گا انگلیاں لمبی اور باریک ہو جائیں گی اور ممکن ہے ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جائے کیونکہ ان کا استعمال زیادہ ہو جائیگا ناخنوں کی ضرورت بھی نہ رہے گی کانوں کا سائز چھوٹا ہو جائے گا وجہ یہ کہ چہرہ صاف رکھنے کی موجودہ رسم آئندہ نسل پر اپنا اثر ڈالے گی اور قدرتاً اولاد بھی ایسی پیدا ہو گی جو ڈاڑھی مونچھ کی اہلیت نہیں رکھتی ہو گی۔

اس قسم کے انسان کی اگر تصویر بنا دی جائے تو نہایت عجیب اور مضحکہ خیز ہو گی

قدیم زمانہ میں گیڈرے کے ہینگ سے پانی پینے کے پیالے تیار کئے جاتے تھے اور شاہان وقت انہیں استعمال کیا کرتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر اس پیالہ میں زہر ڈال دیا جاتا تھا تو پانی پر بلبلے اُٹھنے شروع ہو جاتے تھے۔

ایک اکیلا کرا سال تمام میں سات لاکھ کیڑے تباہ کرتا ہے جو فصلوں کے لئے مضر ہوتے ہیں۔

ایک تصنیف پر چوبیس ہزار روپیہ انعام | ہز ہائینس سوائی ٹیکو جی راؤ ہلکر نے پروفیسر این ایس ڈکار ناٹک کالج کو سیواجی مرہٹہ کی سوانح عمری لکھنے پر چوبیس ہزار روپیہ انعام دیا۔

میونسپالٹی امرتسر نے بھی مفت اور لازمی تعلیم ۱۶ نومبر سے جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

جامعہ ڈھاکہ کے لئے سرکاری امداد صوبہ بنگال کی مجلس قانونی نے ایک مسودہ قانون منظور کیا ہے جس سے جامعہ ڈھاکہ کے لئے ایک معینہ سالانہ رقم بطور امداد درج موازنہ کی گئی ہے اس مسودہ قانون کے ساتھ ایک رزولیوشن یہ بھی منظور کیا ہے کہ حکومت سے سفارش کی جائے کہ جامعہ کلکتہ کے فارغ التحصیل طلبار کے تحقیقی کام کے لئے موازنہ میں امداد کی گنجایش نکالی جائے۔

جامعہ ڈھاکہ کی مالی حالت یکم جولائی ۱۹۲۱ء اس کی تاریخ قیام سے کچھ یوں ہی سی رہی ہے اور اس وجہ سے اس جامعہ کو اپنے کاروبار میں رکاوٹیں پیش آتی رہی ہیں حالانکہ اس جامعہ کے لئے حکومت ہند نے اراضیات اور عمارات کے فراہم کرنے کے علاوہ مسلسل سالانہ رقومات امدادی عطا کرکے اس کے لئے ساٹھ لاکھ روپیہ جمع کردیا تھا تو اُس وقت اس جامعہ کا مستقبل بہت درخشاں نظر آتا تھا۔ جب اصلاحات سیاسی معرض عمل میں آئیں تو یہ بڑی رقم حکومت بنگالہ کے حوالہ کردی گئی۔ حکومت بنگالہ نے یہ کیا کہ اس رقم کی ادائی یوں قرار دی کہ چار لاکھ بطور سرمایہ ہر سال دئے جائیں اور سالانہ ۵ لاکھ بطور امداد دئے جائیں حالانکہ جنگ کے بعد کی مالی دقتوں اور روپیہ کی کمی سے قبل یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ جامعہ ڈھاکہ کو ساڑھے سات لاکھ روپیہ بطور امداد دیا جائے گا۔

جامعہ ڈھاکہ کی آمدنی فیس اور لگائے ہوئے سرمایہ سے کچھ اوپر ایک لاکھ سالانہ ہوتی ہے اخراجات ۱۲ لاکھ کے ہوتے ہیں۔ اور یہ اخراجات اس قابل قدر قیامی جامعہ کے تجربہ کے لئے ضروری ہیں اور اس تجربہ کی کامیابی کا مدار حکومت کی رقمی امداد پر ہے مجلس قانونی صوبہ بنگال میں مسودہ قانون کی بحث کے دوران میں مسٹر ایف ای جیمز نے مجلس کو یاد دلایا کہ یورپ اور امریکہ میں سرکاری جامعات کو معینہ رقمی امداد دی جاتی ہے تاکہ جامعات کی آمدنی میں کسی قسم کا خرخشہ نہ رہے اور وہ اپنے اخراجات میں کفایت اور کارگذاری دونوں باتوں کو ملحوظ رکھ سکیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مدراس اور دہلی کی جامعوں کو اسی قسم کی

امداد دی جاتی ہے۔

اندھوں کی تعلیم | مسٹر ایچ۔ ڈی چھترا پتی نے۔ جو اندھوں کے وکٹوریہ میموریل اسکول کے پرنسپل ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ بریل کا ابھرے حرفوں کا نظام بعض ہندوستانی زبانوں میں بھی مطابق کر لیا گیا ہے ان ابھرے حرفوں کو اندھے انگلیوں سے چھو کر پڑھنا سیکھ جاتے ہیں۔ مسٹر چھترا پتی نے اس قسم کے مدارس کے سازوسامان کی تفصیل بھی دی ہے جو نہایت دلچسپ ہے۔ یہ مضمون پروگریس آف ایجوکیشن (PRO-Progress of Education) میں شایع ہوا ہے۔

انگریزی املا کی اصلاح | سر مارک ہنٹر بڑی مستعدی کے ساتھ اس بات پر تل گئے ہیں کہ انگریزی املا کی اصلاح میں پوری کوشش کی جائے۔ وزیر اعظم انگلستان کی خدمت میں درخواست پیش کی گئی ہے کہ ایک شاہی کمیٹی اس خصوص میں تحقیق اور رپورٹ پیش کرنے کے لئے مقرر کی جائے۔ اردو کے رسم الخط اور املا میں اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔ اب چونکہ یہاں جامعہ عثمانیہ قائم ہو چکی ہے جس کا ذریعہ تعلیم اردو ہے یہ امید بے جا نہ ہوگی کہ اردو رسم الخط اور املا کے متعلق تحقیق اور تدقیق کے بعد ایسی اصلاحیں کی جائیں کہ اردو کی طباعت اور درس تدریس میں ایک بڑا انقلاب ہو جائے۔ اردو کی طباعت کے لئے جب تک عمدہ ٹائپ وجود میں نہیں آئے گا اردو کی وسعت اور ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ رہے گی۔

---

۲۶ مہر آبان ۱۳۳۳ف کو مدرسہ سلطانیہ قندھار ضلع ناندیڑ میں جلسہ تقسیم اسناد و سالانہ جلسہ بدرسبھا منایا گیا۔ معززین خوش باشان و عام رعایا زائد از چھ سو شریک

جلسہ تھی اس موقع پر صدر مدرس صاحب مدرسہ مذکور نے ایک پر معنی تقریر فرمائی

مدرسہ سنگاریڈی میں عظیم الشان جلسہ ۲۵ و ۲۶ مہر آذر ۱۳۳۵ف کو مدرسہ وسطانیہ سنگاریڈی میں ایک نہایت کامیاب اور عظیم الشان جلسہ زیر صدارت جناب مولوی سید عبدالشکور رضوی صاحب اول تعلقدار ضلع میدک منعقد ہوا۔ جلسہ میں اکثر عہدہ داران مقامی اور دیہاتیوں کا تقریباً ہر طبقہ شریک تھا۔ پہلے روز طلبا نے طرح طرح کے دلچسپ ورزشی کھیل و کمالات اردو سے، روزہ انگریزی اور اردو کی دلگداز نظموں اور تقریروں سے حاضرین سے خراج دعا و تحسین و انعام حاصل کیا جس کے بعد مدرسہ کی ہفت سالہ رپورٹ پڑھکر سنائی گئی اور سامعین نے شاندار نتائج مدرسہ پر خوشنودی و پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ بعد ازاں صدر مدرس کی دعوت اشتراک عمل و اپیل پر فنڈ پر مبلغ ۱۰۰ روپیہ عطیہ پورفنڈ کو مرحمت فرمایا جس کی تقلید بعض دیگر اصحاب نے بھی فرمائی آخر میں جناب مولوی شیخ ابوالحسن صاحب مہتمم تعلیمات ضلع میدک نے اعلیحضرت بندگان عالی اور شاہزادگان و شاہزادیان بلند اقبال کی ترقی عمر و اقبال کے لئے دعا فرمائی جس پر تمام حاضرین آمین کہتے رہے۔

مدرسہ تحتانیہ پالج ضلع ناندیڑ میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں صدر مدرس صاحب نے رعایا کو تعلیم کی جانب توجہ دلائی حاضرین جلسہ نے مبلغ (۵۰) کا چندہ دیا جس سے کتابیں اور سلیٹیں خرید کر بچوں کو مفت تقسیم کی گئیں۔

اشتہارات

مفتاح التعلیم
مولفہ
سید محمد حسین صاحب جعفری بی اے (اکن)

اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں سلیس زبان عام فہم پیرایہ میں یورپ کے جدید ترین اصول وطریقۂ تعلیم کنڈرگارٹن تحریر کئے گئے ہیں اور ایسے طریقہ پر بتلائے گئے ہیں جس کے مطابق تعلیم مدارس تحتانیہ اضلاع میں ہوسکتی ہے اس میں جا بجا تصاویر دیکر مطلب واضح کیا گیا ہے قیمت فی جلد دو روپیہ سکہ عثمانیہ علاوہ محصول ڈاک۔

نوٹ۔ ابتک دفتر رسالہ المعلم میں اس کتاب کے جتنے آرڈر آئے تھے وہ سب ہم نے سید عبدالقادر صاحب تاجر کتب چارمینار کو دیدے ہیں پس براہ کرم دوکان مذکور سے اگر وی پی مفتاح التعلیم وصول ہو تو فوراً واگذاشت فرمالیا جائے۔

یہ امر واضح رہے کہ مفتاح التعلیم کے سابقہ دو ایڈیشن ختم ہوجانے کی وجہ بروقت آرڈر کی تعمیل نہ ہوسکی اب تیسرا ایڈیشن چھپ چکا ہے اس لئے اب کتب مذکور کی بسہولیت ترسیل ہوگی جس قدر نسخے مطلوب ہوں سید عبدالقادر صاحب تاجر کتب چارمینار حیدرآباد دکن سے طلب کیجئے۔

ڈرامہ اردو
مولفہ
مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم

یعنی مہاکوی کالیداس کے ایک مشہور ناٹک کا ترجمہ مع ایک بسیط مقدمہ کہ اس میں ہندو ڈراما کی تاریخ اور نوعیت پر مفصل بحث کی گئی ہے قیمت فی جلد یکروپیہ علاوہ محصول ڈاک

ہدایات برائے مدرسین
مولفہ
سید محمد حسین صاحب جعفری بی اے (اکن)

حین معائنہ مدارس جس قدر بھی ہدایات دیجاسکتی ہیں وہ سب ایک کتاب کی صورت میں شائع کی گئی ہیں اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اہم ترین اور معمولی ہر دو امور کے متعلق ہدایات درج ہیں قیمت فی جلد یکروپیہ علاوہ محصول ڈاک۔

خلاصہ تاریخ انگلستان
مولفہ
مسز فشر

ابتک اردو میں کوئی ایسی مختصر تاریخ انگلستان موجود نہیں تھی جس کے پڑھنے سے انگریزوں کے حالات معلوم ہوسکیں۔ یہ کتاب اگرچہ میٹرک کے نصاب میں داخل ہے مگر ہر شخص اس سے فائدہ حاصل کرسکتا ہے قیمت فی جلد یکروپیہ بارہ آنہ سکہ عثمانیہ علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ

دفتر رسالہ المعلم بلگرامی ہوس سانچہ توپ حیدرآباد دکن

*

قواعد

(۱) یہ محض تعلیمی رسالہ ہے جس میں تعلیم کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے سیاسی یا مذہبی مضامین شریک نہ کئے جائیں گے

(۲) یہ رسالہ ہر ماہ فصلی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۳) پرچہ وصول نہ ہو تو ہر ماہ فصلی کی ۲۵ تاریخ تک خریدار صاحبان بحوالہ نمبر خریداری اطلاع فرمائیں

(۴) جو مضامین ناقابل طبع متصور ہوں گے ان کی واپسی خرچہ ڈاک کی روانگی پر منحصر ہوگی۔

(۵) اس رسالہ کی قیمت سالانہ (بیہ) مع محصول ڈاک ہے جو پیشگی لی جائے گی۔

(۶) نمونہ کا پرچہ بغیر کرنکٹ وصول ہونے پر ارسال کیا جائے گا۔

(۷) جوابطلب امور کے لئے جوابی کارڈ وصول ہونا چاہئے ورنہ ادائی جواب میں مجبوری رہے گی۔

(۸) ابرت ذیل اشتہارات درج ذیل ہے رقم وصول ہونے پر اشتہارات طبع کئے جائیں گے۔

تعداد مدت	صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
ایک بار	۱	۸ / ۱	۸ / ۱
سہ ماہ	۱ / ۱۰	۱۰ / ۱	۸ / ۱
شش ماہ	۱	۱ / ۱۰	۱ / ۱۰
سالانہ	۱ / ۱۰	۱	۱ / ۱۰

(۹) جملہ مراسلت و ترسیل رقوم منی آرڈر وغیرہ موسومہ شریک مدیر پتہ ذیل پر ہونی چاہئے

محمد حفیظ اللہ خاں بی اے شریک مدیر

دفتر رسالہ المعلم بلگرامی ہاؤس سانچہ توپ

حیدرآباد دکن

جریدہ دیسکلہ عالی نشاں

بسرڈ پسہ انگریزی یم نشان ۲۰۰۵ء

جلد دوم

نمبر

المعلم

ع

ماہ اسفندار ۱۳۳۵ سنہ افصلی

مدیر ..... محمد سجاد مرزا یم۔ اے اکنٹنٹ (۱) .....

شریک مدیر ... محمد عظمت اللہ خاں بی۔ اے .....

اعظم اسٹیم پریس چاپینا

حیدرآباد دکن

قواعد

(۱) یہ محض تعلیمی رسالہ ہے جس میں تعلیم کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہونگے سیاسی یا مذہبی مضامین شریک نہ کئے جائیں گے

(۲) یہ رسالہ ہر ماہ فصلی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا

(۳) پرچہ وصول نہ ہو تو ہر ماہ فصلی کی ۲۵ تاریخ تک خریدار صاحبان بحوالہ نمبر خریداری مطلع فرمائیں

(۴) جو مضامین ناقابل طبع متصور ہوں گے ان کی واپسی خرچہ ڈاک کی روانگی پر منحصر ہوگی

(۵) اس رسالہ کی قیمت سالانہ ۸ مع محصول ڈاک ہے جو پیشگی لی جائے گی

(۶) نمونہ کا پرچہ پانچ آنہ کے ٹکٹ وصول ہونے پر ارسال کیا جائے گا

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ وصول ہونا چاہئے ورنہ ادائی جواب میں مجبوری رہے گی

(۸) اجرت طبع اشتہارات درج ذیل ہے رقم وصول ہونے پر اشتہارات طبع کئے جائیں گے

مدت	صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
ایک بار	۷	۴	۲
سہ ماہ	۱۰	۶	۳
ششماہ	۱۸	۱۰	۵
سالانہ	۳۰	۱۸	۱۰

(۹) جملہ مراسلت و ترسیل رقوم منی آرڈر وغیرہ موسومہ شریک مدیر پتہ ذیل پر ہونی چاہئے

محمد عظمت اللہ خان بی۔ اے شریک مدیر

دفتر رسالہ المعلم بلگرامی ہوس پنچہ توپ

حیدرآباد (دکن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صورت اندراجات

المعلم

(۱) تدریس میں ناکامیابی نمبر (۲) ..... از مولوی محمد حسین صاحب ایم۔اے صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ عثمان آباد (۱ تا ۶)

(۲) تاریخ اور اس کی تدریس نمبر (۲) ..... از مولوی مرزا عبدالحمید بیگ صاحب بی اے (۷ تا ۱۵)

(۳) ہمارا طریقہ تعلیم نمبر (۱۳) ..... از مولوی محمد نظام خاں صاحب متعلم جامعہ عثمانیہ و انسٹرکٹر مدرسہ تختیجا کالج بلدہ (۱۶ تا ۲۴)

(۴) تبصرہ ..... شریک مدیر (۲۵ تا ۲۸)

(۵) شذرات (۲۸ تا ۳۲)

(۶) ضمیمہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس مدیر و شریک مدیر (۳۳ تا ۵۶)

جلد ۲ | بابتہ ماہ بہمن سنہ ۱۳۳۵ف | نمبر ۷

تدریس میں ناکامیابی نمبر ۲

۳۔ ناکامیابی بہ لحاظ وسائل تعلیم | تدریس کی کامیابی بڑی حد تک ذرائع تعلیم کے مناسب استعمال پر بھی منحصر ہے۔ یہ ذرائع کثیر التعداد ہیں لیکن ہم یہاں چند اہم اور ضروری وسائل کی بحث پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) بیان اور اس کا طرز ادا | مدرس کو بیان کے حربہ سے اکثر وقت کام لینا پڑتا ہے جب کہ وہ کوئی ایسی شے طلبہ کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے جسے وہ بوجوہ چند ظاہری حواس کے ذریعہ سے

دریافت نہیں کر سکتے۔ متعلمین کے ذہن میں کسی شے کی صاف اور صحیح تصویر منقش کرنے کیلئے اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ معلم کی چشم تخیل کے سامنے اس شے کا واضح اور روشن نقشہ موجود ہو ورنہ بے تکی گفتگو اور نے سر و پا باتیں تو بہت ہوں گی لیکن بیان کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ بہر حال یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ بسا اوقات کسی شے کا تفصیلی اور وافر علم بھی خالی از خطرہ نہیں ہوتا کسی چیز کے طویل بیان سے لڑکے گھبرا جائیں گے۔ ان کی توجہ قائم نہیں رہے گی۔ اس لئے اُن کی دلچسپی بھی مفقود ہو جائے گی۔ وہ تکان محسوس کرنے لگیں گے اور اُن کی قوت فیصلہ زائل ہو جائے گی۔ لہٰذا ہر مضمون میں اہم و غیر اہم اجزا کے مابین امتیاز کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ مدرس کو چاہیئے کہ وہ کسی شے کی صرف مشہود امتیازی خصائص بیان کرے۔ اگر وہ غیر اہم تفصیلات سے بحث کرے گا تو تصویر لامحالہ مضحکہ ہو جائے گی اور اس کی موزونیت و مناسبت بھی جاتی رہے گی۔

بیان میں عجلت اور گریز سے بھی پرہیز لازم ہے۔ جلد بازی کرنے سے طلبہ درس کو پوری طرح سمجھ نہیں سکیں گے اور شئے بیان کردہ کا انھیں صاف اور واضح علم نہ ہوگا۔ گریز سے سلسلہ خیالات کے منقطع ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ الغرض عمدہ اور موثر بیان کیلئے مدرس میں مندرجہ ذیل اوصاف ہونے چاہئیں۔ مضمون سے کامل واقفیت، اہم و غیر اہم میں امتیاز کرنے کی قوت، خوشگوار طرز ادا، زبان کی سلاست، تلفظ کی صحت اور آواز کی بلندی۔ اگر معلم ان تمام خوبیوں کا سرمایہ دار ہے تو وہ جس شے کو بیان کرے گا وہ مجسم بن کر طلبہ کی چشم تخیل کے سامنے آموجود ہوگی اور اگر معلم میں ان اوصاف کا فقدان ہے تو اس کا بیان پر تاثیر نہ ہوگا۔

(ب) سوالات مدرس کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں سوال سازی کی پوری قابلیت ہو۔ کامیاب تدریس کی ایک ضروری شرط معلم اور متعلمین کے مابین سلسلہ مواصلت کا قیام ہے جس کے حصول کے بہترین ذرائع سوالات ہیں۔ مدرس کو

چاہیئے کہ پہلے وہ مضمون درس پر پورا [illegible] طلبہ کی معلومات سابقہ سے کامل واقفیت حاصل کرے۔ ازاں بعد سوالات سازی کی بھی کوشش کرے۔ فی الحقیقت دوران درس میں سوالات نہایت کارآمد ہوتے ہیں۔ سبق کی ابتدا میں بذریعہ سوالات طلبہ کی پرانی اور نئی واقفیت میں ربط اور تعلق پیدا کیا جاتا ہے۔ درمیان درس میں سوالات متعلمین کے غور و فکر کے متحرک ہوتے ہیں اور اختتام سبق پر درس کا نتیجہ سوالات ہی کے ذریعہ سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال سوال سازی کے وقت مدرس کو خیال رکھنا چاہیئے کہ سوالات کی عبارت صاف اور مختصر ہو تاکہ ان میں ابہام و شک کی گنجائش نہ رہے۔ سوالات ایسے ہونے چاہییں کہ ان کا ایک ہی صحیح جواب ہو سکے تاکہ طلبہ کے خیالات ایک ہی نقطہ پر مرکوز اور انکی توجہ ایک ہی جانب مبذول ہو۔ اگر سوالات غیر ربط اور کئی جوابات کے مقتضی ہوں گے تو متعلمین کے خیالات و افکار میں انتشار و پراگندگی واقع ہوگی اور وہ [illegible] کے قیاسی جوابات دینے لگیں گے۔ مدرس کو اس بات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے کہ سوالات غور طلب ہوں جس سوال کا جواب دینے میں طلبہ کو دماغ پر زور دینا نہ پڑے اس کا پوچھنا فضول ہے۔ لہٰذا حتی الامکان "سوالات متعاکس" اور "سوالات متبادلہ" سے پرہیز لازم ہے "سوال متعاکس" یہ ہے کہ کوئی بات بیان کرکے فوراً اسی کو پوچھ لیا جائے۔ جیسے ہمالیہ دنیا کا اونچا پہاڑ ہے۔ دنیا میں سب سے اونچا پہاڑ کون ہے؟ "سوال متبادلہ" اسے کہتے ہیں جس کا جواب دو میں سے ایک ہو سکے مثلاً ہاں یا نہیں۔ اونچا یا نیچا موٹا یا پتلا ہلکا یا بھاری وغیرہ۔ اس کے علاوہ سوالات کا رنگ ڈھنگ۔ وضع قطع بھی مختلف ہونا چاہیئے۔ ورنہ سبق کی دلچسپی جاتی رہے گی اور طلبہ کا دل اچاٹ ہو جائے گا۔ اگر سوالات سازی کے وقت مذکورۂ بالا ہدایات نظر انداز کر دیجائیں تو تدریس موثر نہ ہوگی بہرکیف سوالات کے چند ایک نقائص کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جن سے ہر مدرس کو احتراز کرنا چاہیئے۔ یہ نقائص مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر معرض وجود میں

آتے ہیں (۱) طویل تفصیلی طریقہ سوال (۲) طریقہ استفہامیہ کی مبالغہ آمیز اہمیت (۳) مقصد سوالات کی لاعلمی۔ پہلی حالت میں مدرس وقت کا بڑا حصہ آسان اور معمولی باتوں پر کثیر التعداد سوالات کرنے میں ضائع کر دیتا ہے۔ چونکہ اس قسم کے سوالات طلبہ کے قوائے ادراکی و استدلالی میں تحریک و ہیجان پیدا نہیں کرتے لہٰذا اُن کے دماغ کا فاعلی حصہ مفلوج ہو جاتا ہے متعلمین یہ سمجھ کر کہ ان کو کوئی نئی بات نہیں بتائی جا رہی ہے غور و خوض کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ دوسری صورت میں مدرس کا طریقہ اخذ بالکل غیر معقول و نامناسب ہوتا ہے۔ وہ ہر شے طلبہ ہی سے اخذ کرنا چاہتا ہے۔ گویا اس کے نزدیک تعلیم کا واحد ذریعہ سوالات ہی ہے۔ وہ کبھی بھول کر بھی تقریر و بیان اور توضیح و تشریح سے کام نہیں لیتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ قیاسی جوابات دینے اور خیالی گھوڑے دوڑانے لگتے ہیں۔ اس طرح وقت اور کوشش کا بڑا حصہ فضول برباد ہو جاتا ہے۔ تیسری حالت میں خود معلم سوالات کی غرض و غایت سے ناآشنا ہوتا ہے۔ وہ پہلے ایک سوال کرتا ہے پھر اُسے واپس لیتا ہے اور دوسرا سوال کرتا ہے یا پہلے ہی کچھ ترمیم کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس کے سوالات میں کوئی ربط اور لگاؤ نہیں ہوتا ایسا مدرس رہنما و رہبر کی منزلت سے گر جاتا ہے اور اس پر یہ مصرع صادق آتا ہے مصرع "گم کردہ راہ کے بہ کسے رہبری کند" الغرض اگر طرز سوالات میں مذکورہ بالا نقائص موجود ہوں تو تدریس مفید و مؤثر نہ ہوگی۔

(ج) جوابات سوالات کے سلسلہ میں طریقہ جوابات کا بیان بھی مناسب معلوم ہوتا ہے بسا اوقات اخذ جوابات کا ناقص اور غلط اہتمام ناکامی تدریس کا باعث ہوا کرتا ہے۔ اکثر مدرسین طلبہ کو سوچنے اور غور کرنے کا موقع نہیں دیتے بلکہ نہایت عجلت سے کام لیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کے منہ سے سوال نکلتے ہی طلبہ دھڑ سے جواب دیدیں۔ گویا اُن کے خیال میں معلم اور متعلمین کے درمیان برقی سلک لگی ہوئی ہے کہ ادھر گھنڈی دبائی اُدھر قندیل

روشن ہو گئی۔ اخذ جوابات میں ہرگز غفلت و لاپروائی سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ کوشش کرنی چاہیے کہ طلبہ بعد غور و فکر پورا اور مکمل جواب دیں۔ اس سے اُن کی قوت بیانیہ ترقی کریگی اور ان میں غور و خوض کا مادہ پیدا ہوگا۔ متعلمین کو ادھورا، مبہم اور قیاسی جوابات دینے کی ہرگز اجازت نہیں دینی چاہیے۔ مدرس کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ بیک وقت کئی لڑکے جواب نہ دیں کیونکہ اس سے جماعت میں شور و غل ہوگا اور قیام ضبط میں خلل واقع ہوگا۔ غلط جوابات کی تصحیح یا ادھورے جوابات کی تکمیل کے وقت مدرس کو ترش روئی اور چڑچڑاپن سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ورنہ طلبہ کی گرمجوشی جاتی رہے گی۔ ان کا حوصلہ پست ہو جائے گا۔ ان کی چستی و چالاکی ماند پڑ جائے گی اور جماعت کی چہل پہل کافور ہو جائے گی۔ جماعت صغیر میں بعض اوقات اجماعی جوابات مفید و کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ چھوٹے بچے اجماعی جوابات سے ہشاش بشاش اور زندہ دل نظر آنے لگتے ہیں۔ تھکا ماندی جماعت میں چستی اور چالاکی پیدا ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں بعض شرمیلے لڑکے جو انفرادی طور پر جواب دینے میں منہ نہیں کھولتے وہ بھی اجماعی جواب کے وقت دوسروں کے ساتھ بولنے لگتے ہیں اور اس طرح اُن کا حجاب اور جھجک دور ہو جاتی ہے لیکن باوجود ان خوبیوں کے اجماعی جوابات میں بہتیرے نقائص ہیں۔ لہٰذا اُن کا انسداد لازم ہے۔ اجماعی جواب طلبہ کی ذہنی آزادی اور خود اعتمادی پر ضرب کاری لگاتا ہے اور اُن میں انفرادی ذمہ داری کا احساس پیدا ہونے نہیں دیتا۔

(د) توضیحات | توضیح سے مراد یہ ہے کہ اشیائے غیر معروف کی تشریح بذریعہ اشیائے معلوم و مقروض کیجائے۔ توضیحات کے استعمال سے تعلیم دلکش و دلچسپ ہو جاتی ہے طلبہ مضمون سبق آسانی سے سمجھ جاتے ہیں اور وہ اُن کے دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ کسی چیز کی شکل و خاصیت اور ماہیت و نوعیت طلبہ کے ذہن نشین کرانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ شے اُن کے روبرو رکھدیجائے لیکن جن اشیاء کا احضار مشکل ہو اُن کی

تصویر، نقشہ یا خاکہ استعمال کرنا چاہیئے۔ تصاویر رنگین ہونے کی وجہ سے بچوں کیلئے نہایت مسرت بخش اور دلچسپ ہوا کرتی ہیں۔ لیکن تختہ سیاہ کے خاکے اگرچہ رنگین نہیں ہوتے تاہم تعلیمی اعتبار سے وہ تصاویر کے مقابلہ میں بدرجہا بہتر ہوتے ہیں کیونکہ خاکے حسب ضرورت بڑے یا چھوٹے کھینچے جا سکتے ہیں۔ علاوہ بریں تصاویر میں غیر ضروری تفصیلات اور غیر متعلق چیزیں شامل رہتی ہیں لیکن خاکے طلبہ کے روبرو کھینچے جاتے ہیں لہذا ان کے ذریعہ سے کسی چیز کے مختلف حصوں کا تصور الگ الگ دلا کر اسکے بعد کل شے کا تصور بہت اچھی طرح لڑکوں کے ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔

بہرحال تصاویر و نقشہ جات کے ذریعہ سے جو توضیحات کیجائیں اُن میں مندرجہ ذیل امور کی احتیاط لازم ہے:۔

(۱) چونکہ نقشے وغیرہ کے تمام طلبائے جماعت کے استفادے کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں لہذا وہ موٹے اور جلی خطوں سے کھینچے جانے چاہئیں اور اُن کو دیوار پر ایسی جگہ آویزاں کرنا چاہیئے کہ تمام لڑکے بآسانی دیکھ سکیں۔

(۲) غلط، ناقص اور ناموزوں تصاویر کے استعمال سے پرہیز لازم ہے کیونکہ بچوں کی قوت مشاہدہ پر ان کا بُرا اثر پڑے گا اور وہ اشکال و صُور کا صحیح اندازہ لگانے سے قاصر رہیں گے۔ نقشے صحیح، درست اور صاف ہونے چاہئیں اور اس بات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے کہ وہ بہت زیادہ گھنے اور پیچیدہ نہوں

(۳) تصاویر و نقشہ جات کی تعداد محدود ہونی چاہیئے تاکہ تمام درس انہیں سے نہ بھر جائے بلکہ دیگر ذرائع و وسائل تعلیم کے استعمال کی بھی کافی گنجائش باقی رہے

(۴) تصاویر و نقشہ جات مضمون درس کے مطابق ہونے چاہئیں نہ یہ کہ خود مواد تعلیم ایسا منتخب کیا جائے کہ وہ چند دستیاب ہونے والے تصاویر یا نقشہ جات کے مناسب ہو۔

مذکورۂ بالا اصول کی خلاف ورزی ناکامیابی تدریس کا باعث ہوگی۔ **باقی آئندہ**

محمد حسین

تاریخ اور اس کی تدریس

نمبر (۲)

وسطانیہ تاریخ بحیثیت تاریخ اس طبقہ میں شروع کرانی چاہئے مگر اس میں بھی تفصیلی تاریخ پڑھانے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف ابتدائی ہو۔ مگر واضح ہو کہ ابتدائی تاریخ سے تاریخ کا بالکل بے کار یا سب سے آسان و سہل حصہ مراد نہیں۔ اس سے مراد تاریخ کا اہم حصہ ہے البتہ واقعات کے سلسلہ غیر منتہی ہیں۔ ہے صرف اہم واقعات کا منتخب کرنا کسی قدر مشکل ہوگا لیکن دشوار نہیں ہے۔ استاد اپنی قابلیت سے اس کام کو آسانی سے انجام دے سکتا ہے۔ وہ تاریخ کے اہم اور غیر اہم واقعات میں بہت جلد تمیز کر لے سکتا ہے۔ اس طبقہ کے استاد کا خاص طور پر یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ تاریخی واقعات اور اشخاص کو طلبہ کے سامنے ایسے دلچسپ پیرایہ میں پیش کرے کہ ان کے دلوں سے یہ خیال دور ہو جائے کہ تاریخ محض خشک واقعات کے مجموعہ کا نام ہے۔ علاوہ ازیں اسی طبقہ میں طلبہ میں واقعات کے اسباب و نتائج کا باہم ربط و تسلسل معلوم کرنے کا شوق بھی پیدا کرنا چاہئے۔ اس طبقہ کا حقیقی پروگرام اس طرح بن سکتا ہے کہ طلبہ کو اس طبقہ کی پہلی جماعت میں تاریخ ہند کے ہندو دور کی ابتدائی تاریخ پڑھائی جائے یعنی اس دور کے صرف مشہور اور نامور لوگوں کے حالات و واقعات طلبہ سے اس طرح بیان کئے جائیں کہ ان میں تاریخ کے مطالعہ کا مزید جوش و شوق پیدا ہو۔ اسی طرح اس طبقہ کی دوسری جماعت میں مسلم دور کی ابتدائی تاریخ اور اس کی تیسری جماعت میں انگریزی دور کی ابتدائی تاریخ طلبہ کو پڑھائی جائے۔

پس اس طرح مختلف جماعتوں میں تاریخ کے مختلف حصے پڑھانے سے استاد و طلبہ دونوں کا کام آسان ہو جائے گا۔

فوقانیہ البتہ جب طلبہ فوقانیہ میں پہونچیں تو اُن کو پوری تاریخ تفصیل کے ساتھ پڑھائی جائے اور ان کا دائرہ معلومات صرف تاریخ ہند تک ہی محدود نہ رہے بلکہ ان کو ہندوستان کا رشتہ دوسرے ممالک و اقوام سے بتلایا جائے۔ علاوہ ازیں خاص طور پر اس طبقہ کے طلبہ کو زمانہ حال کے حالات سے بخوبی واقف کر دینا چاہیئے۔ طالب علم کو اس ملک کے دستور و تنظیم صوبوں کے انتظامات۔ محکمہ پولس، صفائی، مال وغیرہ کی بناوٹ سے بھی آگاہ کر دینا چاہیئے۔ ہندوستان کے خاص خاص واقعات و حالات کا مقابلہ دوسرے ممالک کے واقعات و حالات سے بھی کرتے رہنا چاہیئے۔

پس ہمارا یہ پروگرام طریقہ قدیم و جدید دونوں کے مابین ہے۔ اس میں دونوں طریقوں کے فوائد تو آجاتے ہیں مگر ان کے نقائص ایک حد تک دور ہو جاتے ہیں۔ مدرسہ چھوڑنے تک طلبہ تقریباً تین مرتبہ تاریخ ختم کر لیتے ہیں مگر وہ اس سے اکتا نہیں جاتے بلکہ ہر بار تازہ معلومات ہونے کی وجہ سے ان کو اس مضمون سے دلچسپی ہو جاتی ہے۔ البتہ اس طریقہ پر بھی یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ہم طلبہ کو زمانہ حال سے آخر تک بے خبر رکھتے ہیں۔ صرف آخر کے دو سالوں میں ان کو کچھ تھوڑا سا علم زمانہ موجودہ کا ہوتا ہے مگر واضح ہو کہ اس طریقہ سے کم از کم طلبہ میں اس مضمون کے پڑھنے کا شوق ہو جائے گا اور وہ کالج میں جا کر اس سے فائدہ اُٹھا سکیں گے اور اس طرح اس کمی کی تلافی ہو جائیگی جرمنی میں اسی اعتراض کو رفع کرنے کیلئے تاریخ پڑھانے کا ایک بالکل انوکھا طریقہ رائج ہوا ہے۔ یعنی یہ کہ تاریخ کی ابتدا اُس کی انتہا سے شروع ہوتی ہے یعنی طالب علم کو اول زمانہ موجودہ کی اور پھر زمانہ گزشتہ کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے مگر ہمارے خیال میں وہ طریقہ کچھ سود مند ثابت نہ ہوگا۔ کیونکہ جب تک طالب علم کو دستور کے نشوونما تہذیب تمدن اور صنعت و حرفت کی بتدریج ترقی کا حال ابتدا سے نہ بتایا جائے زمانہ جدید کی سمجھ میں مشکل سے آئے گا بھلا جب تک ایک طالب علم کو یہ علم نہ ہو کہ انگلستان کو اس کے

موجودہ دستور کے حصول میں کن کن تبدیلیوں میں سے گزرنا پڑا وہ موجودہ دستور کیسے سمجھ سکتا ہے۔ پس ہمارے خیال میں تاریخ ابتدا ہی سے پڑھانی چاہیئے۔ البتہ طالب علم کو زمانہ موجودہ سے باخبر کرنے کے لئے استاد کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ زمانہ گزشتہ کے واقعات کا مقابلہ زمانہ حال کے واقعات سے کرتا جائے۔ ہمارے خیال میں استاد کا ہر سبق الفاظ "زمانہ قدیم میں" سے شروع ہونا چاہیئے اور اس کا ہر سبق الفاظ "آج کل" پر ختم ہونا چاہیئے اس طرح طلبہ زمانہ جدید کی تحریکات وغیرہ سے بھی باخبر رہ سکتے ہیں۔

پیشتر اسکے کہ ہم تاریخ کی تدریس کے صحیح ذرائع پر غور کریں ہم کو یہ معلوم ہو جانا چاہیئے کہ موجودہ طریقہ تدریس میں کیا کیا خامیاں ہیں۔

تدریس تاریخ کی خامیاں سب سے بڑی خامی تو یہ ہے کہ مدارس میں عموماً تاریخ ایک معمولی کتاب کی طرح پڑھا دی جاتی ہے۔ استاد اس کو باقاعدہ سمجھانے کی کوشش نہیں کرتا اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ اندھے حافظ کی طرح تاریخ کو بلا سمجھے رٹ لیتے ہیں۔ دوسرے تاریخ میں خاندانوں کے نام لڑائی و معرکوں کے حالات صلح نامہ کی شرائط اور سنین کی فہرست پر تو بہت زور دیا جاتا ہے مگر ملک کے دستور اور انتظامی معاملات پر بالعموم سکوت اختیار کیا جاتا ہے۔ اور پھر دور جدید کے مقابلہ میں زمانہ قدیم کے حالات بتانے میں بیشتر وقت صرف ہوتا ہے۔ استاد بالعموم بغیر تیاری کے جماعت میں جاتا ہے اور درسی کتاب کو پڑھا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ تاریخ کو جغرافیہ سے بالکل علیحدہ مضمون خیال کیا جاتا ہے۔ طلبہ سے سوال بہت کم کئے جاتے ہیں اور اکثر دیکھا جاتا ہے کہ سال بھر میں کتاب کا مقررہ حصہ بھی ختم نہیں ہوتا۔ پس کوشش اس امر کی ہونی چاہیئے کہ یہ سب نقائص دور ہو جائیں اور طلبہ میں اس مضمون کی ایک ایک گہری دلچسپی اور اس کا دائمی مذاق پیدا ہو جائے۔

تدریس تاریخ کے ذرائع پس ہم اب ان ذرائع پر غور کرتے ہیں جن سے تاریخ کی تعلیم موثر اور دلکش پیرایہ میں دی جا سکتی ہے

استاد کے فرائض اس ضمن میں سب سے اہم اور ضروری چیز استاد اور اس کی

تیاری ہے۔ اگر تاریخ کی بہترین اور زندہ کتاب کوئی ہو سکتی ہے تو استاد کی جیتی جاگتی تصویر ہو۔ اس کی دلکش آواز ہے۔ اس کو طلبہ کے سامنے تاریخی مشاہیر ایسے عمدہ اور موثر پیرایہ میں پیش کرنے چاہئیں کہ ان کی تصویریں طلبہ کی آنکھوں میں پھر جائیں اور وہ ان کے کیرکٹر کے مطابق ان سے محبت کرنے لگیں یا نفرت کریں۔ ان کی عزت کریں یا ان کو ذلیل سمجھیں۔ تاریخ پڑھاتے وقت استاد کو تعصب یا جانبداری سے کام نہ لینا چاہئے۔ اس کو یہ زیبا نہیں کہ اپنے ملک یا قوم کی تو معمولی سے معمولی بات کو آسمان پر چڑھا دے اور دوسرے ملکوں یا مذہب والوں کے زرین کارناموں کو بھی خاک میں ملا دے۔ [illegible] ہر واقعہ کو اسکے اصلی رنگ میں پیش کرنا چاہئے

پڑھانے سے پیشتر استاد کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ سبق کا اچھی طرح سے مطالعہ کر کے آئے اور صرف کتاب درسی ہی پر انحصار نہ کرے بلکہ متعدد کتابوں سے اپنی تیاری میں مدد لے اول کتاب درسی میں جو لکھا ہے اس کو طلبہ کو سمجھائے اور پھر اس پر رائے زنی بھی کرے استاد کے پاس ایک نوٹ بک کا ہونا ضروری ہے۔ اس کو چاہئے کہ وہ جو سبق پڑھانے والا ہے اس کا خلاصہ اس نوٹ بک کی سیدھی طرف کرے اور الٹی طرف اس سبق کے متعلق وقتاً فوقتاً اور جو مزید معلومات ہوتی رہیں ان کو درج کرتا رہے۔ سبق کے ختم پر وہ طلبہ سے اعادہ کرائے اور ان سے عمدہ عمدہ سوالات کرے۔ پس اس طرح ہر استاد اپنے آپ کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فرانس اور جرمنی میں تاریخ صرف وہی استاد پڑھاتے ہیں جو خاص طور پر اسی مضمون کیلئے تیار کئے گئے ہوں۔ تاہم تاریخ کوئی ایسا مضمون نہیں کہ جس میں خداداد قابلیت اور ذہانت کی ضرورت ہو۔ ذرا سی محنت سے ہر کوئی شخص بشرطیکہ اس کو تاریخ کا صحیح مذاق ہو اس فن کا عمدہ استاد بن سکتا ہے

چونکہ طلبہ پر استاد کے جوش اور اس کی اعلیٰ شخصیت کا یقینی اثر پڑ سکتا ہے اس لئے استاد کو اس بات پر ابھارنا چاہئے کہ وہ جوش سے کام لے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے استاد کی ہمت افزائی کی جائے اور اس کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے

بایں ہمہ معلوم ہونا چاہئے کہ طلبہ کا صرف یہ فرض نہیں کہ وہ کتاب کو اچھی طرح پڑھ لیں

یا اُستاد کے بیان کو بغور سن لیں۔ بلکہ اُن کو بھی اپنے پاس ایک نوٹ بک رکھنی چاہیئے جس میں کہ وہ اپنے سبق یا اُستاد کے لکچر کا خلاصہ اور مختلف باتوں اور چیزوں کے حوالے جو ان کو وقتاً فوقتاً ملیں درج کرتے رہیں۔ خلاصہ درج کرنے سے پہلے اُن کو سبق کو اپنے آپ دہرا لینا ضروری ہے۔

پس اس طرح استاد و طالب علم دونوں کی متفقہ کوشش سے تاریخ کی تعلیم کا اصلی مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

ذرائع تعلیم اس قدر عرض کرنے کے بعد اب ہم ذرائع تعلیم پر غور کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں تاریخ کی تعلیم کے تین ذرائع ہو سکتے ہیں (۱) کتب درسی (۲) زبان اور (۳) ضمیمی مطالعہ۔ ہم سب سے اوّل کتب درسی پر نظر کرتے ہیں۔

کتب درسی۔ کتب درسی کے انتخاب میں اس امر کا خیال رکھنا نے حد ضروری ہے کہ کتاب کسی ایسے شخص کی لکھی ہوئی جس کی اوّل تو تاریخی قابلیت مسلمہ ہو اور دوسرے جو بحیثیت اُستاد کے بھی کافی تجربہ رکھتا ہو تاکہ کتاب لکھتے وقت طلباء کی مشکلات کا خیال رکھا گیا ہو۔ علاوہ ازیں مولف یا مصنف کی ایک یہ خصوصیت ہونی چاہیئے کہ وہ تعصب سے مبرا ہو اور دوسرے ممالک و اقوام کے حالات کو تنگ نظری سے نہ دیکھتا ہو۔ اس کتاب میں اہم واقعات اور چند ضروری سنہ ہونے چاہیں۔ مگر نقشے کثرت سے ہوں اور کہیں کہیں خاندانی شجرے بھی دیئے ہوئے ہوں ممکن ہے کہ سر دست ہندوستان کی ایسی تاریخیں ذرا مشکل سے ملیں مگر مستقبل قریب میں ایسی کتابیں ضرور دستیاب ہو سکیں گی۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ کتب درسی تاریخ کے صحیح مطالعہ میں بہت رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔ یعنے یہ کہ طلبہ اس کو استاد کے حکم بموجب طوطے کی وار رٹ لیتے ہیں اور اس طرح ان کو تاریخ کا شوق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ان کی رائے ہے کہ کوئی کتاب ہی مقرر نہ کیجائے اُستاد کا زبانی لکچر کافی ہو جائے گا۔ مگر ہمارے خیال میں اوّل تو طلبہ میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے ایک کتاب کا ہونا ضروری ہے اور دوسرے تمام کے تمام طلبہ ایسے ذہین اور شوقین نہیں ہو سکتے کہ

استاد کا زبانی لکچر ان کو کافی ہو کبھی کبھی ایک درسی کتاب کی بجائے دو کتابیں بھی تجویز کی جاتی ہیں تاکہ مختلف واقعات کی صحت کرنے کے لئے طلبہ کو بہت سی کتابیں پڑھنی پڑیں اور اس طرح ان میں اوّل تو کتب بینی کا شوق پیدا ہو اور دوسرے ان کی قوت فیصلہ ترقی کرے مگر اس بارے میں بھی ہمارا یہی خیال ہے کہ سب طلبہ ایسے ثوقین نہیں ہوتے کہ وہ بہت سی کتابیں پڑھیں ایسی صورت میں عام نتیجہ یہ ہوگا کہ طلبہ دو کتابیں پڑھ کر پریشان ہو جائیں گے اور ان کو ایک بھی یاد نہ رہے گی پس ہمارے خیال میں صرف ایک ہی کتاب مقرر ہونی چاہیئے۔

زبانی یہ تعلیم کا دوسرا ذریعہ زبانی ہے۔ کتاب خواہ کتنی ہی عمدہ کیوں نہ ہو اس میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور رہ جاتی ہے جو استاد کے خیال میں بشرطیکہ وہ اچھی طرح تیار ہو اس میں چھوٹ گئی ہوگی۔ پس ایسی باتیں استاد طلبہ کو زبانی بتا سکتا ہے۔ زبانی اسباق میں اوّل تو یہ خیال ضرور رکھنا چاہیئے کہ واقعات کی بھرمار نہ ہو۔ اور استاد اس بات کی کوشش نہ کرے کہ جقدر علم اس کو ہے وہ سب طلبہ کے دماغ میں ایک ہی دفعہ ٹھونس دے۔ دوسرے یہ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے تاریخ پڑھاتے وقت استاد واقعات کو عملی اور زندہ نمونہ پیش کر کے واضح کرے اختتام سبق پر طلبہ سے اعادہ کرائے اور بصورت ممکنہ سبق کا خلاصہ تختہ سیاہ پر بھی درج کرے واضح ہو کہ صرف کتاب یا خالص زبانی لکچر سے پورا کام نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر نیچے کی جماعتوں میں ضرورت اس امر کی ہے کہ تدریس بذریعہ کتب درسی و زبانی ساتھ ساتھ ہو۔

تصاویر زبانی تعلیم کا ایک ضروری جزو تصاویر بھی ہیں۔ اکثر باتیں میجک لینٹرن وغیرہ کے ذریعہ سے بہت خوبی کے ساتھ سمجھائی جا سکتی ہیں۔ پس جہاں تک ممکن ہو میجک لینٹرن وغیرہ کے استعمال کو مدارس میں رواج دیا جائے۔ کیونکہ نامور اور مشہور لوگوں کے فوٹو، تاریخی مقامات کے نظارے، پرانے فن تعمیر کے نمونے مثلاً مسجدیں، مندر، گرجے اور خانقاہیں، پنجہ شہر اور گھر، علاوہ ازیں ہتھیار و دستکاری کے اوزار، ذرائع آمد و رفت مثلاً سڑکیں، پل، گاڑیاں، زمانہ قدیم کی کشتیاں و جہاز، ابتدائی انجن و ریل گاڑیاں، لوگوں کے پرانے

لباس وغیرہ وغیرہ تصاویر کے ذریعہ تاریخ پر کافی روشنی ڈال سکتی ہیں۔

تاریخی مقامات تصاویر سے بڑھ کر کسی حقیقی شے کا مشاہدہ ہے یعنی کسی بادشاہ یا خاندان کا حال پڑھنے سے پہلے اگر قریب وجوار میں اس کی تاریخی یادگاریں ہوں تو انکو ضرور دیکھ لینا چاہیئے۔ مثلاً دلی میں اشوک کی لاٹ، قطب صاحب کی لاٹ، پرانا و لال قلعہ، جامع مسجد، آگرہ میں لال قلعہ و موتی مسجد، تاج اور فتح پور سیکری کی عمارات یا حیدرآباد میں گولکنڈہ کا قلعہ وغیرہ وغیرہ تاریخ کے مختلف خاندانوں کے مطالعہ میں کافی مدد دیتے ہیں

عجائب گھر اسی طرح عجائب گھر کی مختلف اشیاء مثلاً سکے، ہتھیار، لباس وغیرہ کا مشاہدہ تاریخ سمجھنے میں کافی مدد دے سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ ان چیزوں پر ایک سرسری نظر نہ ڈالی جائے بلکہ ہر چیز کا معائنہ بغور کیا جائے

جغرافیہ زبانی تدریس کے وقت جغرافیہ کو تاریخ سے ایک علیحدہ چیز سمجھنا سخت غلطی ہے۔ کیونکہ دراصل ان دونوں مضامین کا آپس میں بہت ہی قریبی رشتہ ہے۔ پس تاریخ کے ہر سبق کے وقت طلبہ کے سامنے نقشہ کا رہنا بے حد ضروری ہے۔ جب تک طلبا تاریخی مقامات اپنی آنکھوں سے نقشہ میں نہ دیکھ لیں وہ انکو بہت مشکل سے یاد رکھ سکتے ہیں۔ بلکہ ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ جب کبھی ممکن ہو سکے طلبہ کو میدان جنگ کا نقشہ اور کسی خاص حملہ کا پلین بھی دکھایا جائے تاکہ ان کے ذریعہ طلبہ اس کو اچھی طرح یاد رکھ سکیں۔

کمرہ ہمارے خیال میں تو تاریخ کی جماعت کا کمرہ بھی بالکل علیحدہ ہو اور اس میں تھوڑی بہت ایسی چیزیں ہوں جن سے اس کمرہ کے ساتھ تاریخ کا لگاؤ پایا جائے۔ مثلاً یہ کہ چند مشہور تاریخی کتابیں اور نامور لوگوں کی سوانح عمریاں کسی الماری میں رکھی ہوں۔ دیواروں پر مختلف ممالک کے نقشے لٹک رہے ہوں اور اس کے علاوہ تاریخی عمارتوں مثلاً قطب صاحب کی لاٹ، الورا اجنٹا۔ ویسٹ منسٹر ایبے، مصر کے اہرام وغیرہ وغیرہ کی تصاویر اور پسند تاریخی مشاہیر

شلاً مہاتما اشوک، اکبر، شاہ جہاں، نپولین، واشنگٹن، کرومویل، الزبتھ اور مصطفےٰ کمال وغیرہ وغیرہ کے فوٹوؤں سے بھی کمرہ آراستہ ہو تاکہ ان کو دیکھکر طلبہ کے دلوں میں جوش پیدا ہو۔

ضمیمی مطالعہ | کتب درسی اور زبانی لکچر کے علاوہ تاریخ کی تعلیم کا تیسرا ذریعہ ضمیمی مطالعہ ضمیمی مطالعہ سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ طالب علم جس ملک یا قوم کی تاریخ پڑھ رہا ہو اس کے متعلق اور جتنی کتابیں اس کو مل سکیں ان کو بھی پڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ شلاً اس ملک کی معاشرتی زندگی کے حالات، تاریخی ناول، تاریخی شاعری اور مشاہیر کی سوانح عمری وغیرہ کا مطالعہ بھی طالب علم کے جوش اور مذاق میں کافی اضافہ کرتا ہے مگر مطلب کسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ ہر مدرسہ میں ایک ایک کتب خانہ ایسا ہو جس میں اس قسم کی کتابیں کثرت سے موجود ہوں اور یا کم از کم مدرسہ کے قریب ہی میں اس قسم کا کوئی عام کتب خانہ ہو جہاں سے استاد و طلبہ بغیر کسی مشکل کے کتابیں لیکر پڑھ سکیں۔ کتب خانہ کا وجود طلبہ میں کتب بینی کا شوق زیادہ کرتا ہے۔ علاوہ اس کے عموماً کتب خانہ میں ہر قسم کے اخبار و رسائل بھی منگائے جاتے ہیں اور رسالوں میں اکثر تاریخ کے متعلق مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لہذا کتب خانہ کی وجہ سے استاد و طلبہ ان رسائل سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اختتام | اس مضمون کو ختم کرنے سے پیشتر ہم یہ ضرور کہینگے کہ اس کا مطالعہ اور اس کی تدریس کے ذریعے بظاہر خشک اور دقت طلب معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر کسی کو ایک مرتبہ اس کا چسکہ پڑ گیا تو پھر اس کے نزدیک اس مضمون سے زیادہ دلچسپ اور کوئی مضمون نہیں رہتا۔ جس شخص کو زمانہ گزشتہ کے قصوں سے قدرتی لگاؤ ہو جو انسان کی کوشش اور اس کی تدریج ترقی سے دلچسپی رکھتا ہے اور جو لوگوں کی ناکامیوں اور ان کی جہالت پر اظہار ہمدردی کرتا ہو وہ اور صرف وہی شخص اس کے مطالعہ سے خود بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہونچا سکتا ہے۔ ایسا شخص لوگوں میں دور اندیشی، گہری نظر، ہمدردی، صاف رائے اور حسب ضرورت صداقت پیدا کر سکتا ہے۔

پس اگر تاریخ امور بالا کو پیش نظر رکھکر پڑھائی گئی تو ہم کو یقین ہے کہ وہ طلبہ کے حق میں بہت مفید ثابت ہوگی۔ ہم کو اس خیال کو دل سے دور کر دینا چاہئے کہ تاریخ خشک واقعات کا مجموعہ ہے اور اس میں صرف مردوں کے قصے دہرائے گئے ہیں اور یہ کہ اس کے مطالعے میں جس قدر مشکلات ہیں وہ اور کسی مضمون میں نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ ایک زندہ مضمون ہے۔ وہ ہمارے تخیلات کو بلند کرتا ہے اور ہماری ذہانت کو تیز کرتا ہے۔ وہ اخلاق اور حب وطن کا چشمہ ہے۔ وہ ہماری قوت استدلال کو قوی کرتا ہے اور ہم کو انسان کے سیاسی ارتقا کا حال بتلاتا ہے۔ الغرض تاریخ کا صحیح مطالعہ انسان کو انسان بنا دیتا ہے فقط

مرزا عبدالحمید بیگ بی اے (علیگ)

شمع

جنوری ۱۹۱۰ء سے شمع نہایت آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ غرض ہر لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے۔ ہر مضمون مہذب، تحریک خیال اور معلومات جدیدہ کا بہترین نمونہ ہوتا ہے اور تاریخی، سیاسی، اقتصادی و ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کے معاونین علمی و ادبی میں۔ لائق مدیران شمع مسٹر محمد صہیب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ و مسٹر حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹرایٹ آگرہ ہیں۔ یہ حضرات بہترین تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ اعلےٰ درجہ کے نقاد اور ادیب ہیں اور فن اخبار نویسی سے واقف ہیں اور محض ادبی و علمی خدمت کی آرزو میں رسالہ کی ترتیب میں مصروف ہیں۔ اس میں کوئی ذاتی فائدہ شامل نہیں اور نہ کسی تجارتی اصول پر اس کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ شمع ہر ماہ میں پابندی وقت سے شائع ہوتا ہے۔ تصاویر بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حجم ۱۱۲ صفحہ قیمت سالانہ نمونہ کا پرچہ مفت

منیجر صاحب رسالہ شمع حسن منزل شاہ گنج آگرہ سے طلب فرمائیے

*

ہمارا طرز تعلیم

نمبر (۳)

تعلیم کی ناکامیابی کا دوسرا سبب طلبا کی نے وقعتی ہندوستان میں

اس مضمون کی تمہید میں میں نے بیان کر دیا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کا تمامتر دار و مدار اور ان کی فلاح و بہبود کا کلی انحصار صرف تعلیم پر ہے۔ اب دیکھئے کہ ہماری قوم اس طبقہ کی کیا وقعت کر رہی ہے جس کے ہاتھ میں ملک کی آئندہ ترقی کی باگ ہے اور جو حقیقی معنوں میں تمام ملک کی روح رواں ہے مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ نہ صرف حکومت و امرا بلکہ متوسطین و عامۃ الناس کا برتاؤ بھی طلبہ کے ساتھ حد درجہ مایوس کن اور غیر حوصلہ افزا ہے۔ نہ صرف عملی طور پر طلبہ کے ساتھ بے اعتنائی برتی جاتی ہے بلکہ یہ امر انکے دلوں پر نقش کر دیا جاتا ہے کہ وہ انکے کمترین درجہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بازیگاہ عالم میں انکا پارٹ صرف اس قدر ہے کہ بیل کی طرح سے دن بھر جتے رہیں۔ اپنی زندگی کمنیہ پست حالت میں بسر کریں اور معمولی قسم کی خوراک اور ادنیٰ درجہ کی پوشاک پر اجوان کے نصیبوں میں لکھی ہے اقانع رہیں۔ ہماری سوسائٹی میں طالب علمی اور فلاکت و مفلسی مراوف سمجھے جاتے ہیں۔ اگر کسی طالب علم میں آزادی اور بلند پروازی کی جھلک اس کے ابتدائی زمانہ سے نظر آنے لگے تو ممکنہ کوشش اس امر کی کی جاتی ہے کہ اس کے ان آزادانہ خیالات کو پامال کر دیا جائے، اس کے جذبات کو ابھرنے نہ دیا جائے۔ غرض قول و فعل سے یہ امر اس کے ذہن نشین کر دیا جاتا ہے کہ وہ نہایت ادنیٰ مخلوق ہے اور اس کو کسی اعلےٰ رتبہ تک پہونچنے کا خیال بھی دل میں نہ لانا چاہیئے۔ ذی اقتدار حکام اور امرا و رؤسا تو درکنار خود اس کے پرنسپل اور پروفیسر اس سے ملنے میں اپنی کسرشان سمجھتے ہیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کا دل [illegible] ہے۔ وہ انتہا درجہ کا ڈرپوک

اور پست ہمت ہو جاتا ہے۔ اُس میں اس کی صلاحیت نہیں رہتی کہ عملی دنیا میں کوئی دلیرانہ اور نمایاں کام انجام دے کے۔ سفر و سیاحت اُس کے لئے ایک انوکھی چیز ہے۔ اسکی دنیا اس کا مدرسہ ہے یا گھر۔ ملک سے باہر نکلنے کا تو کیا مذکور بہت کم طلبہ ایسے ہوں گے جن کو شہر سے باہر نکلنے کا کبھی موقع ملا ہو۔ جلائے عقل کے ان ذرائع کا فقدان اس کو بالکل ناتجربہ کار اور بیرونی دنیا سے غافل بنا دیتا ہے۔ اُسے یہ تک خبر نہیں ہوتی کہ اُس کے شہر سے باہر کیا ہو رہا ہے اور زمانہ کس رفتار پر چل رہا ہے۔ ایک گولر کے کیڑے کی طرح گھر کی چار دیواری یا کالج کی عمارت اُس کی کل کائنات ہے جس کے باہر نکلنے کا اس کو کبھی موقع نہیں ملتا۔

پروفیسر اور اساتذہ جو اُن کی تعلیم کے لئے مقرر ہوتے ہیں انکے انتخاب میں کوئی احتیاط اور دور اندیشی نہیں کیجاتی۔ فقط سفارشی ٹٹوؤں اور لمبے لمبے دم چھلے رکھنے والوں کا انتخاب کر لیا جاتا ہے جو اپنے آپ کو طلبہ سے ایک بالاتر ہستی سمجھتے ہیں۔ جس ان سے اُنکا تقرر کسی پروفیسری پر ہو جائے وہ مطالعہ کتب کو گناہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر کبھی کسی طالب علم نے اُن سے ایسا سوال کیا جو خود اُن کو نہ معلوم ہوا تو بجائے اپنے نارسائی کا اعتراف کرنے اور تحقیق و تجسس کے الجھن پوچھو جو اُن کی سمجھ میں آیا بتلا دیا۔ چاہے وہ غلط ہو یا صحیح۔ اس کے ساتھ طلبہ کو بڑے بڑے مصنفوں اور فلاسفروں کے نام اور اُن کے اقوال سنا سنا کے مرعوب کر دیا جاتا ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ جو کچھ کتابوں میں لکھا ہے وہ گویا نوشتہ آسمانی ہے۔ جس میں کسی قسم کی تحریف ممکن نہیں۔ طلبہ کو ہر گزشتہ اہل قلم کی رائے کا پابند کرایا جاتا ہے اور اس کو بغیر سوچے سمجھے تسلیم کر لینا پڑتا ہے۔ غرض ہمارے ابتدائی طریقہ پر وفیسر ہماری اور بچینائی ہماری ذاتی رائے اور ہمارے خیالات کو اس درجہ کچلنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کالجوں سے نکلنے کے بعد ہماری کوئی رائے ذاتی اور کوئی خیال آزادانہ نہیں ہوتا۔ ہم سنتے ہیں اوروں کے کانوں سے، ہم دیکھتے ہیں اوروں کی آنکھوں سے، ہم کہتے ہیں اوروں کی زبانوں سے۔ پھر بھلا ایسے نونہالوں سے کیا توقع کی جا سکتی

ہو کہ وہ دنیا میں کچھ کر سکیں گے۔ اب ذرا دیکھئے کہ وہ قومیں جو آج عالم کی سرتاج بنی ہوئی ہیں طلبہ کے طبقہ کی کیا وقعت کرتی ہیں۔

اس وقت آکسفورڈ اور کیمبرج کے طلبہ کے ساتھ ایسے خاص مراعات کئے جاتے ہیں جو یہاں کسی بڑے سے بڑے شخص کو بھی نصیب نہیں۔ وہاں کسی طالب علم کو سنگین سے سنگین جرم کی پاداش میں بھی پولیس گرفتار نہیں کر سکتی۔

طالب علم کے خلاف کوئی مقدمہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی عدالت کے سوا کہیں دائر نہیں کیا جا سکتا۔ طلبہ تمام ایسی تاریخی عمارات بلا کسی روک ٹوک کے دیکھ سکتے ہیں جو دوسروں کیلئے ممکن نہیں۔ سیر و سفر وہاں کے طالب علموں کی زندگی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ ہر طالب علم بعد حصول اجازت انگلستان کی پارلیمنٹ میں جا سکتا ہے۔ جس طرح ہمارے پاس طالب علم کا تھیٹر اور سینما میں بیٹھنا ناپسندیدہ خیال کیا جاتا ہے وہاں اس کو ادنیٰ درجہ میں بیٹھنے کی سخت ممانعت ہے۔ کیونکہ اس سے اس کی نئے وقعتی متصور ہوتی ہے جو عین یونیورسٹی کی توہین خیال کی جاتی ہے۔

میرے ایک دوست ذکر کرتے تھے کہ ان کے قیام آکسفورڈ کے زمانہ میں جو مباحثے ہوتے تھے ان میں ممبران پارلیمنٹ اکثر شریک رہتے چنانچہ ایک دفعہ وہاں سٹرلائڈ جارج کی پالیسی بحث ہوئی صدر نشین جلسہ کی ایک جانب خود مسٹر لائڈ جارج کھڑے ہوئے اور دوسری جانب ایک معمولی طالب علم۔ طالب علم نے سٹرلائڈ جارج کی پالیسی پر اعتراضات کرنے شروع کئے اور جب ایک نہایت زبردست تقریر کے بعد وہ اپنی جگہ بیٹھ گیا تو سٹرلائڈ جارج نے جواب میں ان اعتراضات کی تردید کرنے سے پہلے کہا کہ اب تک میں صرف ہماری پارلیمنٹ کے ممبروں کو اعلیٰ درجہ کا متدبر سمجھتا تھا لیکن مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ ہماری یونیورسٹی کے طلبہ بھی ان سے کچھ کم نہیں"۔ اس کے بعد انھوں نے ان اعتراضات کے جواب دئے۔

قابل غور بات ہے کہ انگلستان کا وزیر اعظم سامنے کھڑا ہے اور ایک معمولی طالب علم اس کے

نہایت دریدہ دہنی کے ساتھ اعتراض کر رہا ہے جس کے جواب میں وزیر اعظم اُس کی تعریف کرتا اور اُس کی غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیا ہماری یونیورسٹیوں کا کوئی طالب علم اس کی بھی جرأت کر سکتا ہے کہ اپنے پروفیسر کے بتائے ہوئے کسی لفظ پر اعتراض کر سکے یا اُس کے نازیبا طرز عمل پر نکتہ چینی کرے۔ اب دیکھنا یہ چاہیئے کہ آیا وہ قوم ترقی کر سکتی ہے جو دنیا کی کسی عظیم سے عظیم طاقت کی بھی پروا نہ کرے یا وہ لوگ ترقی کر سکتے ہیں جو ایک پروفیسر یا پرنسپل تک سے شیک ہینڈ کرنے سے ایسے ہچکچائیں جیسے ایک خاکروب کسی مجلس شوریٰ میں آنے سے؟ پس جب تک ہمارے طلبہ کی وقعت جیسی کہ چاہیئے نہ ہوگی اور اُن کو آزادی رائے کا پورا موقع نہ ملیگا اُن سے اس کی توقع رکھنی محض فضول ہے کہ وہ دنیا میں کوئی ایسا کام کرینگے جو اُن کے ہم قوموں کے لئے باعث فخر ہو۔

تیسرا سبب زیدنشل سسٹم کا نہونا تعلیم کے لئے وقت کا تعین کرنا سخت غلطی ہے طالب علم کے واسطے ہر نئی چیز کا حاصل کرنا تعلیم ہے اور اس کے لئے وقت مقرر کرنیکی کوئی ضرورت نہیں۔ جو وقت ملے جو ملے جہاں ملے اس کو اپنا مال سمجھکر حاصل کرنا چاہیئے۔

(لیکن یورپ و امریکہ کی حالت اس کے مخالف ہے)

ہندوستان میں جہاں کا ماحول نہایت تاریک اور جہاں طلبہ کا گرد و پیش بالکل جاہل ہے پانچ چار گھنٹے کی تعلیم ہرگز کافی نہیں۔ نہ تو یہاں طبقہ اناث ہی کچھ لائق ہے کہ کمسن لڑکے اپنی ماں کی گود میں کچھ سیکھ سکیں نہ یہاں ایسی سوسائٹیاں اور علمی مجلسیں قائم ہیں جہاں طلبا کو اپنی معلومات وسیع کرنے کا موقع ملتا رہے۔ ایسی صورت میں ۲۴ گھنٹوں میں سے صرف دو چار گھنٹوں کی تعلیم اُن کے دل پر کیا خاک اثر کر سکتی ہے۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ہندوستانی کالجوں میں زیدنشل سسٹم قائم کیا جائے۔ جہاں نہایت لائق و تجربہ کار پروفیسر لڑکوں کے ساتھ قیام کریں اور اُن سے نے تکلفانہ تعلقات رکھیں [illegible] تعلیم سے بدرجہا زیادہ طالب علم اپنے پروفیسروں کی صحبت میں [illegible] اصول خصوصاً ہندوستان کے لئے نہایت ضروری بلکہ ناگزیر ہے کیونکہ یہاں کے طلبہ کا ماحول

بہ نسبت دنیا کے دوسرے حصوں کے زیادہ تاریک اور غیر تعلیمیافتہ ہے چنانچہ مسٹر ایف ٹیلبو تھامسن اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ "ہندوستان طبقہ متوسطین و امرا کی قلت کی وجہ سے مشہور ہے اور یہاں کے عوام کالانعام زبان گروہ جو بسبب کثیر التعداد ہے دوسرے متمدن ممالک کے بہ نسبت بہت زیادہ جاہل ہے۔ صرف اپنی فرقہ داری اور مقامی تنازعات میں منہمک رہنے کی باعث وہ شاذ و نادر ان باتوں میں حصہ لیتا ہے جن پر اعلےٰ طبقہ میں نہایت سرگرمی کے ساتھ بحث ہوا کرتی ہے اور عموماً انتہائی ظلم و ستم سہنے کے بعد بھی وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا" ایجوکیشنل کمیشن رپورٹ میں بھی ہے کہ "ہندوستانی طالب علم کا ماحول اعلےٰ نمونے کے کیرکٹر کی ارتقا کے لئے بسا اوقات موافق نہیں ہوتا۔ نہ تو اس کے مطالعہ کے دوران میں اور نہ اس کی تفریح کے موقعوں پر طالب علم کو اپنے گرد و پیش کے لوگوں میں ایسی باتیں ملتی ہیں جو اُسکے ذہنی شاغل کے ہمرنگ ہوں۔ اس لئے اس کو ناواقفیت اور بے علمی کی آب و ہوا میں زندگی گزارنی پڑتی ہے۔

پس ایسی صورتوں میں طلبہ کو اس جاہل اور غیر تربیت یافتہ ماحول سے الگ رکھنے کی اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی کہ ہندوستان میں رزیڈنشل سسٹم قائم کیا جائے جہاں لائق اور علم کے شیدا پروفیسروں کی ایک کافی تعداد طلبہ کے ساتھ قیام کرے اور ان سے نہایت بے تکلفانہ بلکہ دوستانہ تعلقات رکھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جو طلبہ ایسے شایستہ اور مہذب ماحول سے نکلیں گے وہ نہ صرف علمی بلکہ اخلاقی اور معاشرتی خوبیوں کے مجسم نمونے ہوں گے ایسے ہی طلبہ قوم و ملک کو فائدہ پہونچا سکتے ہیں اور ہمیں ایسوں ہی کی ضرورت ہے

چوتھا سبب کا آمد مضامین کی طرف سے نئے توجہی

عقلمند انسان اُن تمام دشواریوں کا مقابلہ کرنے کیلئے قبل از قبل تیار رہتا ہے جو آئندہ زندگی میں اُس کو پیش آنے والی ہیں۔ اور حقیقی تعلیم وہی ہے جو انسان کو اس قابل بنا دے کہ وہ آئندہ زندگی کی مراحل و منازل بحسن و خوبی طے کرسکے۔ اس وقت جو تعلیم ہم کو دی جارہی ہے وہ اس مقصد کو پورا کرنے

میں یقیناً ناکام ثابت ہوئی۔ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں ہائی اسکول تک کم و بیش دس مضامین کی تعلیم دیجاتی ہے جس میں نصف سے زائد لازمی ہیں۔ اگر طالب علم کسی ایک مضمون میں فیل ہو جائے تو اس کو اپنی عزیز عمر کا ایک سال (یا جتنا زمانہ اس کو کامیابی میں لگے) صرف کرنا پڑتا ہے۔ غریب طالب علم پریشان ہو جاتا ہے کہ کس کس مضمون کی طرف توجہ کرے۔ اس کا دماغ عمر عیار کی زنبیل ہو گئی جس میں دنیا بھر کی بلا بند ٹھونس دیجاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیچارہ طالب علم اس بار کو نہیں سنبھال سکتا اور اپنا عزیز اور لاقیمت وقت اسی جھمیلے میں پڑکر برباد کر دیتا ہے۔ اور اگر محنت شاقہ اٹھاکر اس نے کامیابی حاصل بھی کرلی تو ہر مضمون میں ادھورا رہتا ہے۔ ان مضامین بھی کیسے؟ جو آئندہ زندگی میں چلکر کسی مصرف کے نہیں ہوتے۔ بھلا ایک طالب علم کو حوقانون پڑھنا چاہتا ہے جبر و مقابلہ، ساحت اور اقلیدس کے مقالے کیا فائدہ بخش سکتے ہیں؟ تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور ادبیات کے سوا کیا کسی ہندوستانی یونیورسٹی میں ایسے بھی مضامین پڑھائے جاتے ہیں جنکی بنی نوع انسان کو سخت حاجت ہے؟

کیا ہماری کسی یونیورسٹی میں اس کی بھی تعلیم دیجاتی ہے کہ حفظان صحت کے کیا اصول ہیں؟ بنی نوع انسان کی نرم و نازک بدن کو ان مہلک اور خطرناک امراض سے بچنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا چاہئے جو عالمگیر ہو رہے ہیں اور جن میں مبتلا ہو کر ہمارے ناتجربہ کار طالب علم اپنی صحت و عافیت بلکہ بسا اوقات اپنی شیریں اور عزیز زندگی کو بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ کیا خدانخواستہ کبھی یہ سننے میں آیا کہ کسی ہندوستانی یونیورسٹی میں شہسواری، نشانہ بازی، تیراکی، ملاحی، صناعی، موسیقی وغیرہ اختیاری یا لازمی ہیں؟

صد ہزار افسوس! بلا کسی استثناء و امتیاز کے ریاضی کی کٹھن اور تاریخ انگلستان کی دشوار تعلیم تو لازمی رکھی گئی ہے مگر ان مضامین کا کہیں پتہ نہیں جن کی ہر انسان کو اپنی روزمرہ زندگی میں شدید ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔

جو چیزیں اس وقت ہماری یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہیں اُن میں بھی خیالی مضامین کو ایسی غیر متناسب اور بے ضرورت اہمیت دی گئی کہ عملی اور کارآمد مضامین کا خون ہو گیا چنانچہ ایسی بے ڈھنگی تعلیم کی شکایت کرتے ہوئے سر ٹیچر ڈٹپل (جو ہندوستان میں ایک عرصہ تک بنگال کے لفٹننٹ گورنر اور گورنر بمبئی تھے اور بعد میں انڈیا آفس کونسل کے ممبر ہو گئے) اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں کہ "ہندوستان میں اعلےٰ تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں ادبیات اور فلسفہ کی تعلیم پر ضرورت سے زیادہ توجہ کی گئی اور مادی علوم یعنے سائنس اور عملی فنون کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قانونی عدالتی اور انتظامی شعبوں کی جانب لوگ آنڈیٹ ہیں۔ اس کے برخلاف عملی پیشے مثلاً انجنیری کیمیا سازی نباتات اور فلاحت وغیرہ تغافل کا شکار رہے اور ان میں لوگوں کا قحط ہو گیا۔" اسی طرح انگلستان کے ایک پالیٹشن اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ "مدارس فوقانیہ اور کالجوں میں جو اسی ہزار طلبہ داخل ہیں وہ ملک کے ضروریات سے بہت زیادہ ہیں تعلیمیافتہ لوگوں کے لئے جو شعبے موزوں ہو سکتے ہیں اُن میں اب قطعاً کوئی گنجایش باقی نہیں اور جگہ نہ پانے والے دل برداشتہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد رہ جاتی ہے جو ادھر سے ناکام ہو کر اپنے دل کا غبار کبھی سرکار پر اعتراض کر کے نکالتی ہے کبھی عہدہ داروں پر طرح طرح کے طوفان اٹھاتی ہے کبھی لوگوں پر ناجائز دباؤ ڈال کر روپیہ وصول کرتی ہے اور کبھی باغیانہ خیالات پھیلاتی ہے۔ کاروبار اور پیشوں میں تو اُن لوگوں کے مقابل جو اُن سے زیادہ اہل ہیں اُن کو فروغ نہیں ہوتا اور قوم کے قدامت پسند افراد اکثر اُن سے بدگمان ہوتے ہیں بلکہ بعض دفعہ ذات باہر بھی کر دیتے ہیں۔

ایسی صورت میں اگر موقع بالکل ہاتھ سے نکل گیا ہو تب بھی اُن لوگوں کو کوئی ایسا بیوپار یا پیشہ نہیں ملتا جسے وہ اختیار کر سکیں۔ اس حالت میں اگر یہ بالکل از کار رفتہ نہ ہو جائیں اور کسی سوداگر یا کارخانہ دار کے ہاں کوئی نہایت ہی ادنیٰ تنخواہ کی منشی گری اُن کے ہاتھ لگ جائے تو اسی کو اُن کی بڑی خوش نصیبی سمجھنی چاہیئے۔"

میں گورنمنٹ کے کسی انتظام کو اتنا ناقص وقابل اعتراض نہیں پاتا جتنا انتظام تعلیم۔ تعلیم کو گورنمنٹ نے اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے اور جب رعایا کو آپ اپنی تعلیم کے سنبھالنے کا سلیقہ نہ ہو تو بلاشبہ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ تعلیم کا انتظام کرے۔ لیکن جو کچھ گورنمنٹ نے اب تک کیا ہے اُس کا نتیجہ تو یہ ہے کہ کچھ لوگ نوکریاں پاتے ہیں اور وہ اپنی جگہ خوش بھی ہیں اور اکثر نے معاش پڑے پھرتے ہیں۔ نوکری ملتی نہیں۔ اور سوائے نوکری کے نہ اُن سے کوئی کام ہو سکتا ہے اور نہ اُن کو کوئی کام آتا ہے۔ یہ ایک تعلیم کے بڑے خطرناک نتیجے ہیں۔

غرض کارآمد مضامین کو نظر انداز کرکے [illegible] لاد دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ "چار پائے بر و کتابے چند" کے مصداق بن گئے اور اسی ایک صدی کے عرصہ میں ہمارے کالجوں سے ایک شخص بھی ایسا پیدا نہ ہو سکا جو ہمارے ہم وطنوں کے لئے سرمایہ ناز ہوتا۔

بات درحقیقت یہ ہے کہ بہ صداق

ہر کسے را بہر کارے ساختند
میل اُو را در دلش انداختند

ہر انسان فطرتاً ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اُس کے رجحانات تمام تر اُسی طرف ہوتے ہیں۔ اگر اس کو اُسی چیز کی تعلیم دلوائی جائے جو بالطبع اُسے مرغوب ہو تو وہ اُس مضمون کا ماہر بن سکتا ہے اور دنیا میں یہی صورت کامیابی کی ہے۔ چنانچہ آج یورپ کی تمام عظیم الشان یونیورسٹیاں یہی کر رہی ہیں کہ ابتداءً تھوڑی سی جنرل تعلیم دینے کے بعد طالب علم کو کسی ایک مضمون میں اسپیشلائز کرتی ہیں اور اُس کے اُن خوابیدہ فطری رجحانات کو جو کسی ایک مضمون کی طرف مائل ہوتے ہیں اس درجہ اُبھارتی اور ترقی دیتی ہیں کہ اُس کا علم (اُس خاص مضمون کی حد تک) درجہ کمال کو پہنچ جاتا ہے اور وہ اپنے مذاق کے

مضمون کا اسپیشیالسٹ بن جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس ایک صدی کے عرصہ میں ہماری درسگاہوں سے نہ کوئی نیوٹن انشاپرداز نکلا نہ وحید العصر سائینٹسٹ، بھلا انسان کا ایک دماغ پچاسوں مضامین میں کیسے مہارت پیدا کرسکتا ہے؟

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی طلبہ کسی ایک مضمون میں کامل اور کسی شعبہ میں ماہر نہ ہوں بلکہ ہر مضمون میں ادھورے اور ناقص رہ جائیں۔ اگر اس ایک صدی کے عرصہ میں ہر طالب علم کو اُس کے مذاق کے موافق تعلیم دیجاتی اور جس طرف اس کا رجحان ہوتا اُسی میں اُس کو کامل کرنے کی کوشش کیجاتی تو یہی ہندوستان جو آج قحط الرجال کی صدائیں لگا رہا ہے اسوقت ماہرین علم و حکمت کا مرکز ہوتا۔

سر چارلس ٹرنر (سابق چیف جسٹس) نے اس ۱۸۸۱ء کے جلسہ تقسیم اسناد کے ایڈریس میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ایک اور خاص اور مختلف پہلو بھی ہے جس میں کالج کی تعلیم اب تک یقیناً ناکام ثابت ہوئی سوائے چند شاذ استثنیات کے پوویریٹوں کی گریجوئیٹس کی طول طویل فہرست میں کوئی ممتاز عالم نہیں ملتے۔ اس کے دو وجوہ ہیں ایک سبب تو وہ خاص صورت ہے جو یہاں کی یونیورسٹیوں کے نظام نے ابتدا میں اختیار کی تھی۔ ابتداً اس نظام کا مقصد کسی خاص فن میں مہارت پیدا کرنے کا شوق دلانیکے بجائے عام تعلیم دینا تھا حال کی تمام جدید اصلاحات کا رجحان ان کثیر مضامین کو گھٹا دینے کی طرف ہے جو تجربہ سے غیر ضروری ثابت ہوئے ہیں"۔ آج پینتالیس سال کا عرصہ گزرا کہ سر چارلس ٹرنر نے اس نقص کی طرف توجہ دلائی تھی مگر افسوس ہے کہ اب تک اسکا کوئی علاج نہیں ہوا اور آج بھی مضامین کی کثرت طلبہ کے ہوش بگاڑے دیتی ہے۔ غرض اس آفت کے دور کرنے کی کوشش جلد سے جلد عمل میں آنی چاہیئے تاکہ غریب ہندوستانی طالب علم گھبرا کے یہ چیخ اُٹھے کہ ع

"حیران ہوں دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں" **باقی آئندہ**

محمد اعظم خاں

تبصرہ

روح تنقید ابوالحسنات سید غلام محی الدین صاحب بی۔ اے جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ موصوف نے "روح تنقید" کے نام سے ایک کتاب فن تنقید پر شائع کی ہے اس کتاب کے پڑھنے سے سب سے پہلے تو اس بات کی خوشی ہوئی کہ جامعہ عثمانیہ کی آغوش علمی کے پروردہ نوجوان علمی سرگرمی کے اس راستہ کی طرف مائل ہو رہے ہیں جو اس یونیورسٹی کے قیام کا اصل مقصود ہے۔ وہ مقصود یہ ہے کہ یہاں کے دماغ بھی علم کے ہر شعبہ میں تخلیقی کارنامہ پیش کریں۔ تخلیقی سرگرمی سے پہلے ان ملکوں میں جہاں ابھی ذہن پیدا ہو جائے تنقیدی روح کا وجود میں آنا ضروری ہے۔ تنقید کا منشاء ہر کھوٹے کھرے کا پرکھنا۔ اس کی بنیاد فہم عامہ ہے۔ اور جس وقت آپ کا ایک نوکر ایک نوٹ بھناتا ہے اور اس کے جو روپیہ ملتے ہیں ان کو شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے اچھالکر چھنکاتا ہے تو وہ وہی عمل کرتا ہے جو ایک نقاد کسی مصنف کی کتاب یا شاعر کی نظم پڑھ کر کرتا ہے۔ مصنف کے خیالات کو وہ بھی جذبات کی انگلی اور فہم عامہ کے انگوٹھے سے ذہنی فضا میں اچھالکر چھنکاتا ہے اور ان کے کھوٹے کھرے کا تصفیہ کرتا ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس عجیب و غریب دنیا میں ہر چیز کی حدود معین ہیں۔ تنقید کی بھی حدیں ہیں۔ اگر تنقیدی رجحان بھی حد سے تجاوز کر جائے تو ایک طرح کا خبط سا ہو جاتا ہے اور فائدہ پہونچانے کے بجائے ترقی میں رکاوٹ بن جاتا ہے تنقید وہی اعلےٰ درجہ کی ہے جو ملک میں تخلیقی رجحان والوں کو سہمائے نہیں ان کا دل بڑھائے۔ ادب کی چیزوں کو اس طرح پرکھے کہ ہونہار دماغوں کو آنچ کی لینے کی سوجھ

اور جس بحث پر بحث کی ضرورت ہو اُس کو اُٹھتے ہوئے دماغوں کے سامنے اُبھار کر پیش کرے۔ ایسی تنقید کے لئے ہی انگلستان میں تخلیقی تنقید کی اصطلاح گھڑی گئی ہے تنقید در اصل خود کچھ پیدا نہیں کر سکتی بلکہ پیدا کرنے والوں کے کارناموں کو جانچتی ہے اور اُن کی تعبیر اس طرح کرتی ہے کہ عامۃ الناس کا بیشتر حصہ اُن کارناموں کو سمجھ اور اُن سے لذت اندوز ہو سکے۔ اور اعلےٰ ترین تنقید کی صورت میں نئی راہوں کی جانب جدید پسند دماغ راغب ہو جائیں

اس کی سخت ضرورت ہے کہ اُردو ادب کی دنیا میں اصول تنقید اس طرح پیش کئے جائیں کہ عام طور پر لوگ تنقید کی حقیقت اور اُس کی حدود سے آشنا ہو جائیں یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض نوجوان طلبہ بیسویں تنقید کو ہی ادب کی ابتدا اور انتہا سمجھنے لگتی ہیں اور یہ رجحان ہندوستان کی جامعوں نے پیدا کیا ہے پروفیسروں کی زبانوں پر ہر وقت تنقید تنقید کا ورد ہوتا ہے۔ امتحانی پرچوں میں لفظ تنقید کی بھرمار ہوتی ہے شیکسپیئر پر تنقید کے سوال دئے جاتے ہیں اور توقع کی جاتی ہے کہ دو تین گھنٹوں میں امتحان کے امیدوار حق تنقید ادا کر دیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر جامعہ کا طالب علم تنقید پر پلا رہتا ہے اور کس برتے پر؟ پروفیسروں کے لکھوائے نوٹ اور امتحان پاس کرانے والی حشرات ارض کی سی کتابوں کے بل پر۔ ایسے دماغ کہ خود تنقیدی اسپرٹ سے بچ جائیں اور اپنے بل پر کسی مصنف یا شاعر کی تعبیر کر سکیں۔ عموماً آپ کو ہندوستانی کالجوں کی دنیا میں نہیں ملیں گے ایک اور خدا کی مار ہندوستانی طلبہ پر یہ ہے کہ یہ ساری تنقیدی غذا غیر زبان میں ہوتی ہے اور اس لئے اور بھی ذہنی معدہ کے لئے ثقیل ہو جاتی ہے۔ ہندی کالجوں میں ایسے طلبہ بھی کبریت احمر کا حکم رکھتے ہیں جو تنقیدی اصول کو سمجھ بوجھ کر اپنی زبان میں پیش کریں۔ اس نقطۂ نظر سے بھی مولوی غلام محی الدین صاحب نے "روح تنقید" لکھکر اُردو کی ایک اہم خدمت کی ہے

ادبی تنقید کے ہماری رائے میں صرف یہ معنے ہیں کہ جس مصنف کی تنقید کیجاتی ہے اُس کی تصنیف کی تفسیر کی جائے۔ اس کو خود سمجھا اور دوسروں کو سمجھایا جائے۔ یہ واضح رہے کہ ہر نقاد اپنے پہلو سے مصنف کا مطالعہ کرے گا اور دنیا میں کسی دو آدمیوں کا نقطۂ نظر کلیتہً ایک نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا کسی نقاد کا یا اس نقاد کے ہوا خواہوں کا یہ سمجھنا کہ جس طرح اس نے مصنف کی تصنیف کی تعبیر کی ہے وہی سمجھوں کے لئے درست ہے کبھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ ہر تنقید شخصی ہوتی ہے یہ ممکن ہے کہ اس سے بعض اشخاص کی تشفی ہو جائے مگر ہر ایک کا اطمینان نہیں ہو سکتا۔

ان چند اُمور کو پیش نظر رکھکر اگر ہمارے اساتذہ اس کتاب کا مطالعہ کریں گے تو پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ تنقید کے مفہوم سے واقف ہو کر اردو ادب کے مصنفین کو عام تنقیدی اصول کے تحت سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ جن شاہیر اہل قلم کی وہ خوبیوں کو سمجھیں گے اُن کو طلبہ کے سامنے پیش کریں گے اور اس طرح تیسرا اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اس سمجھنے کی جدوجہد میں ان کی تفہیم کی قوت بڑھیگی اور اُستاد کے لئے یہ ایک بڑی بات ہے لیکن ہم اسے پھر دہرانا چاہتے ہیں کہ تنقیدی زور اور گھمنڈ میں اس بات کی کبھی کوشش نہ کیجائے کہ طلبہ کے ذہن میں یہ بٹھا دیا جائے کہ ایک مصنف کی جو تعبیر اُستاد نے کی ہے وہ ہمیشہ کیلئے قطعی ہے۔ اس نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس دنیا میں صداقت اور غیر صداقت کو دودھ اور پانی کی طرح جدا نہیں کیا جا سکتا اور خصوصاً ادب میں صرف اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ ایک مصنف کو ہر شخص اپنے خاص مطمح نظر سے سمجھنے کی کوشش کرے اور اس اپنی تعبیر کو اوروں کے سامنے پیش کر دے۔ طلبہ کے نفوس میں اس بات کا نقش کرنا ضروری ہے کہ اُستاد نے انیس کو یوں سمجھا ہے لیکن تم کو بوجھ سوجھ پانی ہونے اور ناخنوں کے نچانے کے بعد اپنے مذاق اپنے رنگ اپنے خاص نقطۂ نظر سے انیس کی جو تعبیر کر دگے وہ تمہارے

کی زیادہ کارآمد ہوگی۔ ان امور کے ذہن نشین کر لینے سے یہ ہوگا کہ اوّل تو طبیعۃ نقاد اور ارباب تنقید سے مرعوب نہ ہوں گے اور دوسرے یہ کہ دل میں یہ بات بیٹھ جائے گی کہ تنقیدی کام دوسرے درجہ کا کام ہے اصل چیز تخلیقی کارنامہ ہے۔

اس تبصرہ کو ختم کرنے سے قبل اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ مولوی غلام محی الدین صاحب کا اردو کا اسلوب بسیط سادا اور دلنشین ہے۔ ان کی تحریر رواں ہے اور تعلّی الجھن سے پاک ہیں۔

اس کتاب کی طباعت بھی دلپذیر ہے اور مضامین کی ترتیب کے مواقع خفی اور جلی قلم سے اچھی طرح کام لیا گیا ہے۔ چھپائی صاف ہے۔ کاغذ بھی خاصا ہے۔ سرورق سادہ اور دلکش ہے۔ کتاب کی قیمت نہیں دی گئی ہے۔

مصنف سے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

شریک مدیر

شذرات

دنیا کی زبانیں دنیا میں اس وقت ۳۳۲۴ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ انگریزی زبان میں چار لاکھ تیس ہزار الفاظ ہیں، جرمنی میں ایک لاکھ پچاس ہزار، فرانسیسی میں تین لاکھ دس ہزار روسی میں ایک لاکھ چالیس ہزار، اسپینی میں ایک لاکھ بیس ہزار، اطالوی میں ایک لاکھ چالیس ہزار پائے جاتے ہیں۔ مشرقی زبانوں میں سب سے وسیع چینی زبان ہے اور اس کے بعد اردو پھر عربی۔ اردو بولنے والوں کا شمار تو کروڑ ہے۔ اور عربی والوں کا پانچ کروڑ۔ مغربی زبانوں میں انگریزی بولنے والوں کی سب سے زیادہ تعداد ہے، دوسرا نمبر جرمنی کا ہے، اس کے بعد بتدریج فرانسیسی، اسپینش، اور پرتگالی ہیں۔

دنیا کا سب سے بڑا کتبخانہ فرانس کے دار السلطنت پیرس میں ہے جسے لوئی چہاردہم نے قائم کیا تھا۔ اس میں پندرہ لاکھ کتابیں، پینتیس ہزار رسالے، ایک لاکھ اسی ہزار قلمی نسخے، تین لاکھ نقشے، تیرہ لاکھ قدیم کندہ اور غیر کندہ تصاویر اور تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار سکے اور تمغے موجود ہیں۔

مدارس دیہی سے تو ہر کس و ناکس واقف ہے لیکن مغرب میں جہاں آئے دن نئے نئے تعلیمی تجربے ہوتے رہتے ہیں بمقام سوآسٹن (انگلستان) ایک ایسا کالج قائم کیا گیا ہے جس میں ضروریات دیہی کے لحاظ سے تعلیم دی جائے گی۔

یہ کالج بالکل زراعتی حصہ میں واقع ہے اور اس کے نصاب کا مطمح نظر یہ ہے کہ اس کے تعلیمیافتہ اعلیٰ درجہ کے کسان اور کاشتکار ہوں۔ یہ کالج مقامی اشخاص کی کوشش اور ایثار کا نتیجہ ہے۔ گورنمنٹ نے اس کی مالی امداد تک نہیں کی ہے۔

اس سال ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے پٹنہ یونیورسٹی کے جلسہ اسناد کی صدارت فرمائی۔ موصوف نے اپنے قابلانہ خطبہ میں بیان فرمایا کہ انٹرمیڈیٹ کالج ناکامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ نہ یہ مقبول ہوئے ہیں اور نہ کارآمد ہیں۔ اس قسم کے کالج کی تنظیم یا تو سیڈلر کمیشن کی تجاویز کے مطابق ہونی چاہیئے یا اُن کے قیام میں جو روپیہ صرف کیا جارہا ہے وہ تعلیم ثانوی پر خرچ کرنا چاہیئے۔

موصوف نے یہ بھی بیان فرمایا کہ عمدہ تعلیم کے لئے مقامی یونیورسٹی موزون و مناسب ہے۔ الحاقی یونیورسٹیاں تعلیم کے نصب العین کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔

امریکہ میں بعض مقامات پر تار برقی کے ذریعہ سے تصویر روانہ کی جاتی ہے لیکن

ایک تازہ ترین ایجاد ایسی ہوئی ہے کہ ٹیلیفون کے ذریعہ بھی عکسی تصاویر دوسرے مقام پر روانہ کی جاسکتی ہیں۔ اس آلہ کے موجد کا بیان ہے کہ جو شخص ٹیلیفون پر بات کر رہا ہے اُس کی تصویر دوسرے مقام پر نظر آسکتی ہے۔

جرمنی میں لکڑی سے روئی بنائی جاتی ہے۔ جنگ عظیم یورپ کے زمانہ میں جب جرمنی کے راستے بند ہوگئے تھے اور روئی کی درآمد بند تھی اہل جرمن نے لکڑی کے گودے کو کلوں میں پیس کر ایسی عمدہ مصنوعی روئی تیار کرلی تھی کہ وہ مریضوں کے کام آتی تھی اور دیکھنے میں بھی مثل اصلی روئی کے تھی۔

سٹر براون نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ انگلستان میں ہندوستانی طلبہ کی تعداد ۱۸۸۸ء میں صرف ایک تہتر ساٹھ تھی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں یہ بڑھ کر دو سو سات تک پہونچ گئی۔ چار سال بعد تین سو آٹھ ہوگئی لیکن سنہ ۱۹۲۲ء میں جب ہندوستانی طلبہ کا باقاعدہ شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک ہزار چار سو پچاس طالب علم صرف انگلستان میں موجود ہیں۔ اگر آئرلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے طلبہ کا بھی شمار کیا جائے تو ان کی مجموعی تعداد کسی طرح دو ہزار سے کم نہ ہوگی۔

امریکہ میں ایک کالج قائم ہوا ہے جہاں ریڈیو کے ذریعہ سے مختلف مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مثلاً بچوں کی پرورش، باغبانی، چوپایوں کی پرداخت وغیرہ۔ جاپان میں بھی اسی طرح سے شام کے وقت تعلیم دی جاتی ہے۔ عوام کے معلومات میں اضافہ کیا جاتا ہے اور غیر زبانوں کا صحیح تلفظ سکھایا جاتا ہے۔

امریکہ میں ریڈیو نہ صرف تفریح اور دلچسپی ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے بلکہ اس کے ذریعہ سے ان لوگوں کو تعلیم دیجاتی ہے جو کالج نہیں جاسکتے ہیں۔ یہ دیکھکر کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو تعلیم کے خواہشمند ہیں لیکن مالی دشواریوں یا اور دقتوں کی وجہ سے وہ تعلیم حاصل نہیں کرسکتے ہیں بہت سی یونیورسٹیاں اس کے ذریعہ کالج تک کی تعلیم دیتی ہیں۔ کنساس اسٹیٹ کا زراعتی کالج جو اپنی نوعیت کا دنیا میں سب سے بہترین کالج ہے اپنا پورا نصاب اسی ریڈیو کے ذریعہ پڑھاتا ہے۔ اس نے جو درسگاہ قائم کی ہے وہ "ہوائی کالج" کہلاتی ہے۔ ہر شخص خواہ مرد ہو یا عورت اگر اس کے پاس ریڈیو کی مشین ہے تو وہ اس "ہوائی کالج" کا نصاب پڑھ سکتا ہے۔ طالب علم جب نصاب پورا کرکے امتحان سے فارغ ہوچکتا ہے تو اُسے اسی طرح باقاعدہ طور پر سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے جسطرح کسی اور کالج سے ملتا ہے

جرمنی کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ آرکز نامی دمدار ستارہ کی ایک اور دم نکل آئی ہے اس سے قبل ۱۹۲۳ء میں ایک اور دمدار ستارہ دریافت ہوا تھا جس کی چھ دمیں تھیں۔

بمبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر سٹلواڈ نے جلسہ اسناد کے روز اپنی تقریر میں یہ کہا کہ آج کل ہندوستان میں اخبار بینی کا ایسا شوق ہوگیا ہے اور طرح طرح کے اخبارات کا ایسا چرچا ہے کہ یونیورسٹی کو چاہئے کہ وہ جلد سے جلد ایک شعبہ برائے فن اخبار نویسی قائم کرے تاکہ ایسے اخبار نویس تیار ہوں جو کہ راستی اور صداقت کو کام میں لاکر ہر قسم کے خیالات کو عمدگی سے پبلک میں پیش کریں۔

ریاست بڑودہ کی سالانہ رپورٹ بابتہ ۱۹۲۳-۲۴ء کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کی مالی حالت قابل اطمینان ہے۔ سال زیر رپورٹ میں اکتیس لاکھ کی بچت رہی۔

تعداد مدارس میں ایک سو گیارہ کا اضافہ ہوا اور تعداد طلبہ میں گیارہ ہزار دو سو بیس۔ کتب خانوں کی تعداد ترقی کر کے چھ سو اکاون تک پہنچ گئی ہے۔

نیویارک پایہ تخت ممالک متحدہ امریکہ کا ریلوے اسٹیشن دنیا میں سب سے بڑا خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر میں ۵۴ لاکھ روپیہ اور دس سال صرف ہوئے۔

ایک جرمن پروفیسر نے ایک ایسی دوربین بنائی ہے جس سے پانی کے اندر کے حیوانات و نباتات کا معائنہ ہو سکتا ہے۔ یہ عجیب و غریب دوربین ۳۰ گز تک پانی کے اندر کی چیزوں کو آنکھ کے سامنے لے آتی ہے۔

دنیا اب تک آبی جانوروں کی زندگی عادات و اطوار سے بہت کم واقف تھی لیکن اب وہ دن دور نہیں جب کہ اُن کے راز و نیاز کا چرچا عام ہو جائے گا۔

اعلان ہوا ہے کہ فلاڈلفیا امریکہ میں ایک عظیم الشان نمائش ہوگی۔ یہ یکم جون ۱۹۲۶ء سے یکم دسمبر ۱۹۲۶ء تک کھلی رہے گی۔ ممالک متحدہ امریکہ کے پریزیڈنٹ نے تمام عالم کی قوموں کو مدعو کیا ہے اور یہ توقع ہے کہ دوران نمائش میں کم سے کم پانچ کروڑ تماشائی آئیں گے۔

مولوی مہتاب خاں صاحب سوداگر قصبہ واڑونہ نے ازراہ علم پروری مدرسہ تحتانیہ قصبہ واڑونہ تعلقہ حدگاؤں ضلع ناندیڑ کو مبلغ (مائہ) ایک سو پچاس روپیہ بغرض اخراجات تعلیم عطا فرمائے ہیں۔

ضمیمہ

رسالہ

المعلّم

بابتہ ماہ اسفندار

سنہ ۱۳۳۵ ف

اعظم اسٹیم پریس

چارمینار حیدرآباد (دکن)

(نمبر ۱)

تعلیمی کانفرنس حیدرآباد (دکن)

بتاریخ ۱۵ بہمن سنہ ۱۳۳۵ف روز جمعہ باغ عامہ کے خوبصورت ٹاؤن ہال میں حیدرآباد تعلیمی کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ ۳۰-۹ قبل نصف النہار وقت معین تھا اور ۳۰-۹ کے کچھ بعد سے پہلے اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے ننھے ننھے بچوں نے حمد باری تعالیٰ خوش الحانی سے ادا کی۔ نواب صدر یار جنگ بہادر نے بحیثیت صدر استقبالیہ کمیٹی ایک برجستہ اور شستہ تقریر بطور خطبہ استقبالیہ فرمائی۔ نواب صاحب نے اپنی تقریر میں بیان فرمایا کہ کئی سال کے بعد یہ تعلیمی کانفرنس پھر منعقد ہوئی ہے جن وجوہ سے اتنی مدت تک اجلاس نہ ہوسکا اُن کا بیان کرنا نواب صاحب ممدوح نے ضروری خیال نہیں فرمایا۔ البتہ اس بات کا اطمینان دلایا کہ کانفرنس کے ارباب حل وعقد اس عرصہ مدت میں بیکار نہیں رہے۔ انھوں نے بیس ہزار کی بڑی رقم تعلیمی وظائف میں صرف کی وظائف کے ضمن میں معزز مقرر نے اس بات کا بھی ذکر افسوس کے ساتھ فرمایا کہ بعض اصحاب نے تعلیمی وظائف بطور قرض حسنہ حاصل کئے اور تعلیم سے فارغ اور ذرائع آمدنی کے فراہم ہوجانے پر بھی ان اصحاب نے اپنے تعلیمی اور اخلاقی قرضہ سے حسب وعدہ سبکدوشی حاصل نہ کی جس سے اور حاجتمند طلبہ کا سخت نقصان ہوا۔ ایسے اصحاب کے بارے میں صاحب ممدوح نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے طرز عمل کا حوالہ دیکر یہ رائے ظاہر فرمائی کہ ان لوگوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جانی چاہیئے۔

معزز صدر استقبالیہ نے ایک امر پر بہت زور دیا آپ نے یہ خیال پیش کیا کہ علم ایک ایسی شے ہے کہ اس کو ہوا کی طرح عام ہونا چاہیئے۔ علم اس طرح عام اُسی وقت ہوسکتا ہے کہ تعلیم کو عام کیا جائے۔ تعلیمی تحریکوں کی کامیابی کیلئے تفقہ کو شش لازمی

ے ا ریہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں بلا لحاظ مذہب، رنگ اور ذات ہم سب
کو مل کر خلوص کے ساتھ کام کرنا چاہیئے تقریر کے آخری حصہ میں آپ نے صدر انجمن
نواب مرزا یار جنگ بہادر کا تعارف اخلاص، سنجیدگی اور صداقت آمیز پیرایہ میں کرایا
پسندیدہ الفاظ میں نواب صاحب کی قابلیت، ادبی ذوق، علمی انہماک، پبلک سے گرمی،
صداقت اور خلوص کا ذکر کیا اور ان کی صدارت کی تحریک کی اور تحریک کی تائید
مولوی سید خورشید علی صاحب نے مختصر سی مگر جچی تلی تقریر میں کی اور جلسہ کی تصفیق
کی شور میں نواب مرزا یار جنگ بہادر نے بہ حیثیت صدر نشین اپنا خطبہ سنانا شروع کیا۔

نواب مرزا یار جنگ اور ان کمالات انسانیہ سے متصف ہیں جن کا ذکر جناب
صدر صاحب استقبالیہ نے جلسہ سے ان کا تعارف کرتے ہوئے فرمایا۔ نواب صاحب کو
قدرت نے ایک سوچنے والا دماغ ودیعت کیا ہے جو کلیات اور مسلمات کی ٹوہ میں
رہتا ہے۔ اس لئے ہم ان کے طولانی مگر خیالات سے پر خطبہ پر تفصیلی نظر ڈالنی چاہتے ہیں۔
المعلم نے ابھی اتنی وسعت حاصل نہیں کی ہے کہ اس (۸۴) صفحوں کے خطبہ کو چھاپ
سکے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ غیر ضروری اور ضمنی امور کو چھوڑ کر نواب صاحب کے خیالات
کے موتیوں کو تعلیمی استدلال کے مسلسل ڈورے میں پرو لیں اور ان موتیوں کی آبداری
کا مختلف پہلوؤں سے لطف اٹھائیں اور المعلم کے قارئین کو حظ اٹھانے کا موقع دیں۔

سب سے پہلے نواب صاحب کی تندرستی نظر اور صحت استدلال اس بات سے
ظاہر ہے کہ آپ نے اس بات کو چار جگہ واضح کیا ہے کہ وہ جو کچھ تعلیم اور تعلیمی مسائل پر
فرمائیں گے وہ ایک ماہر فن کی حیثیت سے نہ ہوگا۔ چنانچہ پہلے ہی صفحہ پر فرمایا ہے:۔
"یہ (مسئلہ تعلیم) وہ عقدہ ہے جس کے حل کرنے میں دنیا کے بڑے بڑے ماہر فن تعلیمات"
"دم بخود ہیں۔ مجھ کو معلوم ہے کہ اس فرض کے ادا کرنے کی مجھ میں قابلیت نہیں ہے میں"
"غالباً آپ کو مطمئن نہ کر سکوں گا۔ البتہ اس کی کوشش کروں گا کہ کم از کم میرا کانشنس وضمیر"

"مطمئن ہو جائے"

پھر صفحہ (۲) پر ارشاد ہوا ہے:-

"میں ماہر فن تعلیم نہیں ہوں نہ مجھے طریقہ یا اس کے نصاب کے متعلق کافی معلومات ہیں لیکن بہ حیثیت ایک ایسے شخص کے جس کی اولاد ہے اور بہ حیثیت اس شخص کے جس کو مسئلہ طریقہ تعلیم سے جس کا اثر اس برّاعظم کے کروڑوں انسانوں کی ترقی و بہبود پر پڑ رہا ہے کسی قدر دلچسپی ہے۔ طریقہ تعلیم کے متعلق میرے چند خیالات ہیں ....."

صفحہ (۹) پر اس امر کو اور واضح فرمایا ہے:-

"اگر علاج بتانے کی کوشش کروں گا تو بڑے بڑے ..... ماہران فن تعلیم کے میدان میں گویا مداخلت بیجا کرنا ہوگا ..... اس خطبہ میں جس قدر تدابیر میں نے بتلائے ہیں ان کی نوعیت صرف اشارات و کنایات کی سی ہے اور وہ بھی ایسے شخص کے جو کہ اس فن میں ماہر نہیں ہے قبل اس کے کہ ان میں (کی) کوئی تدبیر تعلیم کی موجودہ مشنری میں چسپاں کی جا سکے اس میں غالباً بہت کچھ چھان بین و رد و بدل کی ضرورت ہے....."

صفحہ (۲۸) پر اسی خیال کا یوں اعادہ فرمایا ہے:-

"میں نہ اس قابل ہوں اور نہ یہ کوئی موقع ہے کہ اپنے ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے شہری تعلیم کی کوئی خاص اسکیم بنا کر پیش کروں۔"

اعلےٰ دماغ کی یہ ایک نشانی ہے کہ وہ کبھی خود رائے نہیں ہوتا اور اپنی حدود کو بخوبی پہچانتا ہے۔ ایسے بیدار مغز ارباب کبھی اپنی رائے کو قطعی حیثیت نہیں دیتے اور جس میدان کے مرد نہیں ہوتے وہاں صاف صاف اس کا اعلان کر دیتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے حضرات سرے سے ایسی راہ پر قدم ہی کیوں رکھیں؟ یہ سوال ایک واجبی سوال ہے لیکن اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ بعض اصحاب مجبور کرتے ہیں۔ اس لئے ایسی ذمہ داری قبول کر لی جاتی ہے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ ماہرین فن

اس اور اپنے خیالات اور نظریوں میں منہمک رہتے ہیں کہ اکثر وہ اپنے دائرہ کے باہر کی چیزوں سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ ان میں اور ان کی دنیا کے باہر کے نفوس میں ایک طرح کی غیریت سی ہو جاتی ہے یا بالفاظ دیگر ماہرین پبلک نقطۂ نظر اور احساس اور عامۃ الناس کی ضرورتوں سے اپنے روزمرہ کے خیالات کے ہیر پھیر میں اجنبی سے ہو جاتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اور میدانوں میں جو اصحاب صاحب الرائے اور صاحب الرائی ہوں وہ پبلک کی زبان بن کر ماہرین فن تعلیم کو لوگوں کی واقعی ضرورتوں کی جانب توجہ دلائیں تاکہ ماہرین فن کے سامنے اصلی ضرورتیں اور تازہ نقطۂ نظر پیش ہو اور برنس کے قول کے مطابق وہ یہ "دیکھیں کہ دوسروں کی آنکھوں سے ہم کیا دکھائی دیتے ہیں"۔ ہمارا خیال ہے کہ اس پہلو سے نواب صاحب کے خیالات نہایت غور کے قابل ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ نواب صاحب نے اپنے روزمرہ عدالتی اہم اشغال کے باوجود تعلیم جیسے اہم مسئلہ کو بھی اپنا قیمتی وقت عطا کیا ہمیں امید ہے کہ جن اصحاب کی نظر نواب صاحب کے تعلیمی خیالات کو ایک ہی نقطۂ نظر سے نہ دیکھ سکے وہ اس امر کو پیش نظر رکھیں گے کہ نواب صاحب نے اس خصوص میں مردانہ وار صداقت آمیز اعتراف کر لیا ہے۔

ان حضرات کو چاہئے کہ نواب صاحب کے تازہ نقطۂ نظر سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے تعلیمی نظریوں اور نظامات کو دوسرے کی آنکھوں سے بھی دیکھیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے خیالات کو عمل کی کسوٹی پر کسنا اور پھر ان کے کارآمد مفاہیم کو پرکھ کر ان کے مطابق کسی تعلیمی نظام میں ردّ و بدل کا کرنا یا کسی نظام کا از سر نو ڈھالنا انھیں لوگوں کا کام ہے جنھوں نے اپنی زندگی کا کل حصہ اس خاص میدان کے لئے وقف کر دیا ہو مثال کے طور پر یوں خیال فرمائیے کہ اگر کوئی ماہر فن تعلیم یا ادب عدالتی نظام کی تنسیخ اور ترمیم کی تجاویز دوق کے ساتھ پیش کرے تو وہ قابل قبول نہ ہوں گی لیکن ساتھ ہی ڈکنس یا برونٹگ کی طرح قانون کی دیرداری انصاف کی گرانی عدالتی استدلال کی

مغالطہ انگیز نزاکت پر توجہ دلائی جا سکتی ہے اور اگر قانون کے ارباب خلعت فاخرہ بھی اس نقطہ نظر سے عدالتی کارروائیوں کے چند امور اور بعض قوانین کو قابل اصلاح تصور فرمائیں تو ایسی صورت میں ماہرین قانون کی تحریک پر عدالتی نظام اور ضابطہ میں ترمیم یا اصلاح ہو سکے گی

نواب صاحب کے تعلیمی مسائل سے متعلق پہلو کو واضح کرنے کے بعد اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تعلیم کے مقصد اور مدعا کے بارے میں نواب صاحب کے خیالات کیا ہیں۔

یوں تو ہر عملی کام کے لئے مدعا کا واضح ہونا ضروری ہے لیکن تعلیم کے معاملہ میں مدعا کا روشن اور صاف صاف پیش نظر ہونا نہایت لازمی ہے۔ نواب صاحب نے مقصد تعلیم کے متعلق تین خیالات پیش فرمائے ہیں۔

(۱) "ہماری تعلیم ایسی ہونی چاہئے جو ہماری زندگی بسر کرنے اور کسی قدر آرام سے بسر کرنے میں معاون ہو۔"

(۲) "ہماری تعلیم ایسی ہو کہ موجودہ افراد سے مقابلتاً بہتر افراد تیار ہو سکیں"

(۳) "ہماری تعلیم ایسی ہونی چاہئے جو ہم کو اپنے ہم سایوں کے ساتھ امن و سکون و خوشی سے زندگی بسر کرنے میں مدد دے"

ان تین خیالات کے تحت نواب صاحب نے اپنے کل استدلال کو ترتیب دی ہے اس دلچسپ اور پر مغز خطبہ کے مزید مطالعہ سے قبل ان تینوں خیالات کا بخوبی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

تعلیم کے مدعا یا مقصد پر پرانے زمانہ اور عہد حاضر میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اس پر نہ صرف ان اصحاب نے جو تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ ان صاحب دماغوں نے بھی جو علم کے اور شعبوں میں بدطولی رکھتے تھے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ یونانیوں کے زمانے سے اب تک مشرق اور مغرب کے ایسے بڑے آدمیوں کے نام ہی اگر گنوائے

جائیں تو ایک ضخیم جلد بن جائے۔

نواب مرزا یار جنگ بہادر نے ان تمام بڑے لوگوں کی باتوں اور زمانہ حال کی ضرورتوں کو سامنے رکھ اور اصطلاحی جھمیلوں اور فلسفیانہ باریکیوں سے الگ ہو کر مدعائے تعلیم کو سیدھے سادے لفظوں میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے مدعائے تعلیم کے تصور کو تین جزوں میں علیحدہ کیا ہے۔ ان میں سے پہلا اور دوسرا جز معاشیاتی بنیاد اور تیسرا جز سیاسی اور سماجی چٹان پر ٹکا ہوا ہے۔

معاشی پہلو سے مدعائے تعلیم پیٹ پالنا" روٹی کمانا ہے اور ہر آئندہ پود کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ پچھلی پشت سے مقابلتاً بہتر ہو۔ یہاں "بہتر" سے نواب صاحب کی یہی مراد لی ہے کہ "روٹی کمانے" کی صلاحیت زیادہ ہو جائے۔ کسی قدر زیادہ آرام سے زندگی بسر کرنے کی سکت آجائے۔

ان دونوں خیالات میں "آرام" کا لفظ نہایت اہم ہے۔ آرام کی زندگی سے کیا مراد ہے؟ صرف معاشی پہلو ہی سے دیکھا جائے تو آرام کے معنے یہ ہوں گے کہ ایک بندھی ہوئی آمدنی جس میں اطمینان اور جمعیت خاطر کے ساتھ گزر اوقات ہو سکے گزر اوقات کا معیار ہر زمانہ میں جدا ہوتا ہے۔ اور پھر ہر زمانے کے مختلف سماجی طبقوں کے معیار جدا جدا ہو جاتے ہیں۔ ایک عہدہ دار جس کی تنخواہ دو ہزار روپیہ اور ایک چپراسی جس کی ماہوار پانچ روپیہ ہو ظاہر ہے کہ "آرام سے زندگی بسر کرنے کا" علیحدہ علیحدہ معیار اپنے ذہن میں رکھتے ہوں گے۔ معیار کی یہ چگونگی ہر سماج میں غیر محدود ہوتی ہے۔ اب نواب صاحب کے ان خیالات نمبر ۱ اور نمبر ۲ کے تحت اگر تعلیم دی جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ سماج کے ہر طبقہ کے مطابق جداگانہ تعلیم ہو اور ایسی ہو کہ اس تعلیم سے فارغ ہو کر ہر طبقہ کا ہر فرد کسی قدر زیادہ کمانے لگے اور مقابلتہً اپنے باپ سے بہتر، ان معنوں میں ہو جائے کہ اس کی زندگی باپ سے کسی قدر زیادہ آرام سے

بسر ہونے لگے۔ اس طرح یہ ہوگا کہ بغیر کسی اچانک انقلاب کے سماج رفتہ رفتہ ترقی کرتی اور ہر آئندہ پود پچھلی پود سے بہتر ہوتی جائے گی۔ نواب صاحب نے دوسرے خیال کے تحت تفصیلی بحث کے دوران میں فرمایا ہے:۔

"مجھے ایسے آدمیوں کی کمی معلوم ہو رہی ہے جو کہ بڑی بڑی فوجوں کی سپہ سالاری کر سکیں یا بڑے بڑے شہر آباد کر سکیں"

اپنے پیش کردہ تینوں خیالات کے بارے میں عام بحث فرماتے ہوئے نواب صاحب نے یہ خیال بھی ظاہر فرمایا:۔

"خواہ گریجویٹ صاحب نے سرکاری نوکری کر کے سرکاری خزانہ سے اپنی تنخواہ حاصل کی یا پیشۂ وکالت میں خود اپنے عزیز و اقارب میں مقدمہ بازیوں کی وجہ سے روپیہ حاصل کیا ہو یا کسی اور حیثیت سے پیدا کیا ہر حالت میں روپیہ اپنے ہم وطنوں کا تھا، جن علماء کو اس طریقۂ تعلیم نے تیار کیا اُن میں اُن پیشوں کی بہت کم قابلیت تھی جن سے ملک کی دولت میں اضافہ ہوا کرتا ہے"

اولاً ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ پہلے اور دوسرے خیالات کے تحت جو تعلیم دی جائے گی جس میں تدریجی ترقی باحتیاط تمام ملحوظ رکھی جائے گی یعنی تبدیلی "کلی قدر" سے زیادہ ہوگی ایسے مدعا کے پیش نظر خواہ کیسا ہی نظام تعلیمی کیوں نہ ہو بڑی بڑی فوجوں کی سپہ سالاری اور دولت میں اضافہ کرنے والے پیدا نہ ہوں گے صرف یہی نہیں دنیا کا کوئی سا بہترین نظام تعلیمی لے لیا جائے اس سے فوجی یا ایکا دیکی جی نی اس پیدا نہیں کی جا سکتی محض اس وجہ سے کہ ابھی تک جی نی اس کے پیدا کرنے کا راز کسی ماہر فن تعلیم کے ہاتھ نہیں آیا۔ جی نی اس کے قوانین ابھی دریافت ہونے ہیں اور جب تک یہ دریافت نہ ہوں دیگر نظامات تعلیمی کی طرح نواب صاحب کے مجوزہ خیالات کے مطابق بھی موجودہ نظام تعلیمی میں جو ردوبدل اور ترمیم کی جائے گی وہ بھی فوجی

یا۔ اینٹی فک جی نی اس جھکی طور پر پیدا نہیں کر سکے گی۔ غیر معمولی خداداد ملکہ، مدارستاروں کی
غیر معلوم قوانین کے تحت ایسی جگہ بھی پیدا ہو سکتا ہے جہاں کوئی نظام تعلیمی سرے سے
موجود ہی نہ ہو۔ اکبر اور نادر شاہ نے کون سے باقاعدہ نظام تعلیمی میں سپہ سالاری سیکھی
تھی۔ نپولین نے اگرچہ ایک نظام تعلیمی کے تحت فوجی تعلیم حاصل کی لیکن اس کی فوجی کارروائیاں
اس فرسودہ نظام تعلیمی کے بالکل مخالف ہوتی تھیں۔ جیمس واٹ نے کسی باقاعدہ تجربہ خانہ
میں انجن کی ایجاد نہیں سیکھی۔ بہرحال اس قسم کی مثالیں زندگی کے ہر شعبہ میں ملیں گی کہ
جی نی اس کسی باقاعدہ نظام تعلیمی کی محتاج نہیں ہے۔ کیسا ہی نظام تعلیمی ہو اگر کوئی
دماغ خداداد ملکہ رکھتا ہے وہ ضرور مسلمہ باتوں اور اپنے ماحول سے بلند ہو جائے گا
اور ہر طرح کی رکاوٹوں پر سے اپنا راستہ بنا لیگا۔ بڑی بڑی فوجوں کی سپہ سالاری
کے قطع نظر کر کے جس کا موقع بدقسمتی سے ہندوستان میں فی الحال بالکل نہیں ہے
صرف اس بحث کو لیا جائے کہ دولت میں اضافہ کرنے سے کیا مراد ہے؟
معاشیاتی اصطلاحی بحثوں سے بچ کر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں نواب صاحب کا
مطلب یہ ہے کہ صنعتی طور پر جو پیداوار ہوتی ہے وہ ان معنوں میں دولت میں
اضافہ کرتی ہے کہ غیر ممالک سے روپیہ کو اپنے ملک میں گھسیٹ لیتی ہے اور اب
جس طرح ہمارے تعلیم یافتہ اپنے وطنی بھائیوں کی جیب سے ہی روپیہ نکالتے ہیں
اس سے دولت میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اس نقطہ نظر کے خلاف معاشیاتی
پہلو سے بعض ایسے امور پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے ان خیالات میں بہت کچھ
ترمیم کی ضرورت لاحق ہو جائے۔ لیکن یہاں خالص اصطلاحی بحث سے پہلوتہی
کر کے ہم عام طور پر نواب صاحب کے اس استدلال کو مانے لیتے ہیں کہ ہندوستان
کو اب جس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ صنعتی تعلیم ہو جس سے ملک میں
کارخانے قائم ہوں اور ان کارخانوں کی پیداوار سے "دولت میں اضافہ ہو"

اس صنعتی دور کا لازمی نتیجہ ہندوستان میں بھی اگر یہی مان لیا جائے کہ سرمایہ دار بہت مالدار اور معیار زندگی اتنا بلند ہو جائے گا کہ اس صنعتی تعلیم اور دولت میں اضافہ کرنے کی دوڑ دھوپ میں غیر سرمایہ دار طبقے زیادہ مفلس اور بے چین ہو جائیں گے۔ جیسا کہ اس وقت یورپ میں ہو رہا ہے تو نتیجہ بدقسمتی سے وہی ہوگا جس سے نواب صاحب اندیشہ فرما رہے ہیں۔

نواب صاحب نے ذیل کے کلیہ کو پر لطف پیرایہ میں ادا کیا ہے:۔

"لیکن سمیع اللہ کو اس بات کے کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ پیٹ کی مار اور سوزش جہالت کی مار اور سوزش سے بڑھی ہوئی ہوا کرتی ہے۔"

اس کو مان لینے کے بعد بھی ہمارا یہ عقیدہ ہے اور یورپ اور امریکہ کے موجودہ صنعتی دور کے ثمرات اس عقیدے کی تائید کرتے ہیں کہ ——— سرمایہ داروں کی چیرہ دستیوں سے پیٹ کی مار اور سوزش، وہ صورت حال پیدا کر دیگی جس کو "بال شی وی زم" کہتے ہیں اور جس کے خطرہ کو نواب صاحب نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

"اگر آپ ہندوستان کی نوے فی صدی دیہاتی آبادی میں "بال شی وی زم" کے" "ان خیالات کو پھیلانا نہیں چاہتے جن سے ہماری سوسائٹی کا شیرازہ و تنظیم" "پراگندہ و درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ ہے....."

.....

"دولت میں اضافہ کرنے کی صنعتی تعلیم نے یورپ میں وہ نازک حالات پیدا کر دئے ہیں جن کی وجہ سے سماجیت (سوشیالی زم) کی تحریک پھیلی اور روس میں اس نے وہ انتہائی عملی صورت اختیار کی جس کو بالشوزم کہتے ہیں ہمیں اندیشہ ہے کہ نواب صاحب نے ہندوستانی تعلیمی مسائل کے حل کی وہ تجویز

پیش کی ہے جس سے خود بال شوزم کا پیدا ہونا ایسا ہی لازمی ہے جیسے دن کے بعد رات کا آنا۔

قبل اس کے کہ ہم نواب صاحب کی شہری اور دیہی تعلیم کے خیالات پر غور کریں یہاں پیٹ اور رسالت کی مار اور سوزش پر کچھ بحث ضروری معلوم ہوتی ہے جہالت کے مفہوم کا معین کرنا ایک مشکل چیز ہے جبکہ خود نواب صاحب فرماتے ہیں:۔

"اگر تعلیم کے تصور اور مفہوم کو وسیع کریں تو ہماری دیہی آبادی کا شمار بالکل غیر تعلیمیافتہ" "فرقہ میں نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ وہ ان پڑھ ہوں لیکن غور سے دیکھا جائے تو" "معلوم ہوگا کہ ہزاروں سال کی تہذیب اور روایات ان کے دلوں پر نقش ہیں" "جن کی وجہ سے وہ ایک ایسی سوسائٹی میں صلح پسندی کے ساتھ زندگی بسر کرتے" "رہے جس کی بنیاد کو باوجود بیرونی حملوں اور جنگ و جدل کشت و خون کے آج" "تک جنبش نہیں ہوئی"

اب تک عام طور پر ہندوستان کے دیہاتی گنوار سمجھے جاتے تھے اور گنوار کی تصویر میں ہندوستانی شہریوں نے نئے وقوفی کا مفہوم ملا رکھا تھا عموماً جو گنوار دیکھنے میں آتے ہیں وہ ناواقفیت اور نئے وقوفی کی چلتی پھرتی مورتیں ہوتی ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ تعلیم کا مفہوم وسیع کیا جائے اور اس حد تک کیا جائے کہ ہمارے ہاں کے دیہاتی بھی اس کے تحت "بالکل غیر تعلیمیافتہ" نہ سمجھے جائیں تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ کوئی دودھ پیتا بچہ بھی غیر تعلیمیافتہ سمجھا جائے اس لئے کہ خواہ کسانوں خواہ شہری آدمیوں کے بچے ہوں ہزاروں سال کی تہذیب اور روایات انکے دلوں پر نقش ہیں، رہی دیہاتی لوگوں کی صلح پسندی، اور سوسائٹی کا جنبش نہ کھانا یہ بھی بحث طلب باتیں ہیں۔ کیونکہ گنوار صلح پسند نہیں ہوتے ـــــ زمین کا فساد کی جڑ ہونا ضرب المثل ہے ـــــ اور دیہاتی آبادی کو چھ آدمیوں نے

تباہ کرنے سے اس لئے ہمیشہ پرہیز کیا کہ اُن کی تباہی کے بعد کھانے پینے کے لالے پڑ جاتے ـــــ دوسرے یہ کہ گنوار اپنی جہالت کی وجہ سے سیاسی اور فوجی شورشوں میں بہت کم حصہ لے سکتے تھے۔ ان کی حالت ان گونگے چوپایوں سے کچھ یونہی سی بہتر تھی جن کی مدد سے یہ لوگ کھیتی باڑی کر لیتے تھے ـــــ بہرحال نواب صاحب نے گنوار آبادی کو جس پہلو سے پیش کیا ہے اُس سے ہمدردی ٹپکتی ہے کیونکہ منشا یہ ہے کہ اس آبادی کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے وہ کسی قدر زیادہ آرام سے زندگی بسر کر لیں اور بالشوک خیالات سے محفوظ رہیں۔ بڑی تدبیر یہ ہونی چاہئے کہ موجودہ ہنگامۂ حیات میں ان کی معاشی حالت ابتر نہو ـــــ" نواب صاحب نے کیا خوب فرمایا ہے کہ "ان کی جہالت اتنی ڈراونی نہیں ہے" پیٹ کی مار ان کو بال شوک بنا سکتی ہے لیکن جہالت کی مار ان کو اپنی حالت پر قانع رکھے گی۔ اس استدلال کو بڑی حد تک تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ البتہ "جہالت" ایک ایسی چیز ہے کہ آدمی دوسرے کے کہنے سننے میں آسانی سے آجاتا ہے اور ایسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ مذہب یا سیاسیات کی موٹی موٹی باتوں کی آڑ میں چالاک آدمی ان گنواروں کو جو اللہ میاں کی گائے ہوتے ہیں، بہکائیں اور ورغلائیں اور یہ نئے سوچے سمجھے بھیڑ بکری کی طرح ان کے پیچھے ہو لیں

جہالت کی دوسری بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ جہالت کی تاریکی سمجھ کو اندھا کر دیتی ہے اور جاہل خواہ دیہاتی ہوں خواہ شہری پرانی اچھی اور بری روایات دونوں پر یکساں کاربند رہتے ہیں اور جو روایات اور رسوم زمانے کی بدلتی ہوئی مصلحت رساں اور بعض صورتوں میں سمِ قاتل کا حکم رکھتی ہیں۔ یہ جہل کی بدولت عقل کے کورے ایسی صورتوں میں بھی پرانی لکیر کو آنکھیں بند کئے پیٹتے جاتے ہیں۔ مرغاں ہا را یہ خیال ہے کہ جہالت کی مار پیٹ کی مار سے بڑھی ہوئی ہے

اس لئے کہ جہالت ہی پیٹ کی مار کی ماں ہے

نواب صاحب نے مدعائے تعلیم کا جو تیسرا جز قرار دیا ہے وہ اور بھی غور کے قابل ہے اس لئے کہ آج کل ہندوستان کی آب و ہوا میں تفرقہ کے جنون کا از سر نو دور دورہ ہے۔ نواب صاحب نے ایک زیرک نبض شناس کی طرح اس موروثی مرض جنون کے پھر پھوٹ پڑنے کو خوب سمجھا اور اس مرض کے علاج کو نظام تعلیمی کے مدعا کا ایک اہم جز قرار دیا ہے اور شائد اسی جز کو بطور خاص پیش نظر رکھنے کا نتیجہ ہے کہ آپ نے آگے چل کر "تعلیم کا آخر اصلی مفہوم" یعنے مقصد تعلیم کی تعریف یوں فرمائی ہے ـــــ تعلیم کا مقصد انسان بنانا ہے" یہ تعریف جتنی جامع ہے اتنی ہی مبہم ہے۔ اس لئے کہ انسانیت کی ایسی تعریف جس کو ساری دنیا مان لے یا جو ہر جگہ اور ہر زمانہ میں ٹھیک اترے اب تک کسی نے نہیں کی۔ اسی لئے نواب صاحب نے اس تعریف کے بعد ہی اپنے خیال کو واضح فرمایا ہے ـــــ فرماتے ہیں کہ عمدہ طریقہ تعلیم وہی ہے جس سے "ان تمامی دماغی قوتوں میں ساتھ ساتھ مساوی نشو و نما ہو" جو "ہر لڑکے ..... ہیں موجود ہیں" جو اصحاب ٹرینڈ (تربیت یافتہ) ہیں وہ نواب صاحب کے اس خیال کی تائید کریں گے۔ کیونکہ اساتذہ کی ٹریننگ (تربیت) کا مقصد ہی یہی ہے کہ نفس کی تیاری متناسب اور سڈول ہو لیکن محض دماغی قوتوں کی مساوی نشو و نما کسی شخص کو انسان نہیں بنا سکتی۔ بہت سے لوگ ایسے ملیں گے جن کی دماغی نشو و نما نہایت اچھی ہوئی ہے لیکن وہ انسان نہیں ـــــ ان کا کیرکٹر پست اور قابل نفریں ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص دماغی حیثیت سے قابل اور لائق ہو اور دماغی قابلیت کے باوجود اس کا کام یہ ہو کہ ملک کی آبادی میں تفرقہ پھیلائے۔ ہمیں کسی کے نام لینے کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان میں ایسی مثالیں اس وقت ضرورت سے زیادہ موجود ہیں۔

ہم سایوں کے ساتھ امن وسکون سے رہنا نواب صاحب کے مدعائے تعلیم کا تیسرا جز ہے۔ اس کے متعلق لگے ہاتھوں سرسری طور پر اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ صحیح اور اصلی امن وسکون صرف اسی آبادی میں ہو سکتا ہے جس میں سب سے پہلے خونی اتحاد ہو اور اس خونی اتحاد یعنی آپس کے بلا روک ٹوک شادی بیاہ کے ساتھ ایک وسیع تعلیمی نظام کی بدولت لسانی، ذہنی اور روحانی (مذہبی اتحاد بھی ہو) لیکن یہ سب میل جول کی باتیں بھی قومی امن وسکون کی ضامن نہیں ہو سکتیں۔ ان اتحادوں کے سوتے میں سیاسی اتحاد کا سہاگا ناگزیر ہے۔ سیاسی اتحاد آپس میں مل جل کر ایک دولت کی کاٹھی کے قیام کا نام ہے۔ چونکہ یہ خطبہ تعلیمی ہے اس کا تبصرہ بھی تعلیم کے میدان سے باہر نہیں جا سکتا اس لئے اس سیاسی اتحاد پر ہم نے صرف سرسری طور پر خیال کا اظہار اس غرض سے کیا ہے کہ یہ دکھا دیں کہ ایسی تعلیم جو ہمسایوں کے ساتھ امن وسکون اور خوشی سے رہنا سکھائے محض ایک سطحی چیز ہوگی۔ شائد عارضی طور پر کامیابی ایسی تعلیم کو ہو جائے لیکن اصلی امن وسکون اور خوشی اسی وقت نصیب ہو سکتی ہے جبکہ ساری آبادی ایک عضو بند جسم (آرگانی زم) بن جائے۔ بہرحال یہ سماجی سیاسی مسئلہ ایک غیر متعلق سی بات ہے اس پر تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں اس وجہ سے بھی کہ یہ تبصرہ خود بہت طول ہو گیا ہے

نواب صاحب نے جو عملی تجاویز کے پیش کرنے کی کوششیں کی ہیں ہم ان پر بھی تفصیلی بحث نہیں کرنی چاہتے۔ البتہ ایک آدھ بات پر روشنی ڈالنا کافی ہوگا۔ جس سے معلوم ہو جائے کہ نواب صاحب نے تعلیمی مسائل پر کس قدر ہمدردانہ اور بہبود عامہ کے پہلو سے نظر ڈالی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان تجاویز میں بصورت عمل بہت کچھ چھان بین اور کتر بیونت کی ضرورت ہو۔

نواب صاحب نے یہ رائے پیش فرمائی ہے کہ ــــ "دیہی تعلیم کے مسئلہ کو شہری تعلیم کے مسئلہ سے جدا کر دیا جائے" جدا کرنے سے یہ مطلب ہے کہ دیہی

اور شہری تعلیم کے مقاصد جداگانہ ہوں اور اس جداگانہ نصب العینوں کے مطابق تعلیمی نظام بھی الگ الگ ہوں ـــــ دیہی اور شہری طلبہ کو ایک ہی لاٹھی سے نہ ہانکا جائے۔ نواب صاحب کا خیال یہ ہے کہ ـــــ دنوے فی صدی آبادی کو ہل چلانے ہی میں مشغول رکھا جائے" اس طرح کے جداگانہ نظامات ـــــ ایک دیہات اور ایک شہروں کے لئے۔ دیہاتی اور شہری آبادیوں میں بے ضرورت تفرقہ پیدا کریں گے اور ہندوستان کے موجودہ بے گنتی تفرقوں میں ایک اور زبردست تفرقہ کو بڑھاوینگے علاوہ اس کے دیہاتی اور شہری آبادیوں کی لہریں ایک دوسرے کی قوت کو پورا کرتی رہتی ہیں۔ جو دیہاتی زراعت کی طرف رجحان نہیں رکھتے وہ شہروں میں آکر اپنے رجحان کے مطابق کوئی پیشہ اختیار کرتے ہیں اور شہری لوگ شہروں کی گھما گھمی چہل پہل غل بکا اور بوجھل آب وہوا سے گھبرا جاتے ہیں وہ اپنی عمر بھر کی شہروں میں کمائی ہوئی پونجی دیہاتی زندگی میں لگا دیتے ہیں۔ ایک ملک کی آبادی کے دو رخوں میں کسی سخت اور نئے لچک تعلیمی دیوار کا حائل کرنا ظاہر ہے کہ مناسب نہ ہوگا۔ نواب صاحب نے پرزور الفاظ میں دیہاتیوں کی تعلیم کی بابت کیا خوب بات کہی ہے:۔

"ان کی تعلیم کی ایسی نوعیت ہو کہ جس سے ان کے آبائی پیشہ زراعت میں روز بروز ترقی آمدنی کے وسائل و ذرائع بڑھتے جائیں۔ ان کی کمزوری ہماری کمزوری ہے، ان کی ترقی ہماری ترقی ہے۔ ان کی فلاح وبہبودی میں ہماری خوش حالی مضمر ہے، ان کی قوت ہماری قوت ہے۔۔۔۔۔۔۔"

ان اعلےٰ خیالات کی جتنی قدر کی جائے کم ہے اور بہ حالات موجودہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ "ہندوستان کی معاشی عمارت کی بنیاد" انہیں دیہاتی کاشتکاروں پر ہے" لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کی صنعت کو کیوں نہ زندہ کیا جائے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ محض زراعت پر ہی ہماری نوے فیصدی

تلی اور پلی رہے۔ کیوں نہ صنعتی کارخانے قائم ہوں اور رفتہ رفتہ ایسی آبادی جو زراعت پر مائل نہ ہو اور کارخانوں سے دلچسپی رکھتی ہو اس کو کارخانوں میں لگا کر "دولت میں اضافہ" کرنیکے کام پر لگایا جائے؟ اس معاشیاتی بحث سے دور ہو کر ہم ایک اور بات کی طرف توجہ دلانی چاہتے ہیں۔ نواب صاحب نے جیسا ہم نے اوپر ایک جگہ ان کے الفاظ کو دہرایا ہے یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ "نوے فی صد زراعت پیشہ آبادی کو ہل چلانے ہی میں مشغول رکھا جائے" اور نواب صاحب کے خطبہ کا جو ٹکڑا ابھی ہم نے اوپر دیا ہے اس میں "آبائی پیشہ" کا خیال بھی آیا ہے اس بیسویں صدی میں یہ بات فی الحال قطعاً ثابت ہو چکی ہے کہ "موروثی پیشہ" یا "آبائی پیشہ" کوئی چیز نہیں۔ حیاتیاتی ارتقا کے قوانین عجیب و غریب ہیں ابھی انسانی دماغ کی دسترس کے باہر ہیں۔ یہ بالکل ضروری نہیں کہ ایک شخص بزاز کے گھر پیدا ہو تو وہ بزاز ہی رہے۔ وہ علم و فضل اور قانون سازی میں امام وقت اور بقال کا بچہ ایک سپہ سالار ہو سکتا ہے۔ پرانی اور اس نئے زمانے کی تاریخ ایسی زبردست مثالوں سے مالا مال ہے۔ ایسی صورت میں کسان کے بچہ کو کسان رہنے پر مجبور کرنا ——— یہ وہی خیال ہے جو قدیم ہندوستان میں ذات پات کے قیام کا باعث ہوا اور جس نے ہندوستان میں ناقابل اندازہ بربادی پھیلائی اور جس کا پھل بے گنتی ذاتوں کا بھڑوں کا چھتہ اب بھی ہندوستان کے اتحاد اور ترقی میں فولادی دیوار کی طرح حائل ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ نواب صاحب جیسے بیدار مغز اور روشن خیال فرد کا یہ منشا نہیں ہے۔ نواب صاحب دراصل اس بات کے خواہشمند ہیں کہ یہ نوے فی صد نے عقل اور بے زبان زراعت پیشہ آبادی اپنے مفید کام میں کسی قدر بہتر بنکر کسی قدر زیادہ آرام سے زندگی بسر کرتی رہے اور شہری آبادی کے کھانے پینے کا سامان کسی قدر اضافہ کے ساتھ پیدا کرتی رہے۔ شہری آبادی کے لوگ حکومت کے مزے لوٹیں اور ان مزوں کیلئے

یہ دیہاتی غذا اور مالگزاری کی صورت میں قوت فراہم کرتے رہیں اور معاشی عمارت کی مستحکم بنیاد ابدالآباد تک بنے رہیں۔

نواب صاحب کا فاضلانہ خطبہ اس قدر دلکش اور اعلیٰ خیالات سے بھرا ہوا ہے اور ہر خیال اس قدر اور خیالات کو اپنے ساتھ ابھارتا ہے کہ تبصرہ کے طولانی ہوجانے پر بھی جی یہی چاہتا ہے کہ اس اُستادانہ خطبہ کے پیش کردہ اُمور پر غور کیا جائے۔ ہم صرف عملی تجاویز کی ایک آدھ بات کو روشنی میں لانا چاہتے تھے کہ نواب صاحب کے پرزور اور رواں تحریر کے بہاؤ نے ہمیں اور طرف پہونچا دیا۔ نواب صاحب نے دیہی اور شہری تعلیم کو جداگانہ قرار دینے کی ضرورت پر بحث کرکے فوقانی اور صنعتی تعلیم کے مقابلہ کے بعد یہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ "فوقانی یا ہائی اسکول کی تعلیم پر کل ملاکر ۲۵ لاکھ صرف ہوتے ہیں اور صنعت وحرفت کے مدرسہ پر ایک لاکھ صرف ہوتے ہیں ایسی صورت میں ..... کیا مصارف کا پلّہ اِدھر سے اُدھر بدلا جاسکتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ صنعت وحرفت کی تعلیم ہی کل فوقانی تعلیم کی نوعیت قرار دیدیجائے۔" یہ خیال بالکل درست ہے صنعتی تعلیم کی جانب اسی وقت سے توجہ ہونی چاہئے تھی جبکہ موجودہ نظام تعلیمی کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ لیکن اس زمانہ میں نواب صاحب کے موجودہ خیالات والے لوگ موجود نہ تھے اور پیشہ وری کی تعلیم کا سرے سے تصور ہی نہ تھا۔ عام طور پر پیشہ وری کو نظر حقارت سے دیکھا جاتا تھا موجودہ تعلیمی نظام سے باوجود نقائص کے اتنی بات ضرور ہوئی کہ ہندوستان میں ایسے لوگ پیدا ہوگئے جو اپنے دماغ سے سوچنے کا کام لینے لگے اور معاشی، سیاسی، سماجی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ذہناً تعلیمی مسائل کے حل اور عملاً نظام تعلیمی کے قیام اور اس کی اصلاح کی دُھن میں لگ گئے۔ موجودہ نظام تعلیمی کا یہی فائدہ کچھ کم نہیں ہے۔ اب اس نظام میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ اسی بات

کو ہر شخص جو تعلیم سے واقفیت رکھتا ہے اور آج کل کے حالات پر کچھ عبور رکھتا ہے بخوشی تسلیم کر سکتا ہے۔ دوسرے اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا کا کوئی نظام تعلیمی کبھی کامل نہیں ہو سکتا۔ زندگی کی لہراتی ندی کھیلتی اور نئی راہیں بناتی رہتی ہے اور لازمی ہے کہ ہر زمانہ کا نظام تعلیمی چند سال کے بعد ناکافی ثابت ہو۔ نواب صاحب نے اس زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے جو تجاویز پیش فرمائی ہیں اُن کے مطابق تعلیمی نظام کی اگر اصلاح بھی ہو جائے تو بھی چند سال کے بعد پھر زمانہ کے بدلے ہوئے تیور اس میں بھی اصلاح کے طالب ہوں گے۔ ثمری تعلیم کل ہندوستان میں اب جس نہج پر کام کر رہی ہے اس کی ضرورت تھی اور شائد ہندوستان کے ایسے حصوں میں جو ابھی پیچھے ہیں ایسی تعلیم کی جو پہلے آنکھیں کھولدے ـــــ بیدار کردے ابھی مدت تک ضرورت رہے گی۔ البتہ یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ صنعتی اور پیشہ وری کی تعلیم کی داغ بیل ڈالی جائے اور اس جانب نہایت احتیاط اور دوربینی کے ساتھ توجہ کی جائے۔ صنعتی اور پیشہ وری کی تعلیم کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ موجودہ فوقانی یا ہائی اسکول کی تعلیم کے ساتھ اسے وابستہ کر دیا جائے کیونکہ مدارس فوقانیہ کو قائم رکھکر ان میں پیشہ وری کی شاخوں کا بڑھانا ایک تو موازنہ کو بہت بڑھا دے گا اور دوسرے نہ لبرل اور نہ پیشہ وری کی تعلیم کما حقہ دیجا سکے گی۔ ہمیں عملی پہلو سے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ صنعتی مدارس کی تعداد میں کچھ اضافہ کیا جائے اور بڑی حد تک موجودہ مدارس کو اعلےٰ پیمانہ پر کارگزار بنایا جائے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ طلبہ رفتہ رفتہ ان مدارس میں آنے لگیں گے جو محض لبرل تعلیم سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے۔ بڑی مشکل صنعتی اور پیشہ وری کی تعلیم میں یہ ہوگی کہ عمدہ استاد نہیں ملیں گے جو معقول طریقہ پر صنعتوں اور پیشوں کی تعلیم دے سکیں۔ سرکار عالی نے اسی عملی پہلو سے عثمانیہ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ

کو ایسے پیمانہ پر قائم کیا ہے اور اس کو دارالضرب اور محکمہ برقی کے کارخانہ سے ملحق رکھا ہے تاکہ رفتہ رفتہ یہ صنعتی مدرسہ صنعتی تعلیم کا ایک زبردست مرکز بن جائے ان معاملات میں تسلی پر سرسوں نہیں جمائی جا سکتی۔ رفتہ رفتہ ان چیزوں کی نشو ونما ہوتی ہے۔ اس مدرسہ سے امید ہے کہ ایسے لوگ مل سکیں گے جو ابتدائی صنعتی مدارس میں استاد بن سکیں۔ ایک اور بات قابل غور یہ ہے کہ صنعتی تعلیم اگر بالفرض محال سرعت اور افراط سے دفعتہً دیجانے لگے تو کیا صنعتی مدارس کی تعلیمیافتہ لوگوں کو کام بہ آسانی مل جائے گا۔ کیا وہی صورت نہ پیدا ہو گی جو اس وقت بی۔ اے اور ایف۔ اے اور میٹرک پاس حضرات کی کثرت سے رونما ہے۔ اگر آپ نے بڑھئی اور لوہار اور سنار اور کارخانوں میں کام کرنے والے میکانکس فورمین اور مستری بہ کثرت تیار کر دئے تو کیا ان کی بے روزگاری کا سوال یہاں نہ پیدا ہو گا جبکہ ہمارے سرمایہ دار کارخانوں کے قیام کی نہ صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ واقفیت؟ علاوہ اس کے ایک بڑھئی کو آپ نے تیار کیا وہ یقیناً اس پھٹے حالوں بڑھئی سے زیادہ مزدوری مانگیگا جو کام بڑھئی کہتا ہوا گھر گھر مارا مارا پھرتا ہے۔ کیا ہمارے ہاں کے عام لوگ یہ پسند کریں گے کہ ایک روپیہ کے بجائے دو روپیہ روزانہ والے بڑھئی سے کام لیں۔ جب انگلستان جیسے ملک میں بھی جہاں پائی پائی بھر کا سرمایہ بے کار نہیں رہتا جہاں چپہ چپہ پر ہر قسم کے پیشہ وروں کے لئے کارخانے ہیں بے روزگاری کا مسئلہ نازک صورت اختیار کرلے تو کیا ہندوستان میں جہاں سرے سے سرمایہ میں ہمت نہیں اور کارخانے مفقود ہیں افراط سے صنعتی تعلیم وہی نئے قسم کی سوزش اور بھوک کی مار پیدا نہ کر دے گی جس کا اندیشہ ہر سوچنے سمجھنے والے ہندوستانی کو لگا ہوا ہے؟

امر واقعی یہ ہے کہ ہندوستان میں جو تعلیم دی گئی وہ بالکل ان حالات کے مطابق تھی جو ایسی تعلیم کے متقاضی تھے۔ اس تعلیم نے ایک معقول حد تک اپنا فریضہ نہایت عمدگی سے ادا کیا۔ یعنے ہندوستان کی تاریک دماغی میں روشنی پھیلائی۔ دل و دماغ کو بیدار کیا۔ ابھی کروڑہا آدمی اس روشنی سے دور ہیں۔ ان تک بیداری کو پہونچانے کے لئے ابھی موجودہ نظام تعلیمی کی شدید ضرورت ہے لیکن ساتھ ہی جیسا نواب صاحب نے اپنے سبق آموز خطبہ میں زور دیا ہے اس کی بھی ضرورت ہے کہ اس نظام تعلیمی میں اس قدر ترمیم کی جائے جس سے صنعتی اور پیشہ وری کی تعلیم حسب ضرورت آگے بڑھنے لگے۔ اگر یہ نتیجہ صحیح ہے تو پھر غور کرنے پر یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوستان میں اب تک جو تعلیم دی گئی وہ قابل وقعت ہے اور اس نے ملک کے سوتے دماغوں کو اپنے آپ اور اپنے ماحول کو سمجھنے کے لئے بیدار کر دیا۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں بھی صحیح طور پر تعلیم کی بنیاد وہی رکھی گئی جن کے حالات متقاضی تھے اور خصوصاً گذشتہ دس سال میں جو تعلیمی سرگرمی اس ریاست ابد مدت میں بفضلہ تعالے ایک بے نظیر روشن ضمیر فرمانروا کے زیر سایہ رہی ہے وہ ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ایک عظیم الشان یادگار رہیگی

ہماری سلطنت میں برطانوی ہند کی محض اندھی نقالی نہیں کی گئی بلکہ اس حد تک تقلید کی گئی اور برطانوی ہند کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا گیا جس حد تک وہاں کے اصول اور تجربوں کو اپنی ضرورتوں کے مطابق مفید سمجھا گیا۔ اور اس کے بعد نہایت غور اور احتیاط کے ساتھ اعلیحضرت اقدس و اعلی کی رہنمائی سے اس ریاست ابد مدت نے

محض تقلید نہ کرنے کا ثبوت اس دلیرانہ اور مدلل کارنامہ سے پیش کیا جس کا نام جامعہ عثمانیہ ہے اور جو اب دور دور تک مشہور ہو چلی ہے اور جس کے ذریعہ تعلیم کے اصول پر نواب صاحب نے نہایت فصاحت اور اجتہاد استدلال کے ساتھ اپنے خطبہ میں ایسی بحث کی ہے کہ ہماری سررشتہ کے ہر استاد کو ضرور پڑھنا چاہیے۔

نواب صاحب نے تعلیم نسوان پر بھی نہایت مدلل اور اچھوتی بحث فرمائی ہے لیکن یہ تبصرہ اس قدر پھیل گیا ہے کہ مجبوراً اس بحث کو کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھنا ضروری ہے۔

نواب صاحب کا خطبہ ہمارے اساتذہ اور عہدہ داران تعلیمات کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔ پڑھنے کے بعد ہمیں یقین ہے کہ ہر صاحب اپنے خیالات کی پونجی میں بہت سے کارآمد خیالات کا اضافہ پائیں گے اور جس تحریر میں یہ خوبی ہو وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے لکھنے والے دماغ میں اعلیٰ خیالات خلوص اور ابنائے وطن کی ہمدردی کا بے بہا خزانہ فطرت نے ودیعت کیا ہے۔

نمبر (۲)
ایک ناچیز مشورہ

جب کسی قوم یا آبادی میں ترقی کے آثار پیدا ہوتے ہیں تو ان آثار میں سب سے پہلی بات یہ ہوتی ہے کہ اس قوم یا آبادی کے لوگوں میں 'بیداری' پیدا ہوتی ہے 'بیداری' آج کل کی اصطلاح ہے اور اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ وہ قوم یا آبادی بیدار سمجھی جاتی ہے جو اپنے آپ اور اپنے حوالی کو سمجھنے اور ان پر غور کرنے لگے۔ یہ ترقی کی پہلی صورت ہوتی ہے کہ چند نفوس کو تڑپ لگ جاتی ہے کہ ہمیں اپنی حالت پر قانع نہ رہنا چاہیے

یا نہیں، اگر قانع نہیں رہنا چاہئے یا دوسری طرح یوں کہئے کہ اگر ہماری موجودہ حالت زمانہ اور حوالی کے مطابق نہیں ہے تو اس کو زمانہ کے مطابق کرنے یعنے اس کو سدھارنے کی کیا تدبیریں ہو سکتی ہیں۔ عمل کی پہلی سیڑھی محض نفسی یا ذہنی ہوتی ہے ــــ صرف سوچ کی حد تک محدود رہتی ہے۔ عمل کی دوسری سیڑھی یہ ہوتی ہے کہ جو دماغ سوچنے اور غور کرنے میں لگ جاتے ہیں وہ آپس میں تبادلہ خیال کرنے لگتے ہیں اور اس زرائی ادھیڑبن میں پڑ جاتے ہیں جن کے قابو میں لانے سے ایسے واقعات معرض ظہور میں لائے جا سکتے ہیں جن سے زمانہ اور حوالی کے مطابقت کی صورت پیدا ہو جائے۔ عمل کی تیسری سیڑھی یہ ہے کہ ان ناگزیر ترقی کے ذریعوں کو کسی مقام معین میں اکھٹا کیا جائے اور اپنی حالت کے سدھارنے کی شکل کو عملی صورت میں اصلیت کے گھن اور فطری قوانین کے ہتوڑے سے گھڑا جائے۔

پہلی سیڑھی پر منتشر دماغ علٰحدہ علٰحدہ سوچتے ہیں اور دوسری سیڑھی پر منتشر غور و فکر مجموعی سوچ بچار کی حیثیت اختیار کرتی ہے اور ان دونوں صورتوں میں بیشتر زبانی جمع خرچ ہوتا ہے۔ یعنے خیالات اظہار کے طالب ہوتے ہیں اور خیالات کو واضح، روشن اور معین کرنے اور اس طرح دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے میں بحث مباحثہ تاویل اور استدلال موافق جذبات کی چھیڑ چھاڑ اور مخالف ہیجانات کی روک تھام تحریر یا تقریر کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ تیسری سیڑھی پر بحث مباحثہ کم ہو جاتا ہے اور جسے اصلی اور عام معنوں میں عمل یا کام کہتے ہیں اس میں ایک مقاصد تنظیم کی صورت میں سرگرمی نمودار ہوتی ہے۔

فلسفیانہ بال کی کھال سے الگ ہو کر کسی قوم یا آبادی کی بیداری کی ابتدا اور ارتقا پر نظر ڈالی جائے تو یہ تجزیہ بیداری جو اوپر عرض کیا گیا ہے واقعاً صحیح نظر آئیگا ہندوستانی آبادی کی بیداری بھی اس تجزیہ کا ایک اور ثبوت ہے۔

نواب مرزا یار جنگ بہادر کے خطبہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے یہ بات دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جس موجودہ نظام تعلیمی پر آج عمل اس قدر بیدردی کے ساتھ لے دے ہو رہی ہے اسی کا طفیل تھا کہ ہندوستان کی بھانت بھانت اور رنگ برنگی آبادی میں بیداری شروع ہوئی۔ اس بیداری کا دوسرا درجہ بھی زور شور سے وجود میں آیا۔ مجموعی پیچ پکار کا طوفان کانگریس اور کانفرنس اور انجمن کی بے گنتی چھوٹی موٹی صورتوں میں ہندوستان بھر میں پھیل گیا۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں بھی آل انڈیا اے جوکے شنل کانفرنس کی تقلید میں ہماری تعلیمی کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی۔ اور حیث بحث تاویل اور استدلال کے پل بندھنے شروع ہو گئے۔ اس سے ضرور ہمارے ملک کی آبادی کو فائدہ ہوا تعلیم کا احساس لوگوں میں زیادہ ہو گیا لیکن جیسا کہ ہم نے خطبہ صدارت کے تبصرہ میں عرض کیا ہے بابرکت اور ترقی کی جان عہد عثمانی میں سرکار عالی کا سررشتہ تعلیمات خیال اور عمل دونوں حیثیت سے نہ صرف ہماری تعلیمی کانفرنس بلکہ بڑی بڑی بھاری بھرکم ہندوستانی کانفرنسوں اور انجمنوں سے بھی گوئے سبقت لے گیا۔ نہ صرف ذریعہ تعلیم کے مسئلہ کو فطری طور پر حل کیا بلکہ اس کو عمل کی تیسری سیڑھی پر پہونچا کر جامعہ عثمانیہ کی موجودہ صورت میں اس کو جیتا جاگتا واقعہ کر دکھایا اور یہی وجہ تھی کہ ہماری تعلیمی کانفرنس جو ہندوستانی نمونوں کی تقلید میں محض زبانی جمع خرچ میں رہی جامعہ عثمانیہ کے قیام اور نشوونما کے ساتھ کچھ ایسی ہو گئی جیسے کہ اوس سی پڑ جاتی ہے۔ ہماری تعلیمی کانفرنس نے لوگوں کے سامنے کوئی نیا اور مفید خیال اس کے سوا نہیں پیش کیا کہ بس "تعلیم" "تعلیم" پکارا کرے حالانکہ اب ہندوستانی بیداری اس نوبت کو پہونچ گئی ہے کہ عمل کی تیسری سیڑھی کی طالب ہے۔ بہرحال ہمارا ناچیز مشورہ اپنی تعلیمی کانفرنس کی خدمت میں یہ ہے کہ اب نواب مرزا یار جنگ بہادر نے جو قابل قدر رہنمائی فرمائی ہے اس کے متعلق محض رزولیوشن منظور کرنے اور ان کو

متعلقہ سررشتہ جات کو پہونچا دینے کی حد تک اپنی سرگرمیوں کو محدود نہ کرے بلکہ صنعتی اور زراعتی نصب العینوں کے تحت، نواب صاحب نے اس عمدگی اور قابلیت سے پیش فرمائے ہیں عمل کی تیسری سیڑھی پر قدم رکھے

ہماری تعلیمی کانفرنس موجودہ ضرورتوں کے لحاظ سے کم از کم ایک ایک دیہی اور شہری زراعتی اور صنعتی مدرسہ نمونہ کے طور پر قائم کرے۔ محض مالیہ کو وظیفہ دینا درد بھی اس تعلیم کے لئے جس کو کانفرنس مضر اور غلط ناقص اور غیر مکمل بیان کرتی ہے اور جو موجودہ نظام تعلیمی ہندوستان میں فراہم کر رہا ہے ہماری ناقص رائے میں اصول کے خلاف اور بیجا مصرف ہے۔ یہی روپیہ بہتر درسگاہوں کے قیام میں کیوں نہ صرف کیا جائے اور اس روپیہ سے صنعتی اور پیشہ وری کی مفید اور ضروری کتابیں کیوں نہ ترجمہ کرائی جائیں؟

ہماری تعلیمی کانفرنس کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ایک بڑی آبادی کی ہر پہلو سے ضروری تعلیم کبھی اعلیٰ ترین حکومت بھی نہیں کر سکتی ——— یہ کام پبلک خود ہی بہتر کر سکتی ہے اور ترقی یافتہ ملکوں میں یہی ہو بھی رہا ہے۔ ہم محض خوبصورت عبارتوں میں عظیم الشان رزولیشن پاس کریں اور یہ توقع رکھیں کہ حکومت ان کے مطابق بلا سوچے سمجھے نظام تعلیمی کو ہر سال الٹ پلٹ کرتی رہے خیر اور کچھ نہیں تو ایسی توقع خلاف انصاف ضرور ہے۔

ہم اپنی تعلیمی کانفرنس کو واقعی درسگاہوں کو قائم اور ان کو پالتے پوستے دیکھنا چاہتے ہیں اور جب ہماری کانفرنس اس طرح عملی ذمہ داری کا خطرناک بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیگی تو اس وقت اس کے قیمتی اور ذاتی مشوروں کو ہم اور بھی ادب اور احترام سے سننے اور اس کا ہاتھ بٹانے کو تیار ہوں گے اور غالباً حکومت بھی کانفرنس کی رائے کو اس وقت زیادہ وقیع سمجھے اس لئے کہ ایسی رائے زیادہ ذمہ دارانہ ہوگی اور کام کی طبیعی اور نفسیاتی دشواریوں اور رکاوٹوں سے ٹکریں کھا کھا کر قائم کی گئی ہوگی۔

مدیر و شریک مدیر

اشتہارات

مفتاح التعلیم
مؤلفہ سید محمد حسین صاحب جعفری بی۔ اے آکن

اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں سلیس زبان عام فہم پیرایہ میں یورپ کے جدید ترین اصول و طریقہ تعلیم کنڈرگارٹن تحریر کئے گئے ہیں اور ایسے طریقہ پر بیان کئے گئے ہیں جس کے مطابق تعلیم مدارس ابتدائیہ سلاع میں ہوسکتی ہے اس میں جابجا تصاویر دیکر مطلب واضح کیا گیا ہے قیمت فی جلد دو روپیہ سکہ عثمانیہ علاوہ محصول ڈاک۔

نوٹ۔ اب تک دفتر رسالہ المعلم میں اس کتاب کے جتنے آرڈر آئے تھے وہ سب ہم نے سید عبدالقادر صاحب تاجر کتب چارمینار حیدرآباد دکن کو دیدئے ہیں۔ پس براہ کرم دکان مذکور سے اگر وی پی مفتاح التعلیم وصول ہو تو فوراً واگزاشت فرمالیا جائے۔

یہ امر واضح رہے کہ مفتاح التعلیم کے سابقہ دو ایڈیشن ختم ہوجانے کی وجہ بروقت آرڈر کی تعمیل نہ ہوسکی اب تیسرا ایڈیشن چھپ چکا ہے اس لئے اب کتب مذکور کی ترسیل میں تعویق نہ ہوگی جس قدر نسخے مطلوب ہوں سید عبدالقادر صاحب تاجر کتب چارمینار حیدرآباد دکن سے طلب کیجئے۔

ذکر مہ اردسی
مؤلفہ مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم

یعنی مہاکوی کالیداس کے ایک مشہور ناٹک کا ترجمہ مع ایک بسیط مقدمہ کہ جس میں ہندو ڈرامہ کی تاریخ اور نوعیت پر مفصل بحث کیگئی ہے قیمت فی جلد یکروپیہ علاوہ محصول ڈاک

ہدایات برائے مدرسین
مؤلفہ سید محمد حسین صاحب جعفری بی۔ اے آکن

جن معائنہ مدارس جس قدر بھی ہدایات دیجاسکتی ہیں وہ سب ایک کتاب کی صورت میں شائع کی گئی ہیں۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اہم ترین اور معمولی ہر دو امور کے متعلق تفصیلی ہدایات درج ہیں قیمت فی جلد یکروپیہ علاوہ محصول ڈاک

خلاصہ تاریخ انگلستان
مؤلفہ مسز فشر

ابتک اردو میں کوئی ایسی مختصر تاریخ انگلستان موجود نہیں تھی جسکے پڑھنے سے انگریزوں کے حالات معلوم ہوسکیں۔ یہ کتاب اگرچہ میٹرک کے نصاب میں داخل ہے مگر ہر شخص اس سے فائدہ حاصل کرسکتا ہے قیمت فی جلد یکروپیہ بارہ آنہ سکہ عثمانیہ علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ دفتر رسالہ المعلم بگرامی موسائٹی نوچندر آباد دکن

زمانہ

رسالہ زمانہ اردو کا بہترین باتصویر ہواری رسالہ ہے جو منشی دیانرائن صاحب بی اے کی ایڈیٹری میں عرصہ ۲۳ سال سے روز افزوں ترقی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ زمانہ میں ملک کے نامور انشاپردازان اردو کے مسلم الثبوت اساتذہ کے مختلف مباحث پر مفید اور قابل دید مضامین درج ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ کسی خاص قوم یا فرقہ یا مذہب کا طرفدار نہیں ہے بلکہ اس کو ملک کی عام بہبودی مذاق سلیم کی ترقی اور معلومات کی توسیع منظور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نہایت کامیابی کے ساتھ ۲۳ سال سے اب تک جاری ہے۔ پانچر روپیہ منی آرڈر بھیجکر سال بھر کیلئے خریدار بن جائیے۔ یا پہلا پرچہ وی پی طلب کیجئے

المشتہر منیجر رسالہ زمانہ کانپور

اخبار تعلیم لاہور

ہر قسم کے تعلیمی معاملات پر آزادانہ بحث کرنے والا مدرسین کا وکیل اور ترجمان، طلبہ کا معاون و مددگار، افسران محکمہ تعلیم کا خیر خواہ، سررشتہ تعلیم کا مشیر، ہر قسم کے علمی، اخلاقی، طبی وغیرہ مضامین کا مخزن، ہفتہ وار اخبار تعلیم لاہور سے شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ چار روپیہ شش ماہی دو روپیہ آٹھ آنہ سہ ماہی ڈیڑھ روپیہ

منشی طالب علیصاحب بی اے منتظمی ایڈیٹر اخبار تعلیم لاہور سے طلب کیجئے

رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

شمالی ہند کا نامی گرامی تعلیمی رسالہ ہیں سال سے پوری شان و شوکت کے ساتھ لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کی خوبیاں اسکے مطالعہ سے ظاہر ہو سکتی ہیں۔ قیمت سالانہ تین روپیہ سکہ کالدار حجم ماہانہ (۱۲۰) صفحہ ملنے کا پتہ

ماسٹر جگت سنگھ پروپرائٹر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

رجسٹرڈ و سپرکلاس عالی نشان ملک

برادر ہند

گورنمنٹ ایم نشان ۲۶۵

نمبر ۸ و ۹

المعلم

ماہ فروردی وار دی بہشت سنہ ۱۳۳۵ف

مدیر..... محمد سجاد مرزا ایم اے (کنٹب).....

شریک مدیر..... محمد عظمت اللہ خاں بی۔ اے.....

اعظم اسٹیم پریس چامینا

حیدرآباد دکن

قواعد

(۱) یہ محض تعلیمی رسالہ ہے جس میں تعلیم نے متعلق سبھوں کے متعلق مضامین درج ہونگے سیاسی یا مذہبی مضامین شریک نہ کئے جائیں گے

(۲) یہ رسالہ ہر ماہ فصلی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا

(۳) پرچہ وصول نہ ہو تو ہر ماہ فصلی کی ۲۵ تاریخ تک خریدار صاحبان بحوالہ نمبر خریداری مطلع فرمائیں

(۴) جو مضامین ناقابل طبع متصور ہوں گے اُن کی واپسی خرچہ ڈاک کی روانگی پر منحصر ہوگی

(۵) اس رسالہ کی قیمت سالانہ (سے) مع محصول ڈاک ہے جو پیشگی لی جائے گی

(۶) نمونہ کا پرچہ پانچ آنہ کے ٹکٹ وصول ہونے پر ارسال کیا جائے گا۔

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ وصول ہونا چاہیئے ورنہ ادائی جواب میں مجبوری رہے گی

(۸) اجرت طبع اشتہارات درج ذیل ہے۔ رسم وصول ہونے پر اشتہارات طبع کئے جائیں گے

تعداد مدت	صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
ایک بار	ع	ھ	ہے
سہ ماہ	ع	لے ع	ھ
ششماہ	لے	ع	ع
سالانہ	ع	لے	ع

(۹) جملہ مراسلت و ترسیل رقوم منی آرڈر وغیرہ موسومہ شریک مدیر پتہ ذیل پر ہونی چاہیئے

محمد عظمت اللہ خاں بی اے شریک مدیر

دفتر رسالہ المعلم بلگرامی ہوس سانچہ توپ

حیدرآباد دکن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

المعلم

(۱) خطبہ کان وکے شن جامعہ پنجاب۔ از جناب نواب نواز جنگ بہادر صدر المہام صیغہ فینانس سرکار عالی (تا ۳۸)

(۲) مملکت آصفیہ کی امداد باہمی کی انجمنیں۔ ،، مولوی سید محمد مہدی صاحب (۳۹ تا ۴۲)

(۳) مسئلہ [illegible] جڑیں۔ ،، مولوی محمد باقر مرزا صاحب ایس سی ایف آر (۴۳ تا ۶۶)

(۴) پیشوں کی تعلیم۔ ،، مولوی سید علی اکبر صاحب ایم ایس (لندن) ایم اے (کیمب) (۶۶ تا ۷۴)

(۵) تبصرہ ..... از شریک مدیر (۷۵ تا ۷۸)

(۶) شذرات (۷۸ تا ۸۰)

جلد ۲	ماہ فروردی و اردی بہشت ۱۳۳۵ف	نمبر ۸ و ۹

خطبہ کان وکے شن جامعہ پنجاب

از

نواب نواز جنگ بہادر

صدر المہام صیغہ فینانس سرکار عالی

اس سال جامعہ پنجاب کی کان وکے شن میں خطبہ پڑھنے کے لئے عالیجناب نواب نواز جنگ بہادر پر نظر انتخاب پڑی۔ نواب صاحب ممدوح کی شخصیت کی شہرت ہندوستان بھر میں ہو چکی ہے ان کی ستودہ صفات کا ذکر خیر اب صرف ممالک محروسہ سرکار عالی تک محدود نہیں۔ اگرچہ اس کی حاجت نہیں کہ نواب صاحب کا تعارف مملکت آصفیہ یا برطانوی ہند کے ارباب بینش

سے کرایا جائے تاہم نواب صاحب کی قابل قدر شخصیت کے بعض خصائص ایسے انمول ہیں کہ جن کو پبلک کے سامنے پیش کرنا بجائے خود ایک عمدہ علمی سبق کا حکم رکھتا ہے۔

نواب صاحب بمبئی کے ایک علمی اعلےٰ خاندان کے فرد ہیں اور آپ نے مالیات کے فن میں مہارت تامہ حاصل کی اور برطانوی ملازمت اور بعد میں مملک آصفیہ میں اسی شعبہ میں کارنمایاں کرکے اپنے آپ کو ایک کامل ماہر فن ثابت کر دیا۔ ہمیں یہاں نواب صاحب کی ملازمت کے روشن کارناموں کو دہرانا نہیں ہے بلکہ اس بات پر زور دینا ہے کہ نواب صاحب نے ایک خاص فن میں یدطولیٰ حاصل کرنے پر بھی ہندوستان کی سب سے بڑی ضرورت سب سے بڑے مسئلہ۔ تعلیم کو اپنا محبوب مشغلہ بنایا اور اس میں بھی اپنے آپ کو ایک فرد کامل ثابت کر دکھایا۔

یوں تو نواب صاحب اپنی زندگی کے ہر زمانہ میں تعلیمی مسائل کی سوچ بچار میں منہمک اور تعلیمی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے لیکن جب آپ مملکت آصفیہ کے عہدۂ معتمدی عدالت کو توالی و امور عامہ جس کے تحت سررشتۂ تعلیمات ہے) پر فائز ہوئے تو آپ کو تعلیمی میدان میں تعمیری کام کا وہ موقع ملا جس کے لئے فطرت نے نواب صاحب میں خاص قابلیت ودیعت کی تھی اور جس کو مدتوں کی سوچ بچار اور مسلسل دلچسپی نے مانجھ مونجھ کر اجال دیا تھا نواب صاحب کے زمانہ معتمدی میں گویا تعلیمات میں جان سی پڑنے لگی اور نواب عماد الملک بہادر نے جس سررشتہ کی داغ بیل وسیع النظری اور دوربینی سے ڈالی تھی اس پر ایک شاندار عمارت بلند ہونے اور عامۃ الناس کی نگاہوں کو کھینچنے لگی

اسی زمانہ میں ملک کا ستارۂ اقبال اعلیحضرت اقدس واعلیٰ کے عہد تعلیم مہد کی صورت میں چمکا۔ اور ضمیر منیر سلطانی نے ایک حکیم نبض شناس کی طرح اس ریاست ابد مدت کی تعلیمی ترقی کے لئے وہ تاریخی فرمان مبارک جاری فرمایا جس نے سارے ہندوستان کے تعلیمی حلقوں میں ہل چل ڈالدی۔

نواب حیدر نواز جنگ بہادر کی شخصیت کی زبردست چیز عملی تعمیری رجحان ہے۔ جس مسئلہ پر ان کی نظر پڑتی ہے وہ اسی پہلو سے پڑتی ہے کہ اس مسئلہ میں بحالات موجودہ کہاں تک عملی صورت اختیار کرنے کی صلاحیت ہے اور یہی وہ رجحان ہے جو ایک قابل ذہنیت کو نہ صرف ایک اعلےٰ درجہ کا مدبر کار بلکہ ایک قابل قدر مدبر Statesman بنا دیتا ہے۔ ایک ایسے عہدہ دار کے لئے اس سے زیادہ کیا خوش نصیبی ہو سکتی تھی کہ بارگاہ سلطانی کی اصولی رہنمائی کے ساتھ تعمیری کام کا موقع جامعہ عثمانیہ کی شکل میں نصیب ہو۔ نواب صاحب نے ارشاد خسروی کی اتباع میں جامعہ عثمانیہ کے متعلق جو جانکاہی کی اور اس کو خون پسینہ ایک کر کے سینچا اس کی وجہ سے نواب صاحب کا نام ہمیشہ ایک سچے جاں نثار اور خادم علم کی حیثیت سے جامعہ عثمانیہ کے ساتھ وابستہ رہے گا۔

ملک اور مالک کی اس شاندار خدمت کے ساتھ نواب صاحب کی یہ بلیغ کوشش بھی رہی کہ جامعہ عثمانیہ کے اصول کی دھاک ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بٹھائی جائے اسلئے کہ یہی وہ اصول ہے جس سے تعلیم ہندوستان میں گھر گھر اور جھونپڑے جھونپڑے رواج پا سکتی ہے۔ چنانچہ اس خطبہ کے موقع پر نواب صاحب نے اس زرین اصول کو جس حسن اور زور سے پیش کیا ہے اس کا لطف قارئین کو پڑھنے سے آئے گا۔

اب ہمیں نواب صاحب کی صرف ایک اور خصوصیت کی طرف توجہ دلانی ہے۔ نواب صاحب جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہے ایک اعلےٰ درجہ کے مدبر کار ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی ستودہ اور پاک زندگی دفتری امور کے علاوہ اوقات میں ایک کلچر کی زندگی ہے۔ کلچر کے معنے یہ ہیں کہ علم اور فنون انسان کی روزمرہ زندگی میں رچ جائیں اس کا اوڑھنا بچھونا بن جائیں۔ علم صرف کتاب اور زبان کی حد تک نہ رہے بلکہ انسان کی حرکات و سکنات اور رہنے سہنے سے علم و فن کی خوبیاں ٹپکنے لگیں۔ نواب صاحب کی زندگی اس کلچر کا بہترین نمونہ ہے۔ فنون لطیفہ خصوصاً ہندوستان کے قدیم

عنوان کے نمونوں سے نواب صاحب کو عشق ہے۔ اس کے علاوہ ان کی فرصت کا وقت مطالعہ اور علمی مذاکرہ میں گزرتا ہے۔ نواب صاحب کی ہستی ان مسلمانوں کی سی ہے جن کا پتہ ان زرین زمانوں میں ملتا ہے جب ملل اسلامیہ اوج پر تھیں اور ان مسلمانوں کے نام آج بھی دنیا کے مشایتہ حصوں میں قدر و احترام ہیں۔

شیر پاک مدیر

یو ایک سی لکن سی، بعزز نائب امیر جامعہ، رفقائے مجلس انتظامی (سنڈیکیٹ) اور جامعہ پنجاب کے فارغ التحصیل حضرات ——

آپ کے معزز نائب امیر جامعہ نے (دائس چانسلر) کو سالانہ خطبہ کانووکیشن کے سن پڑھنے کی مجھے لاہور میں شفقت آمیز دعوت دی۔ مجھے اس دعوت کے قبول کرنے میں ایک خاص مسرت ہوئی۔ اس لئے کہ ملازمت کی ابتدا ہی میں میری تعیناتی اس پرانے شہر میں ہوئی۔ اس وقت میں یہاں بہت کم مدت ٹھیر سکا لیکن اس تھوڑے سے زمانہ قیام میں مجھے بہت سے ایسے احباب سے شناسائی کا شرف حاصل ہوا جن کے نام آپ کی جامعہ کی تقویم (کالنڈر) کے صفحوں کی زینت ہیں —— دونوں قزلباش بھائی سر نوازش علی اور ناصر علی، دو درویش کامل قمر الدین اور جمال الدین، دو بڑے قانون داں سر پرتول چندر اور لالہ مدن گوپال اور خان بہادر برکت علی اور مفتی سلیم اللہ جو بجائے خود ایک جداجدا طبقہ کا حکم رکھتے تھے۔ یہ کیا خوبیوں کے انسان تھے، کرم فرما، باوقار اور علم میں پکے ہوئے بھلے لوگ جو افسوس ہے کہ اب اپنی سرگرمیوں کی جولانگاہوں سے ناپید ہو چکے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اب بھی آپ لوگوں کے درمیان ایسے چند نفوس سرگرم کار ہیں جن سے اس زمانہ میں مجھے ملنے کا موقع نہیں ملا لیکن جن کی ملاقات کا فخر مجھے بعد میں آپ کے

صوبہ کی حدود کے باہر حاصل ہوا۔ ان لوگوں میں ایک تو آپ کے صوبہ کے ممتاز صدر حکومت ہیں جن کے تحت کام کرنے کی مجھے اُس وقت مسرت نصیب ہوئی جبکہ برطانوی مملکت ہند کے مالیات کی باگ اُن کے ہاتھ میں تھی۔ دوسرے آپ کے فاضل نائب امیر جامعہ ہیں ان سے مجھے ملاقات کی ایک مدت سے آرزو تھی۔ کیونکہ ان کو ہندوستانی فنون لطیفہ اور کلچر سے گہری دلچسپی ہے اور حسن اتفاق سے میں ہندوستانی جامعوں کی کانفرنس کے موقع پر ان سے مل بھی چکا ہوں۔ تیسرے میرے معزز میزبان ڈاکٹر سر میاں محمد شفیع ہیں جن کے سرکئی کارناموں کے اعزاز کا سہرا بندھ چکا ہے اور جن کی ذات سے ابھی بہت سے کاموں کی توقعات وابستہ ہیں۔ چوتھے آپ کے ناظم تعلیمات ہیں۔ یہ دراصل میرے ہی صوبہ سے تشریف لائے ہیں اور جنھوں نے ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے کہ پونا کی مسلم کانفرنس کے روبرو پنجاب کے تعلیمی کارناموں کا قابل قدر تذکرہ پیش کیا تھا۔ یہ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کے ان تھک معتمد تھے اور اجنتا اور بعد حیدرآباد میں مجھ کو ان کے اور سرمائی کل ساونڈر اور دیگر ارکان کمیشن کے ساتھ جو دن گزارنے کا موقع ملا وہ دن میری یاد کے خزانہ میں ہمیشہ جگمگا کر رکھے جائیں گے اور پانچویں آپ کے نہیں مجھے یہ کہنا چاہئے کہ ہمارے قومی شاعر ہیں جن کی شاعری کی بانگ درا صرف ہندوستان کی ہی نہیں بلکہ ساری ایشیا کی فضا میں گونج رہی ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے آپ کی دعوت سے مجھے بجا مسرت ہوئی اس لئے کہ اس بہانہ سے مجھے ایک ایسے شہر کو پھر دیکھنے کا موقع ہاتھ آیا جو بہت سی تاریخی اور شخصی باتوں کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ جب میں نے ان اصحاب کی فہرست پر نظر دوڑائی جو زندگی کے مختلف شعبوں میں امتیاز پا چکے تھے اور جنھوں نے آپ کو مخاطب کیا تھا ــــ خصوصاً سر آشوتوش مکرجی کی بڑی اور زبردست شخصیت پر جب میری نظر پڑی جن کا نام میرے قریب کے پیشرو اصحاب میں ہے اور جن کے متعلق بلا مبالغہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ

انھوں نے کل علمی دائرہ کو اپنی مملکت، درتعلیم کے میدان کو اپنی قلمرو بنالیا تھا۔ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ آج جو میں آپ کو خطاب کر رہا ہوں۔ اس ذمہ داری کے کام کو میں نے بہت کچھ دھڑکتے دل کے ساتھ اور ہچکچاتے ہوئے قبول کیا۔ اب چونکہ میں اس ذمہ داری کو اپنے سر لے چکا ہوں میں آپ کو کم سے کم اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں ہندوستانی طالب علم کی خواہ وہ کہیں ہو اصلی اور اخلاصمندانہ ہمدردی اور ہندوستانی تعلیم کے کام کی ترقی کی مستقل اور خالص آرزو۔ ان باتوں میں ان اپنے پیشرو ناموروں سے مساوات کے دعوے کی جسارت کر سکتا ہوں۔ البتہ جہاں تک علم وفضل اور خداداد دماغی استعداد کا تعلق ہے میں اس بارے میں اپنے آپ کو جتنا کچھ سمجھوں اس سے یہ بڑے لوگ کہیں بڑھے چڑھے تھے۔ اس لئے اے جامعہ پنجاب کے فارغ التحصیل نوجوانو مجھے امید ہے کہ آج میں جو امور آپ کے سامنے پیش کرونگا آپ ان باتوں سے اکتائیں گے نہیں اور اس بات کو یاد رکھیں گے کہ یہ الفاظ ایک ایسے شخص کی زبان سے نکلیں گے جس کے دل میں آپ کا درد ہے اور جو آپ کی طرح ایک ہندوستانی کالج میں طالب علم رہ چکا ہے اور جس نے عمر بھر ایک طالب علم بنے رہنے کی کوشش کی ہے اور اس حیثیت سے آپ کی احتیاجوں، بلند حوصلوں، اور خدشوں کا ایک درد شریک کی طرح پورا پورا احساس رکھتا ہے۔

ہندوستانی جامعہ کے فرائض

میں یہ کہتا ہوں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ میں وہی بات دہرا رہا ہوں جس کی آواز ہر طرف سے آرہی ہے اور مختلف الرائے اصحاب بھی جس معاملہ میں ہم زبان ہیں۔ کہ ہمارا ہندوستانی نظام جامعہ اور سچ تو یہ ہے کہ ہمارا سارا نظام تعلیمی اپنے مقاصد کے حصول میں بہتر طور پر کامیاب ہوگا اگر اسکو ہمارے وطن کی موجودہ ضرورتوں کے ساتھ اور زیادہ وابستہ کر دیا جائے۔

یہ اب محسوس ہونے لگا ہے کہ اس وقت ملک کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ غیر معین طور پر روز افزوں ایف۔اے اور بی۔اے پاس لوگوں کی تعداد بڑھتی جائے اور یہ تعداد سرکاری ملازمت کی خواہاں ہے اور ملازمت کے نہ ملنے کی صورت میں بے روزگاروں کی فوج میں اور اضافہ کر دے۔ اس طرح کے بے روزگاری کے شکار نئے چین رہیں گے اور جو لوگ ہندوستانی طالب علم سے ذرا سی بھی ہمدردی اور ہندوستانی نظام تعلیم کی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ یہ تسلیم کریں گے کہ یہ ناانصافی کے احساس کی بنی بے چینی نے جانہیں۔ ملک کو ضرورت ایسے آدمیوں کی ہے جو ملک کی بقا کے ہر قسم کے پیشوں اور کاروبار میں کھپ جائیں۔ یہ لوگ صرف تعلیم یافتہ ہی نہ ہوں بلکہ جہاں تک ہو سکے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پھر خصوصیت کے ساتھ اس کام کے تربیت یافتہ ہوں جو ان کو تعلیم سے فارغ ہو کر کرنا ہوگا۔ یہ ایک مسلمہ سی بات ہے کہ بحالت موجودہ ہندوستان کو ضرورت تربیت یافتہ ماہرین زراعت، تربیت یافتہ کاروباری لوگوں کی ہے۔ دفاتر کے کلرکوں کی نہیں۔ تربیت یافتہ انجینیر، ڈاکٹر، کارخاندار، اصحاب فنون لطیفہ، صناع، لوہار، جلاہے، کمہار غرض کہ بجز کلرکوں کے اور ہر چیز میں تربیت یافتہ لوگوں کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت بھی تربیت یافتہ یا کم سے کم صاحب اسناد کلرکوں کی تعداد مانگ سے بڑھی ہوئی ہے حالانکہ ملک کا پیداوری کام بیشتر ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو نسبتہً باحسن وجوہ اپنے کام کو انجام نہیں دے سکتے۔ اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ دولت (اسٹیٹ) یا قوم کیلئے یہ بات کبھی مفید نہیں ہو سکتی کلرکوں (اور عہدہ داروں) کی تعداد میں ہمیشہ اضافہ ہوتا جائے، اور اس طرح نظم ونسق کی مشین ری پیچیدہ اور محض نظم ونسق کے مصارف زیادہ ہوتے جائیں۔ دولت کا مطمح نظر تو یہ ہونا چاہئے کہ کلرکوں (اور عہدہ داروں) کی اقل تعداد مستقلاً معین ہو جائے لیکن تربیت کے ذریعہ یہ تعداد پوری طرح

کارآمد اور کارگزار بنائی جائے۔ اس سے ایک طرف مشین ری سیدھی سادی رہے گی اور دوسری طرف نظم ونسق کے مصارف میں بھی تخفیف ہو جائے گی اور دولت کو اس بات کا موقع ملے گا کہ ہر ممکنہ ذریعہ سے ملک کی پیداوار ثروت کو پال پوس سکے ہندوستان میں جیسا کہ آپ کو معلوم ہے تاریخی اتفاقات نے فطری ترتیب کو الٹ دیا ہے۔ جامعات اس نئے ترتیبی کو درست کرنے میں بڑی مدد دے سکتی ہیں لیکن یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ جامعات کو نظام تعلیمی کی ملکی ضرورتوں کے لحاظ سے اصلاح نظر ثانی اور اقتدار میں وہ حصہ حاصل ہو جائے جس کی وہ مستحق ہیں۔

اس کو سن کر فوراً یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ "یہ کام جامعہ کا نہیں ہے" بے شک یہ کام بہ حالات موجودہ جامعہ کا نہیں سمجھا جاتا اور میرا کہنا یہ ہے کہ یہ کام جامعہ سے متعلق ہونا چاہئے۔

جامعہ کو چاہئے کہ وہ اس ملک یا صوبہ کا جہاں وہ اپنا کام انجام دے رہی ہے اپنے آپ کو بمنزلہ اس دماغ کے بنالے جو وہاں کے تعلیمی مسائل کو سوچے اور وہاں کے تعلیمی نظام کو چلائے ——— ان تعلیمی مسائل کو ٹھنڈے دل اور بے لاگ استدلال سے سوچے جن پر غور و فکر کے لئے حکومت کے ارباب حل وعقد بوجہ کثرت کار وقت نہیں دے سکتے اور سیاسی فرقوں کے ارباب کو کبھی ان دقتوں کا سامنا نہیں ہوتا اور پبلک (عامۃ الناس) کبھی ان کی اہمیت کو خاطر میں نہیں لاتی۔ آپ کے ذہن میں جامعہ کا تصور یہ ہے کہ جامعہ ایک امتحانی جماعت اور کسی حد تک تدریسی جماعت ہے اس جماعت کا فریضہ یہ ہے کہ ایک روزمرہ کی اجیرن سی کہانی کا سمجھا بوجھا انجام ٹیم ٹام سے فراہم کر دے۔ فوقانی نظام کے گھڑے گھڑائے طلبہ پر بی۔ اے کا چھاپ لگا دیتی ہے جس طرح بکری کے شربتوں کی بوتلوں کے بھرنے اور کاگ لگانے کے جانچ پڑتال کے مہر لگا دی جاتی ہے۔ مجھے قوی توقع ہے کہ وہ دن دور نہیں کہ جا

ایک سوچنے والی تحقیقاتی اور حکمراں جماعت ——— یعنے ایک ایسا جتھا بن جائے جو اپنا نفس اور ارادہ علٰحدہ رکھتا ہو۔ اس جماعت کا نفس اور ارادہ ہمارے نفوس اور ارادوں سے بالاتر ہوگا اس لئے کہ ایسی جماعت کے نفس میں علمی گہرائی اور اس کے ارادہ میں زیادہ بے لاگ فیصلہ کی صلاحیت ہوگی اور اس طرح ایسی جماعت تعلیم کے معیار کو بہت اونچا کر دے گی اور اس اونچان پر سے اس معیار کو گرنے نہ دے گی

نظام تعلیمی کی نظر ثانی یونیورسٹی کو اپنے میدان تعلیمی کے دماغ کی حیثیت سے جو پہلا کام کرنا ہوگا وہ میں نے جو جامعہ کے فرائض کا تصور بیان کیا ہے اس کے مطابق یہ ہے کہ جامعہ تعلیم کی جملہ منزلوں کی ایک حاوی اور مکمل نظام سوچے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بالفعل تعلیم کی تین منزلیں قرار دی گئی ہیں۔ تحتانی، ثانوی (جس میں وسطانی اور فوقانی مدارس شمار کئے جاتے ہیں) اور جامعی۔ ہر منزل کا مدعا یہ ہے کہ آئندہ منزلوں کے لئے طلبہ کو تیار کیا جائے اور جب تیاری مکمل ہو جائے تو آگے کی منزل کا پروانہ طلبہ کو دیا جائے۔ یہ منزلیں اس طرح قائم نہیں کی گئی ہیں کہ ہر منزل بطور خود کافی ہو اور کسی خاص تعلیمی مقصد کو پورا کر دے۔ اس لئے کہ میں یہ سوال اٹھانا چاہتا ہوں کہ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ان تین منزلوں کی بجائے تعلیم کی تین جداگانہ شقیں قرار دی جائیں۔ ہر شق بذات خود کافی و وافی ہو اور ایک واضح مقصود کے پیش نظر ہر شق کے انتظامی کل پرزے ایسے موزوں بٹھائے جائیں کہ مقصود اپنے آپ حاصل ہو جائے۔

(۲)۔ ناگزیر نصاب مثال کے طور پر تحتانی منزل کو لیجئے۔ اس منزل کا منشاء یہ ہے کہ بیشتر کم سن بچوں کی ابتدائی درس تدریس ہو جائے۔ اس منزل کا موجودہ نظام کے تحت ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ اس منزل سے فارغ ہو کر بچے اس قابل ہو جائیں کہ مردم شماری کے وقت ان کا لکھے پڑھوں میں شمار کیا جائے اس سے

بڑھ کر اگر کوئی مقصد ہے تو وہ یہ کہ بچے اس کے بعد کی منزل ـــــ ثانوی منزل میں قدم رکھنے کے اہل ہو جائیں جس کے معنے یہ ہیں کہ تحتانی منزل اس راستہ کا ایک حصہ ہے جس کے آس سرے پر پہونچکر یہ بچے سند یافتہ کلرک بن سکیں گے۔ اس کے علاوہ تحتانی تعلیم کا بہ حیثیت تحتانی تعلیم کوئی مقصود ہی نہیں ہے۔ اس بات کو پیش نظر رکھنے کے بعد کہ تحتانی مدرسوں میں پڑھنے والوں میں سے اکثر پڑھائی سے فارغ ہو کر دیہات میں پیشے اختیار کرتے ہیں یہ سوال بے جا نہیں کہ کیا تحتانی تعلیم کو ان بچوں کے لئے جو اسے حاصل کرتے ہیں زیادہ موزوں نہیں بنایا جا سکتا جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ان کو اپنی زندگی گزارنے کے لئے بہتر ذہنی ساز و سامان مل جائے۔ حضرات! مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پہلی اور سب سے اہم تعلیمی منزل میں ان جملہ مضامین کی تعلیم دیجانی چاہیے جو بہ لحاظ اہمیت اولیت کا درجہ رکھتے ہیں ـــــ ایسے مضامین جن کا جاننا دولت (اسٹیٹ) کے ہر شہری (سٹی زن) کے لئے کار آمد ہے خواہ وہ شہری مرد ہو یا عورت اور خواہ اُس کا پیشہ کچھ ہی ہو۔ اور جو ہر شخص کو بہتر شہری اور اس کے کام کو زیادہ مفید بنا دیں۔ ان مضامین اور ان کی تعلیم کو میں ناگزیر نصاب یا تعلیم کہنا بہتر سمجھتا ہوں۔ اس قسم کے ناگزیر مضامین میں بہت سے ایسے مضامین بھی شامل ہوں گے جن کی تعلیم اب وسطانی (مڈل) مدارس میں دی جاتی ہے۔ نہیں کچھ حصہ اُن مضامین کا بھی ان میں آجائے گا جو فی الحال فوقانی (ہائی) مدارس سے متعلق ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا یقین ہے کہ تحتانی تعلیم میں اس وسیع نصاب کا بندوبست ہو سکتا ہے لیکن ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ تحتانی تعلیم دیسی زبان میں دی جائے اور ان مضامین کے مطابق اس زبان میں مناسب دیسی کتابیں (ریڈریں وغیرہ) تیار کرا لی جائیں اور ہر تحتانی مدرسہ میں موزوں کتابوں کے کتب خانے قائم کر دئے جائیں۔ صرف یہی کافی نہ ہوگا۔ اس بات کی بھی اشد ضرورت ہے کہ ایسے ناگزیر مضامین کے مطابق ہو

مدرسے درس دیتے ہوں اُن میں درس تدریس محض ادبی یعنے کتابی نہ ہو بلکہ ان مدرسوں کی تعلیم کا ایک عملی رُخ بھی ہو جس میں دیہاتی مدارس کی صورت میں زراعت، باغبانی اور گھریلو صنعتوں اور شہری مدارس میں فنون لطیفہ اور پیشوں کی تعلیم دی جائے۔ حیدرآباد میں اس قسم کا ایک تجربہ کیا جا رہا ہے اور اس تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ جو لڑکے اپنی تعلیم کا ایک حصہ اس طرح کسی پیشہ میں دستگاہ حاصل کرنے کے لئے صرف کرتے ہیں وہ اسی مدت میں جو مجموعی نصاب تعلیمی کے تحت اور لڑکوں کو ثانوی اور فوقانی منزلوں میں گزارنی پڑتی ہے کس قدر زیادہ ترقی کر سکتے ہیں۔

(ب) پیشہ وری فوقانی مدارس اس طرح کے ضروری نصاب کو ختم کر کے لڑکا یا تو تعلیم ہی کو خیرباد کہے گا اور زراعت یا کسی اور پیشہ میں لگ جائے گا کیونکہ جو ثانوی تعلیم اس طرح تنظیم پائے گی وہ اس کے لئے کافی پیشہ وری کی تعلیم سمجھی جانی چاہیئے یا لڑکا یہ کرے گا کہ وہ جس پیشہ کی فکر میں ہے اُسی پیشہ کا خاص تعلیمی نصاب لینا چاہے گا۔ اس خاص تعلیمی نصاب سے فارغ ہو کر اسے اختیار ہوگا کہ جامعہ کی تعلیم سے کنارہ کرے یا کسی جامعہ کے نصاب کو اختیار کرے۔

جس طرح میں نے ابھی اس پر زور دیا ہے کہ تعلیم کی پہلی منزل کو ایک مکمل تربیت کی صورت ان لڑکوں کے لئے دی جائے جو مدرسہ ثانیہ سے آگے نہیں بڑھنا چاہتے یہ نصاب اچھی طرح سوچ سمجھکر قرار دیا جائے اور اس کے اختتام پر طالب علم ایک خاص مقصود کے لئے تیار ہو جائے یہ نہ ہو کہ مدرسہ ثانیہ سے نکلنے کے بعد لڑکے کی حالت سے یہ معلوم ہو کہ اس نے گویا ایک راستہ ادھورا طے کر کے چھوڑ دیا اور ایسی جگہ چھوڑ دیا جہاں کسی بات کی تکمیل نہیں ہوتی۔ غرض ان امور کے مدنظر میں اس کو مناسب خیال کرتا ہوں کہ اس امر پر غور کیا جائے کہ دوسری منزل کو کہاں تک ایسا بنایا جا سکتا ہے کہ اس سے ان مقاصد اور ضرورتوں کی تکمیل ہو جائے جن کے لئے مزید تعلیم

اور تربیت کی ضرورت ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ جب یہ ناگزیر نصاب کی تکمیل کر لیجائے تو لڑکے مدارس فوقانیہ میں داخل ہوں۔ ہر مدرسہ فوقانیہ کا مقصد یہ ہو کہ ایک خاص پیشہ کی تربیت جہاں تک ہو سکے کافی اور مکمل دے۔ مثلاً ایک لڑکا فنون لطیفہ میں ماہر ہونا چاہتا ہے۔ یہ لڑکا ناگزیر نصاب تحتانیہ کو ختم کر کے مدرسہ فنون لطیفہ میں داخل ہو جائے گا۔ انجینیری کا شوقین مدرسہ انجینیری، طب کا طالب مدرسہ طبیہ وغیرہ میں تعلیم پائے گا۔ ان مدارس فوقانیہ سے بھی جو طلبہ اپنے اپنے فن میں اعلےٰ درجہ کی تعلیم کے خواہشمند ہوں گے اُن کا احتیاط سے انتخاب کیا جائے گا اور وہ جہاں کے احاطہ میں قدم رکھیں گے۔ سرکاری ملازمت کی تیاری بھی قانون یا طب کی طرح ایک پیشہ کی تربیت سمجھی جائے گی اور اس تربیت کے لئے بھی خاص درسگاہیں ہوں گی۔ ان پیشہ وری مدارس کا انتظام تو جامعہ نہیں کرے گی لیکن ان کی نگرانی جامعہ کے سپرد کی جائے گی۔ اس قسم کی نگرانی کے لئے جامعہ کو دو ضروری فرائض میری رائے میں مجبوراً انجام دینے ہوں گے۔ پہلا فرض تو یہ ہوگا کہ جامعہ مسلسل تحقیقات کرے اور مواد فراہم کرے، جس سے اُن مختلف پیشہ لوگوں کی تعداد معلوم ہو سکے جن کی ضرورت حکومت، ریلوے کمپنیوں، پبلک اور خانگی دفاتر اور کارخانوں کو ہوگی اور اس بات کی نگہداشت کرے کہ ان پیشوں کے مدارس میں ضرورت سے بہت زیادہ تعداد تعلیم کی غرض سے شریک نہ ہو سکے۔ اُن اعداد و شمار کی فراہمی جامعہ کے لئے ایک بالکل نیا مسئلہ ہوگا اور یہ بھی ضروری ہے کہ یہ ایک وقت طلب کام ثابت ہو۔ لیکن تجربہ اور رفتہ رفتہ ہر سال کے اعداد کے اکٹھا ہو جانے کے بعد جامعہ ملک کی ضرورتوں کا قریب قریب صحیح اندازہ کر سکے گی۔ دوسرا ناگزیر فریضہ جامعہ کا یہ ہوگا کہ ان مدارس میں جو تعلیم دی جائے گی اس کی نوعیت نصاب اور مدت کا تعین اس لحاظ سے

کرے کہ ملک کی ضرورتوں کے مطابق مختلف پیشوں اور کاموں کے لئے آدمی تربیت پا جائیں۔

میں نے ان مدارس میں سوچ سمجھ کر طبی، انجینیری اور قانون کے مدارس کو شامل کیا ہے کیونکہ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان پیشوں کی تعلیم کو طلبہ کی بہت آگے کی منزل سے متعلق کیا گیا ہے اور اس سے یہ قباحت پیدا ہو گئی ہے کہ ان پیشوں کی تربیت اور تعلیم کا صرفہ بہت زیادہ ہو گیا ہے اور اس اخراجات کی زیادتی کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہمارے ہاں جو ڈاکٹر، انجینیر، وکیل اور زراعت داں ہیں وہ اپنی تعلیم کی مناسبت سے بہت اونچے معاوضہ کے متوقع ہیں خواہ وہ سرکاری ملازمت میں آنا چاہیں خواہ پبلک طور پر اپنا پیشہ کریں اور اتنا زیادہ معاوضہ ہمارا ملک دے نہیں سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ بے ضرورت حد تک ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بڑھا دی گئی جن کو ان کی طویل اور قیمتی تعلیم کی مناسبت سے گزارے کے قابل معاوضہ نہیں مل سکتا اور لطف یہ ہے کہ موجودہ نظام تعلیمی نے ان ضروری پیشوں میں جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے ایسے کافی تربیت یافتہ لوگ پیدا نہیں کئے جن کے تعلیمی مصارف کم ہوتے اور جو واجبی معاوضہ پر ملک کی خدمت کر سکتے۔ ایک واقعی مثال ڈاکٹروں کی لیجئے۔ ہندوستان کو ڈاکٹروں اور صحت افسروں کی بڑی تعداد کی ضرورت ہے جو ملک کے دور دراز حصوں تک میں پہونچ جائیں۔ اب ہوتا کیا ہے کہ ہمارے طبی طلبہ ایک سخت نصاب کی تعلیم اٹھارہ برس حاصل کرنے کے بعد کہیں مطب کرنے کے اہل سمجھے جاتے ہیں اور یہ مدت بھی یہ فرض کر کے رکھی گئی ہے کہ طالب علم مختلف سالانہ امتحانات میں سے مسلسل کامیابی کے ساتھ نکلتے جائیں۔ کیا اس طرح کا انتظام ممکن نہیں کہ حسب ضرورت تعداد ایسے ڈاکٹروں کی جو معمولی دکھ بیماریوں میں دکھ سے نجات دے سکیں ایک ایسے نصاب کے تحت تیار کی جائے جس میں بجائے کم سے کم اٹھارہ

سال کے زیادہ سے زیادہ چودہ سال کی تعلیم کافی ہو۔ چودہ سال بھی اس طرح کہ سات سال ابتدائی ناگزیر اور سات سال بعد کے پیشہ وری کے نصاب میں صرف ہوں۔ آپ ناواقف نہیں کہ سرکاری سررشتہ طبیہ میں تین طرح کے ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ سب اسسٹنٹ اسسٹنٹ اور سول سرجن۔ میں نے یہ بات پائی — کم سے کم حیدرآباد دکن میں۔ کہ جن لوگوں نے ایسی طبی تعلیم پائی ہے جس کی مدت میں نے ابھی اٹھارہ سال بتائی ہے۔ یعنے جنھوں نے جامعہ کی طبی سند حاصل کی ہے یہ لوگ اسسٹنٹ سرجن ہوتے ہیں اور ان کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے اور ایسے طلبہ کی تعداد جو سب اسسٹنٹ سرجن کی سند کی کوشش کریں اس تعداد سے کہیں کم ہے جس کی واقعی مانگ ہے۔ انجینیری میں بھی یہی حال ہے۔ اس فن کی جامعہ کی سندیں جن لوگوں نے حاصل کی ہیں وہ گویا انجینیری کی اعلےٰ شاخوں کے لئے تیار ہوئے ہیں۔ وہ ایسی سرکاری ملازمت یا خانگی کام کے لئے شوق سے آمادہ ہیں جس کے لئے زیادہ مختصر اور کم خرچ تربیت جیسی کہ سوپروائی زروں اور اوورسیروں کو دیجاتی ہے کافی ہوتی

میں اب جس مشورہ کے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ جامعہ اس بات کی تحقیق کرے کہ کتنے آدمی اور کن اصولوں کے تحت کس قسم کی تعلیم سے بہرہ ور ہوکر ملک کے ان ضروری شعبوں میں خدمتوں کو سرانجام دے سکیں گے۔ جامعہ کو اس بات کا بھی خیال کرنا ہوگا کہ جتنی تعداد کو تعلیم دینی ہے اسی حد تک ان کی تعلیم کا معقول اور کافی دوائی انتظام کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو لوگ بیچ رہیں گے وہ خواہ مخواہ ان مدرسوں میں ہجوم نہیں کریں گے اور اپنا روپیہ بے سود صرف نہ کرنے پائیں گے۔ وہ لوگ ناگزیر تعلیم سے استفادہ کرکے تعلیمی میدان میں آگے نہیں بڑھینگے بلکہ اپنے اپنے پیشوں میں لگ جائیں گے اور سوسائٹی کے دولت پیدا کرنے والے کماؤ افراد بن جائیں گے

جامعہ کو یہ بھی یاد رکھنا پڑے گا کہ جو لوگ پیشہ وری کے مدرسوں میں تعلیم پائیں وہ تعلیم سے فراغت پاکر جو نکلیں تو ان کے لئے ایسے کام موجود ہوں جن سے وہ اپنی حسب لیاقت روپیہ کما سکیں اور ایسا نہ ہو کہ ان سے اوپر والی منزل کے لوگ اپنی تعداد کی زیادتی کے باعث اُن بیچاروں کے میدان میں آن کودیں اور ان کو کہیں کا نہ رکھیں۔ میں پھر اس کو دہرانا چاہتا ہوں کہ پہلے پہل تو اس طرح جو اعداد فراہم ہونگے وہ صحت سے بہت دور ہوں گے اور اس غیر صحیح تعداد کے لئے جو انتظام کیا جائیگا وہ ان معنوں میں ناقص ہوگا کہ صحیح تعداد وہاں سے تعلیم پاکر نہ نکل سکے گی۔ لیکن رفتہ رفتہ جامعہ کو صحیح تعداد کا اندازہ ہوتا جائے گا اور ساتھ ہی اس کو صحیح تعلیمی معیار کا بھی پتہ چل جائے گا۔ یہ سب باتیں اسی وقت ظہور میں آسکیں گی کہ پہلے اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ ان اُمور کو بھی لازمی طور پر مادر علمی کے احاطۂ اقتدار میں آجانا چاہئے میں یہ پوچھتا ہوں کہ ایسا کیوں نہ ہو؟ کیا اب جامعات اس پر روز بروز مجبور نہیں ہیں کہ اپنے فارغ التحصیل لوگوں کے لئے فراہمی ملازمت کے بورو (دفتر) قائم کریں میں نے جو کچھ کہا وہ اسی مسئلہ کے حل کے متعلق ایک مشورہ ہے۔

(۳) جامعی منزل اب میں تیسری اور سب سے اونچی تعلیم جامعہ کی تعلیم کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جب طلبہ فوقانیہ مدرسوں سے فراغت پائیں گے تو ان کو جامعہ اپنے زیر عاطفت لے لیگی۔ اُن طلبہ کو کوڑے کرکٹ کی طرح علیحدہ کر دے گی جن کی حالت ناکافی یا ناپسندیدہ ثابت ہوئی ہو۔ اس کے معنے دوسرے لفظوں میں یہ ہوں گے کہ جامعہ طلبہ کی ایک محدود اور منتخب تعداد کی درس تدریس راست اپنے ذمہ لیگی۔ اس تعداد کو خود طلبہ کی قابلیت اور جامعہ کے نصاب کو پورا کرنے کا رجحان اور ملک کی ضرورتوں کے لحاظ سے جتنی تعداد ہونی چاہئے۔ یہ امور جامعہ کے طلبہ کی تعداد کو محدود کر دیں گے

میں جن باتوں کو جامعہ کی ادنیٰ سرگرمیوں سے موسوم کرتا ہوں وہ کم ہو جائیں گی اور ان کی پیچیدگیوں سے جامعہ کو نجات مل جائے گی اور جامعہ کو موقع ملے گا کہ اپنی اعلیٰ سرگرمیوں میں آزادی کے ساتھ منہمک ہو جائے۔ یہ اعلیٰ سرگرمیاں میری رائے میں یہ ہیں تحقیق (ری سرچ) اور خصوصی مہارت۔ اس کے علاوہ متمدن ممالک میں بعض اوقات تعلیمی اور تعلیم سے گتھے ہوئے چند مسائل بعض سیاسی مسائل کی شکل نازک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جامعہ کا یہ بھی فرض ہوگا کہ ایسے مسائل کی دریافت کرے اور غور و فکر کے بعد ان کا حل پیش کرے۔ جامعہ اس بارے میں بہترین کام کر سکتی ہے اس لئے کہ جامعہ کی فضا میں سکون اور وہاں کا فیصلہ بے لاگ ہوگا اور ان لوگوں کا فیصلہ ہوگا جو صاحب علم و فضل ہوں گے۔ ایسی فضا میں جہاں نسلی تلی (کم یونل) و فسر شاہی (بوروکراٹک) یا سیاسی زہر و ڈرا ہوا ہو ان مسائل کا حل کبھی بہترین طور پر نہیں ہو سکتا۔

میں نے جامعہ کے ایک تدریسی فرض کو ایک گنی گنائی تعداد کے لئے محدود کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ لیکن اس محدود تعداد میں میں نے ان لوگوں کو بھی شامل رکھا ہے جو سرکاری خدمتوں اور اعلیٰ پیشوں میں خالی جگہوں کو پُر کریں گے۔ اعلیٰ پیشوں کی جگہوں کے لئے جامعہ کے مختلف شعبے اب بھی فارغ التحصیل آدمی تیار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ ایک اور قسم کے طلبہ بھی میں نے جامعہ کی محدود تعداد میں داخل کئے ہیں۔ وہ وہ طلبہ ہیں جن پر جامعہ کی ساری قوتیں صرف ہوں گی یعنے وہ علم کے رسیا جو علم کو خالص علم کی غرض سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر جامعہ کو علم و فضل اور تحقیق کا دوامی گھر اور بے لاگ رائے کا مرکز بننا مقصود ہے تو اس قسم کے طالب علم جامعہ کی بقا کے لئے ضروری ہیں۔ کیونکہ ایسے ہی طلبہ جامعہ کی زندگی کی جان ہوتے ہیں اور یہی اس کی اعلیٰ سرگرمیوں کی آگ کو روشن رکھتے ہیں۔

[illegible] سرگرمیوں کو [illegible] پہونچا کر ان کا تسلسل قائم کرتے اور ان کو چار چاند لگاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ علم کی اس روشنی کے رکھوالے ہوتے ہیں جس کو زرتشت نے اپنی پرستش کے چبوترے اور گلی [illegible] نے اپنے رسدی گنبد میں جانا پہچانا تھا" اور جس روشنی کو اب بھی اس تاریکی کو اجالا جانا ہے جو ہمیں چوطرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

جس اسکیم کا سایہ کی [illegible] اخاکا میں نے ابھی پیش کیا ہے جس سے ابتدائی یا جیسا کہ میں نے اس لفظ کو ترجیح دی ہے ناگزیر تعلیم کی تکمیل ہوگی اور جس میں سے گزرنے کے بعد طلبہ کی بیشتر تعداد مدرسہ کو چھوڑ کر کھیت، دکان یا کارخانہ میں کام پر جانے لگے گی اور یہی لوگ بہ لحاظ کثرت قوم کے لشکر کے سپاہی ہوتے ہیں ـــــ اس اسکیم سے میرا منشا ہے کہ ان نوجوانوں کے تعلیمی اخراجات کی کفایت ہو جائے گی جو کسی نہ کسی طرح مدرسوں میں سے گزر کر سرکاری ملازمت کی تلاش میں سرگرداں اس افسوسناک بھیڑ کو بڑھاتے ہیں جس کو تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی فوج کہا جا سکتا ہے۔ ان میں ان بدنصیبوں کا شمار نہیں ہے جو تحصیلی سند (ڈگری) کے لینے یا میٹرک یا اس سے بھی ابتدائی تعلیمی مرحلوں ہی میں ناکامیاب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ سب نہ صرف پبلک بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم خانگی اخراجات کے نقطہ نظر سے روپیہ پیسہ، وقت اور قوت کے کورے قومی خسارے کے جیتے جاگتے اعداد ہوتے ہیں۔ اور یہ سب روپیہ پیسہ بعض ایسی صورتوں میں بھی صرف کیا جاتا ہے کہ والدین دراصل اتنے اخراجات کی سکت نہیں رکھتے۔ اس امر واقعی کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ قوم کے اکثر و بیشتر نوجوان ناگزیر تعلیم کو ختم کر کے سرکاری ملازمت اور دیگر پیشوں کی جانب رخ کرنے سے باز رہیں گے جن کی طرف آج کل لوگ اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں جیسا کہ لوگ اس مشہور سونے ـــــ مگر افسوس ہے کہ محض قصہ کہانی کے درخت پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ غرض ناگزیر تعلیم سے فارغ ہو کر یہ نوجوان فطری طور پر زراعت

صنعتوں اور حرفوں، کارخانوں اور تجارت میں لگ چکی ہے۔ یہ کوشش ان راستوں پر اس اپنی ساری ذہانت اور قوت کو صرف کرنے لگیں گے جو بحالات موجودہ ایک محض خیالی، اقتصادی اور سماجی ڈھکوسلہ کے پیچھے ضائع ہو جاتی ہے۔

میری التجا ہے کہ میری ان باتوں سے متعلق اپنے دل میں کسی غلط فہمی کو پیدا نہ ہونے دیجئے۔ میری تجویز رجعت قہقری کی نہیں ہے۔ اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ تعلیم میں روڑے اٹکائے جائیں اور اسے پھیلنے سے روکا جائے۔ میرا منشا اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آبادی کے بڑے حصہ میں معیار تعلیمی یکساں ہو جائے لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ موجودہ اعلیٰ ثانوی اور کالج کی منزلوں میں سینکڑوں ناکامیابیوں سے جو مصیبت اور پریشانی پھیلتی ہے وہ باقی نہ رہے۔ میری آرزو یہ ہے کہ اس طرح جو ذرائع تعلیمی بچ جائیں ان سے سب سے پہلے تو عامۃ الناس کی ناگزیر تعلیم کی اصلاح اور بعد میں پیشہ وری اور حرفتی تعلیم و تربیت کے انتظام میں کام لیا جائے تاکہ ملک کی ضرورتوں کے مطابق تعداد کی تعلیم فوقانی مدارس میں ہو سکے اور سب سے آخر میں جامعہ کی منزل میں بہترین ساز و سامان چند منتخب دماغوں کے لئے جو اپنی موزونیت کا ثبوت دے چکے ہوں فراہم کیا جائے

یہ امور محض مشورہ کے طور پر ہیں اور جن کو میں نے بہت کچھ ہچکچاتے ہوئے نہایت خاکساری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ منشا یہ ہے کہ اس پیچیدہ اور اٹل تعلیمی مسئلہ پر بحث مباحثہ کی تشویق اور چھیڑ چھاڑ ہو۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ ہمارے موجودہ نظام تعلیمی پر بہ لحاظ اپنے منصوبوں اور بہ لحاظ تفصیلی نظم و نسق دونوں پہلوؤں سے جیسا کہ بے کن نے کہا ہے قبیلہ کے بت سوار ہیں۔ اور یہ وہی بت ہیں جن کی حکمرانی انگلستانی تاریخ کے مختلف تعلیمی اور سیاسی زمانوں میں رہی ہے۔ ہوا یہ ہے کہ گزشتہ صدی میں جو ماہرین فن تعلیم ہندوستان آتے تھے

وہ انہیں باتوں کو اصول اور مسلمات کی حیثیت سے ساتھ لاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان خاص خیالات کی ہمارے موجودہ نظام تعلیمی میں پرورش اور نگہداشت ہوتی رہی یہاں تک کہ بہت سے امور اور خیالات پتھر کی لکیروں کی طرح راسخ ہوگئے۔ ان باتوں کے سبب سے ہمارے جدید جامعہ کی اصلاح کے بحث مباحثے متاثر ہوتے رہے اور بعض موجودہ نظام کی داخلی خرابیوں کو محسوس کرنے اور ان سے نجات پانے سے باز رکھتے ہیں شدید ضرورت ہے کہ ایک وسیع النظر نقطے سے بال کی کھال کھینچنے والی تحقیقات اس مسئلہ کے متعلق کی جائے اور اس تحقیقات پر مروجہ خیالات کی بیڑیاں نہ ڈالی جائیں۔ تعلیمی مسئلہ بے انتہا اہم ہے۔ ہر سال طرح طرح کی بہت سی کان فرنسیں قائم کی جاتی ہیں لیکن میں اس کو زیادہ ترجیح دوں گا کہ ایک ایک شاہی کمیشن تشکیل دی جائے جس کے ارکان بہ لحاظ قابلیت زور دار ہوں اور وہ ہندوستانی تعلیم کو ہر پہلو سے مطالعہ کرے۔ اس کمیشن کا میدان مطالعہ کسی ایک جامعہ یا کسی خاص سطح تک ہی محدود نہ رکھا جائے بلکہ کل ہندوستانی تعلیم کے میدان پر حاوی ہو۔ کلکتہ کمیشن کی طرح اس میں یورپی ممتاز ماہرین تعلیم کا عنصر ضروری ہوگا اور ساتھ ہی ہندوستان میں اس وقت جو لوگ طرح طرح کی رائے اور خیال کے حامی ہیں ان میں سے بھی ارکان کا انتخاب کیا جائے۔ اس طرح کے عنصروں سے جو کمیشن صورت پذیر ہوگی اس کی متفقہ سفارشات اس قابل ہونگی کہ ان کو لوگ عام طور پر تسلیم کرلیں۔ اگر اس کی تجاویز متفقہ نہ بھی ہوں تو بھی یہ بات کھل جائے گی کہ وہ امور کیا ہیں جن پر مستند ارباب اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ اس طرح اس کمیشن کی رپورٹ ہندوستان کے ارباب تعلیم اور حکمراں دونوں کے لئے ایک اصول رہبر کا کام دے گی۔ اور ہی کمیشن کے ارکان تحقیقات میں دوستانہ بھی داخل ہوں گے جن کی طرف میں نے توجہ دلائی ہے اور جن کے دوران میں آگاہی کو توجہ دلائی

ذریعہ تعلیم

اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ موجودہ طریق تعلیم میں وہ کونسی چیز ہے جو خرابی اور کمزوری کی جڑ ہے تو میں بلا تامل یہ کہوں گا کہ وہ چیز یہ ہے کہ درس میں مادری زبان کو چھوڑ کر غیر زبان یعنی انگریزی زبان سے تفہیم کا کام لیا جاتا ہے۔ میں مادری زبان سے یہ مراد لیتا ہوں کہ وہ زبان جو لڑکے کی مادری زبان نہ ہو۔ اس کے سوا میں اور کسی خیال کو پرائی کے مفہوم میں شامل نہیں کرتا۔ پرائی زبان میں قدرت کا حاصل کرنا اس بات کو ہندوستان کے نوجوانوں کے سامنے نصب العین کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اور اسی کو تعلیم یافتہ ہونے کی علامت گردانا گیا ہے۔ پرائی زبان میں درس تدریس کے ہونے سے ذہنی قوت کی تضیع ہوتی ہے اور طلبہ کے نفوس پر دہرا بار پڑتا ہے۔ یہ بار لڑکوں کے نفس پر اس زمانہ میں پڑتا ہے جبکہ ان کا سن و سال اثرات کو آسانی سے قبول کرتا ہے۔ اس زمانہ سے نکلنے کے بعد پھر لڑکے اس آسانی اور شوق سے تعلیم نہیں پا سکتے۔ اس لئے اس چیز کو قبول کرنے کی بہار کا زمانہ نکل جاتا ہے اور عین اسی زمانہ میں ہمارا نظام تعلیمی طلبہ کے دماغ اور علم کے درمیان پرائی زبان کی دیوار کھڑی کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی پرائی زبان میں طلبہ کو ایک حد تک مہارت ہو بھی جائے تو اتنی مہارت اس بات کی ضامن نہیں ہو سکتی کہ اس زبان میں جن باتوں کی تفہیم کی جائے گی طلبہ ان خیالات کو صحیح صحیح سمجھ لیں گے سچ تو یہ ہے کہ پرائی زبان میں جن لوگوں تک خیالات پہونچائے جائیں وہ کبھی ان خیالات کو اسی طرح نہیں سمجھ سکتے جس طرح انہیں خیالات کو وہ اپنی زبان میں سمجھ لیتے۔ کم سے کم یہ مان لینا پڑتا ہے کہ پرائی زبان میں مادری زبان کی سی سہولت خیالات کے سمجھنے میں نہیں ہو سکتی اور اس واقعہ کی گواہ وہ سخت محنت ہے جو پرائی زبان کے حاصل کرنے میں اٹھانی پڑتی ہے اور یہ ایک ایسا امر واقعی ہے جو پرائی زبان کی وقعت کو بلا کسی استدلال

کے واضح کر... جب ایسے لوگوں کی بولی کو جن کے قومی رجحانات اور خصائص یا
ایک لفظ میں یوں کہیے جن کی جی۔ فی۔ اس ہماری جی فی اس سے اس قدر جدا گانہ ہے
ذریعہ تعلیم بنا... اسے تو معمولی طالب علم کے دماغ میں روڑے سے اٹکا دیے جاتے
ہیں... ہونہار لڑکے اسے ایک دلگی سی سمجھتے ہیں۔ وہیں لڑکا پرائی زبان پر
قابو پانے کی کوشش ناکام بھاؤ کے ساتھ کرتا ہے۔ اس طرح کی تعلیم کو نہ تو علم و فضل
سے سروکار ہوتا ہے اور نہ ہی اس کا تعلق ملک کی ضرورتوں سے ہوتا ہے۔ پرائی
زبان کو لڑکا اس طرح سیکھتا ہے جس طرح ایکٹر اپنے اپنے پارٹ یاد کرتے ہیں۔ لڑکا اپنی
قومی ذہنیت سے علیحدہ ہو کر ایک اجنبی ذہنیت اختیار کرتا ہے اور اس طرح اپنے
فطری جوہروں اور جی فی اس کو ماند کر دیتا ہے اور اس مضمون کی اہمیت کو جو پرائی
زبان کے ذریعہ سمجھایا جاتا ہے نسبتاً وہ وقعت نہیں دے سکتا جو دینی چاہیے۔
غرض کوئی طالب علم اپنی ذہنیت کی جیتی جاگتی فضا۔ اپنے خیالات اور حسیات کو پرائی
زبان میں ادا نہیں کر سکتا۔ اس ابتدائی اہم ترین زمانے میں لڑکے کی سوچ بچار پر ایک
ایسی زبان کا بوجھ لادنا جس پر اس کو قابو نہیں اور جس زبان میں پردیسی ذہنیت
رچی ہوئی ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ خیال اور ادائے خیال میں جو نازک مناسبت
ہے اس کا پیدا ہونا ناممکن ہو جائے۔ حالانکہ اسی مناسبت پر دماغی سوچ بچار کا انحصار
ہے۔ ایسے پرائے ذریعہ تعلیم کا قابل افسوس نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ خیالات اور ادائے خیالات
میں کٹہ پن اور بھونڈ پن پیدا ہو جائے۔

جامعہ عثمانیہ آپ حضرات نے یقیناً جامعہ عثمانیہ کی بابتہ کچھ نہ کچھ
بہ سبیل افواہ ہی ضرور سنا ہوگا۔ یہ ایک زبردست تجربہ
ہے جو حیدرآباد میں اعلیحضرت اقدس و اعلیٰ کی بیدار مغزانہ سرپرستی میں کیا گیا ہے
اس یونی ورسٹی میں انگریزی زبان کو ایک لازمی زبان ثانی کی حیثیت دی گئی ہے

اور یہی اس زبان کی ہندوستانی طلبہ کے لحاظ سے صحیح حیثیت ہے۔ ذریعہ تعلیمی میں ہو سکتی ہے۔ میں یہ کسی طرح نہیں چاہتا کہ آپ یہ خیال کریں کہ ہم نے انگریزی زبان کو جو حیثیت دی ہے اس کے یہ معنے ہیں کہ ہم حیدرآباد میں زبان انگریزی یا [illegible] تعلیم کے مخالف ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگوں نے بقیہ ہندوستان سے کچھ [illegible] پہلے اس بات کو محسوس کر لیا کہ انگریزی تعلیم کا جو احسان ہم پر ہے وہ اور اس کی اقدر و قیمت اس بات سے بے اندازہ زیادہ ہو جائے گی کہ اس علم کو جو زبان انگریزی سے ہم تک پہونچا ہے ہم اپنی ہی زبان میں حاصل کریں۔ یہ علم ہماری مستقبل کی قومی زندگی اور ترقی کی روح رواں ہے اور جب یہ ہماری زبان کے توسط سے آئے گا تو دقت اور ذہنی قوت کی تضیع نہ ہوگی اور خیالات کو اپنا بنانے میں ان کو توڑ مروڑ کر ناقص اور بھونڈا کرنا نہیں پڑے گا ــــ یہی وہ عیب ہیں جو پرائی زبان کے وسیلۂ تدریس ہونے کے تھا [illegible] طور پر وابستہ رہتے ہیں۔ یورپ طبعی سائنس کی دوڑ میں ہم سے اس قدر آگے نکل گیا ہے کہ ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ سائنس اور دیگر علوم میں ہمیں مدتوں یورپ کے آگے زانوئے ادب تہ کرنا پڑے گا۔ حیدرآباد میں ہم لوگ اس بات سے اس درجہ باخبر ہیں کہ ہم نے یہ نہیں کیا کہ پوربی علوم کے بندرگاہ سے اپنی علمی کشتی کا لنگر اٹھالیں بلکہ ہم نے ان علوم پر اپنی پوری توجہ مزید زور کے ساتھ گڑ دی ہے۔

اردو میں اُن کتابوں کا وجود ہی نہ تھا جو مختلف مضامین کی تدریس کیلئے ضروری ہیں۔ لیکن ہم اس بات سے مطلق خوف زدہ نہیں ہوئے۔ ہم نے ان کتابوں کو معرض وجود میں لانے کی کوشش فوراً شروع کر دی۔ ریاضیات، طبعیات، کیمیا، ارضیات، نباتیات، حیوانیات، حیاتیات، جغرافیہ، تاریخ، معاشیات، فلاسفی، ان سب مضامین میں بی۔ اے کے معیار تک کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں اور اب بہت سی کتابیں قانون، طب اور انجینئرنگ کے شعبوں کے لئے ترجمہ ہو رہی ہیں۔

اس غرض [illegible] طلبہ علم اور خیالات کی جدید ترین پیچیدگیوں سے روشناس
ہیں ہم [illegible] اس پر زور دیا ہے کہ ہمارے طلبہ کی انگریزی کا معیار وہی رہے جو ہندوستان
کی دیگر جامعات [illegible] ہے اور یہ شرط نہ صرف شعبہ فنون بلکہ ہر شعبہ ـــــ دینیات
ان جن [illegible] کے ہر طالب علم کے لئے لازمی گردانی گئی ہے۔ انگریزی ادب پر
اصرار کرنے سے ہمارا مقصد ہے کہ ہمارے طلبہ کو ایک اور فائدہ بھی ہو۔ وہ یہ کہ
ہر پیشہ کے مضامین کی تعلیم کے ساتھ ایک عام کلچر بھی وابستہ ہو جائے۔ ہماری جامعہ
کے امتحانوں میں اندرونی ممتحنوں کے ساتھ بیرونی ممتحن بھی ہمیشہ دوش بدوش دیکھے
جاتے ہیں اور ان بیرونی ممتحنوں نے ہمارے طلبہ کے سلجھے ہوئے بیان اور مضامین
کی گرفت کی تصدیق کی ہے۔ یہ تصدیق قابل غور ہے اور اس سے ہمارے اس
تجربہ پر گویا کامیابی کی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اس تجربہ میں
ہم نے جو راستہ اختیار کیا ہے صرف وہی ایک ایسا راستہ ہے جس سے ہماری
مادری زبان وسیع ترین علم عمیق ترین خیالات اور بلند ترین احساسات کے ادا کرنے
کا قابل قدر وسیلہ بن سکتی ہے اور اس طرح وہ نہایت زبردست ہتھیار گھڑا جا سکتا
ہے جس سے ہمارے عامۃ الناس۔ مردوں اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کا قلعہ سر
کیا جا سکے گا۔ جامعہ عثمانیہ جیسے کارنامہ کے غائر مشاہدہ کے بعد جس کا مجھے خوش نصیبی
سے موقع ملا آدمی محسوس کر سکتا ہے کہ ہندوستان اور ہندوستان کی دیسی زبانوں کو
مادری زبان کے علاوہ کسی اور زبان کے وسیلہ تدریس بنانے سے کتنا نقصان پہنچا
ہے۔ ہر قوم کی طبعی جی نی اس اور جوہر جداگانہ ہوتے ہیں اور ان کے لئے انہیں کی
مادری زبان اظہار خیال کا بہترین وسیلہ ہو سکتی ہے۔ پرائی زبان کے ذریعہ کوئی قوم
نوع انسان کے ادبی یا علمی خزانہ میں اضافہ نہیں کر سکتی۔ جو قوم اپنے خاص جوہر اور
جی نی اس کے مطابق جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کی ہے اس طرح اضافہ کرنے میں

ناکام رہے تو اس ناکامی سے اس قوم کی صلاحیت اور استعداد تک نوع انسان کو خسارہ اٹھانا پڑتا ہے کیونکہ ـــــ نوع انسان پر قرضہ آتا ہے پنوع انسان کی ابتدا سے اب تک اسی وجہ ہے کہ یہ تجربہ ـــ نہیں اب میں نے تجربہ نہیں ایک زبردست [illegible] جو اعلیحضرت اقدس واعلیٰ نے جامعہ عثمانیہ کی صورت میں پیش فرمایا ہے یہ کام اس قابل ہے کہ ہر ہندوستانی ماہر تعلیم اس سے ہمدردی اور اس کی تائید کرے

تجدیدی کام ہندوستان میں جامعات کا کام بیشتر تجدیدی ہونا ناگزیر ہے اور اسی حیثیت سے جامعات کا کام اصلی ہوگا اور اس کی قدر و قیمت پائدار ہوگی سب سے پہلے تو جامعوں کا یہ فریضہ ہے کہ ہندوستانی طلبہ کی ذہنی نظر کو صحیح اور تندرست بنایا جائے جب تک ہندوستانی جامعات میں وسیلہ تعلیم پرائی زبان رہے گی خیال اور ادائے خیال میں کامل مطابقت پیدا نہ ہوگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستانی طلبہ کی ذہنی نظر صحیح اور سچی نہ ہوسکے گی یہی وجہ ہے کہ میں نے زبان کے مسئلہ کو ہندوستانی جامعات کے تجدیدی کام کی غرض سے پہلے رکھا ہے۔

تاریخ ہماری تاریخ کے اصلی ماخذوں کا باقاعدہ تحقیقی کام ہاتھ میں لینا ضروری ہے ان ماخذوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور ان میں سے بعض کی صحیح تعبیر اور معنوں کا تعین صرف ہندوستانی ہی کرسکتے ہیں۔ انسانی علم کے لئے اس تحقیقی کام سے بہت سی نئی باتیں نکل آئیں گی اور موجودہ درسی کتابوں میں ہندوستانی تاریخ کے مختلف زمانوں اور ان کے امتیازات کے بارے میں جو باتیں پائی جاتی ہیں ان کی نظر ثانی کرنی پڑیگی تاریخی درسی کتابوں سے تاریخ ہند کے متعلق ہمارے طلبہ نفسی نقوش حاصل کرتے ہیں اور یہ نقوش اس لئے بہت گہرے ہوتے ہیں کہ یہ نفسی نمو کے ابتدائی زمانے میں دل و دماغ پر مرتسم ہوجاتے ہیں مثلاً یہ بات صحت کے ساتھ دریافت ہوتی ہے کہ بدھ مت کا جس زمانہ میں ہندوستان میں راج تھا دوسرے مذاہب کے ساتھ اس کے کیا

تفصیلات سے۔ بدھ مت کے عروج کے کیا اسباب تھے اور وہ کونسی قوتیں تھیں جو اس کے زوال کا باعث ہوئیں۔ کیا بدھ مت نے اپنی تاریخ کے کسی حصہ میں اور مذہب والوں کے ساتھ سیاسی [illegible] کا برتاؤ کیا جیسی کہ بعد میں خود اس کو سختیاں جھیلنی پڑیں۔ یہ بھی تحقیق طلب ہے کہ آیا [illegible] ویت کے منجملہ [illegible] فرقوں کے ایک فرقہ کی حیثیت رکھتا تھا جو پھیلتا گیا اور لوگوں نے اس [illegible] اضافہ رواداری برتی۔ اچھا اب بعد کے ایک تاریخی زمانہ کو لیجئے۔ اس میں یہ امر معلوم کرنا ہے کہ عربوں افغانیوں اور مغلوں کے حملے کہاں تک بدھ مت کے پیروکشانوں کے حملوں سے ملے جلتے ہیں؟ یہ حملے مذہبی جوش و خروش کا پھل تھے یا ان کی تہ میں محض معاشیاتی اسباب تھے جن پر بعد کے مورخوں نے یا خود حملہ آوروں نے ملک گیری کے جامہ کو ڈھانکنے کی غرض سے مذہبی رنگ چڑھا دیا۔ یہ بھی معلوم ہونا ہے کہ اورنگ زیب اور ٹیپو سلطان جیسے فرمانروا آیا محض تعصب میں ڈوبے ہوئے تھے یا یہ کہ سیاسی مقاصد ہی ان کے کاموں کے محرک تھے۔ یہ سوال ان تاریخی دستاویزوں کی بنا پر ہوتا ہے جو اب ہاتھ لگی ہیں اور شائع کی گئی ہیں۔ مثلاً ایک عالمگیری فرمان میں بنارس کے مسلمان صوبہ دار کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے صوبہ میں ہندو مندروں کے اوقاف کی احترام اور احتیاط کے ساتھ نگہداشت کرے اور اس بات کا خیال رکھے کہ ہندو رعایا پوری آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی رسوم ادا کرتی رہے۔ دوسری دستاویز میں ٹیپو سلطان کے احکام ہیں۔ ٹیپو سلطان کے والد کی بابت یہ مشہور بات ہے کہ انھوں نے اپنے ہندو آقاؤں کے ساتھ ہمیشہ احترام اور وفاداری کو ملحوظ رکھا۔ ٹیپو سلطان کے احکام یہ ہیں کہ برہمن پجاریوں کو دل کھول کر روپیہ دیا جائے اور ان سے استدعا کی جائے کہ وہ دشمنوں پر ٹیپو سلطان کی فتحیابی کے لئے دعا کریں۔ اب جو تاریخیں مروج ہیں ان میں جنوبی ہند نے تاریخ ہند کے دلچسپ فسانہ ہندی کلچر اور ہندو مسلم اتحاد میں جو اضافہ کیا ہے اس کا ذکر کا

طور پر نہیں ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ دکن کے ایک مشہور وزیر [illegible] نے ایک سنسکرت کالج قائم کیا تھا جس کے آثار اب بھی جنوبی ہند کی تعمیری یادگاروں میں ایک شاندار یادگار ہیں اور یہ کہ اسی محمود گاواں نے کامیابی کے ساتھ [illegible] کی تعلیم کا ایک نظام قائم کیا۔ ملک عنبر ایک سپاہی اور مدبر تھا نظام شاہی عہد میں اس نے مالگزاری میں جو جو اصلاحیں کیں ان سے بھی شاذ و نادر لوگ واقف ہیں حالانکہ ملک عنبر کے نام کی اسی طرح شہرت ہونی چاہئے جیسی کہ ٹوڈرمل کی ہے گنتی کے ہندوستانی ایسے ہیں جو وجیانگر بہمنی قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کی تاریخ سے واقف ہیں ان سلطنتوں نے ہندو اور مسلم عنصروں کو کیمیائی ترکیب دی اور اس شیرازہ بندی سے ایک خیالات سے مالا مال ادب شاندار عمارات خیر گستر سیاسی ڈھانچے اور روایات نظم و نسق پیدا کیا اور آج کل بھی ان چیزوں کے آثار دکن میں باقی ہیں

فنون لطیفہ

میں اس بارہ میں جو مثالیں پیش کرنے والا ہوں وہ بھی مغلیہ آصفیہ سے ہی لی گئی ہے اجنٹا کے غاروں کا مسئلہ بھی حل کا طالب ہے۔ غار ہائے اجنٹا قدیم فنون لطیفہ کا ایک قیمتی خزانہ ہیں اور دنیا کے دور دراز حصوں کے مصوروں کے لئے ایک تیرتھ گاہ ہیں۔ ان غاروں کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی کیا وجہ تھی کہ یہ عجیب و غریب اعلےٰ اور مکمل فن نقاشی ہماری تاریخ کے ایک خاص زمانے میں پیدا ہوا اور رائج رہا اور بعد ناپید سا ہو گیا آپ سر جان مارشل سے ناواقف نہیں ہیں۔ دولت آصفیہ کے ان انمول خزانوں کو زمانہ اور موسم کی دستبرد سے مامون رکھنے میں انھوں نے بہت بڑی مدد کی ہے آپ گپتان گلاڈسٹن کو بھی جانتے ہیں جو بمبئی اسکول آف آرٹ کے صدر تھے اور جنھوں نے پند و نصیحت اور عملی مثال سے اس بات کی کوشش کی ہے کہ نقاشی کی ہندوستانی طلبہ کو ترغیب دلائی جائے کہ وہ اپنے نقاشی کے اعلےٰ تخیلات کے لئے

جناب عبدالرحمٰن بجنوری اور نگار کا مدیر محترم۔ یہ دونوں حضرات میرے دوست ہیں اور ان دونوں نے بہ زبان ہو کر یقین دلایا ہے کہ نقاشی کے وہ عطیات خصوصاً خط و خال کی وافیری کا ملکہ ہندوستانی طلبہ میں پوشیدہ ہیں اور یہی وہ عطیے ہیں جن سے اجنٹا کی دیواری نقاشیاں ظہور میں آئی ہیں۔ ہندوستان میں یہ ہنر مت کے مفقود ہونے کے سبب سے (جو بھی ہے) یہ امر کہ ناکس قدر ضروری ہے کہ وہ کیا سماجی سیاسی اور تعلیمی حالات تھے جنھوں نے ان گراں بہا عطیات کے عملی اظہار کو یک لخت روک دیا۔ پھر مغلوں کے زمانہ میں وہ کیا اسباب تھے کہ یہی خداداد بلکہ نسلی تصویروں کی نقاشی میں جلوہ گر ہوا گو یہ صورت اجنٹا والی نقاشی کی طرح دلکش نہ تھی سب سے آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب کن حالات کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے جن سے ان عطیات کا پورا پورا اظہار ہو اور پھر فنون لطیفہ کی دنیا میں ہندوستان کو اپنا پرانا رتبہ حاصل ہو۔ مجھے روز بروز اس بات کا یقین واثق ہوتا جاتا ہے کہ جن قوتوں کے بل پر ہندوستان کی دولت کا سکہ مغربی دنیا کے دل پر بیٹھے گا اور قومی وقار کے ساتھ برطانوی شاہنشاہی میں ہندوستان کو وہ رتبہ ملے گا جس کا وہ مستحق ہے۔ ان قوتوں میں کی ایک زبردست قوت یہ بات بھی ہوگی کہ مغرب روز افزوں طور پر ہندوستانی فنون لطیفہ اور کلچر کی شاندار اور بزرگی کو تسلیم کرتا جائے۔ یہ ایسے مسائل ہیں کہ کوئی نقاشی کا مدرسہ انہیں حل نہیں کر سکتا اس وجہ سے کہ نقاشی کے مدرسہ کا بڑا کام یہ ہے کہ نقاشی کے عملی مسائل اور نقاشی کے نمونوں کی پیداوار کی نگہداشت کرے۔ یہ مسائل سوچنے والے دماغ یعنی ہمارے لئے ہیں۔ میں یہ نہیں چاہوں گا کہ جامعہ نقاشی کی تعلیم کے وہ فرائض بھی اپنے ذمہ لے لے جو اعلیٰ ماہرین فن کا ہی حصہ ہیں۔ لیکن مدرسہ نقاشی کو صدر کو جامعہ کی مجالس میں بہ لحاظ عہدہ جگہ ملنی چاہیئے تاکہ فن لطیفہ کا علمی پہلو

نظری پہلو سے یا اعلیٰ نصب العین سے جدا نہ ہونے پائے۔ جامعہ کا کام یہ ہوگا کہ فن لطیف کے اعلیٰ ترین مقاصد کو نظروں سے دور نہ ہونے دے، اور اس بات کا خیال رکھے کہ نقاشی کے مدرسے اعلیٰ فنی مطمح نظر سے گر کر محض اس کام کو رہ جائیں کہ نقشہ کشی (ڈرائینگ) کے معلموں کو ترتیب دیا کریں۔ مدرسوں کی نوبت کو نہ پہونچنے پائیں مدارس نقاشی کے اس طرح اپنے مرتبہ سے گرنے کا ابتدا نہیں ہوسکتا جب تک ہاویل پرسی براؤن گلاڈسٹون سالومن یا گنگولی جیسے ارباب فن ان کے صدر ہیں۔

مدارس نقاشی کی طرح میں یہ بھی نہیں چاہوں گا کہ جامعہ مدرسہ انجمنی یا مدرسہ زراعت کو راست اپنے ہاتھ میں لے لے لیکن میری یہ آرزو ضرور ہے کہ ان مختلف درسگاہوں کے قائم مقام جامعہ کی مجالس میں جگہ پائیں تاکہ تعلیمی میدان کا ہر عملی اور نظری گوشہ جامعہ جیسی فاضل۔ اور اپنے خاص دائرہ میں سب سے افضل ـــــ جماعت کی معمولی ذہنی نظر سے دور یا پوشیدہ نہ رہے۔

سائینس

سائینس کے بارہ میں مجھے زیادہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں علم کے اس رخ پر ہمیں ترقی اور تحقیق کی جتنی شدید ضرورت ہے اس کو سب لوگ اب تسلیم کرتے ہیں۔ ہندوستان نے سائینس کے میدان میں خصوصاً علاجیات اور نفسیات میں جن امور کا اضافہ کیا ہے اُن کی تحقیق ضروری ہے ساتھ ہی ان عملیات کیمیائی کو دوبارہ دریافت کرنا ہے جس کو اب بھلا دیا گیا ہے لیکن جن کے وجود کا پتہ ہندوستان کی قدیم صنعتوں اور فنون لطیفہ کے مطالعہ سے چلتا ہے۔ یہ سب امور ہندوستانی جامعات کے شعبہ سائینس کی سرگرمیوں کا نہایت مناسب اور سودمند میدان ثابت ہوں گے۔

سائینس کی تعلیم کے بارہ میں مجھے ایک تنبیہی آواز بھی کان میں ڈالنی ہے۔

وہ یہ ہے کہ سائنسی تحقیق کے لئے ایسے مدارس قائم کرنے کا رجحان بڑھتا جاتا ہے
جو [illegible] سے بے تعلق اور خود مختار رہے ہیں۔ میری رائے میں اس قسم کی بے تعلقی
جامعہ اور ان مدارس دونوں کے لئے ناپسندیدہ ہے۔ جامعہ سے جس حد تک تحقیق
اور اس کے [illegible] ضائع دور کر دئے جائیں گے اس حد تک جامعہ اپنے کام کے زیادہ
[illegible] رخ میں مزید ترقی کر جائے گی۔ دوسری طرف جامعہ کی علم پرور فضا سے
تحقیقی مدارس [illegible] ہو جائیں گے اور ان کا مطمح نظر تنگ اور ان کے مسائل حل طلب
اور کام کا میدان محدود ہو جائے گا۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر جامعہ ایگری کل
چرل انسٹی ٹیوٹ اسی پیمانہ پر جیسا کہ پوسا میں ہے یا کلکتہ کا سائنس کالج یا
ڈیفنس یا بنگلور والے انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کی سی علمی تحقیق گاہیں اپنے آپ سے
قائم کرے۔ میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس طرح کی سب تحقیق گاہیں
بجائے اس کے کہ اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ رکھیں کسی نہ کسی ہندوستان کی جامعہ
سے متعلق ہو جائیں اور ان میں ہندوستان کے ہر حصہ کے طلبہ شریک ہو سکیں اس سے
یہ ہوگا کہ مرور زمانہ کے بعد ہر ہندوستانی جامعہ کسی نہ کسی خاص فن کا مرکز بن جائے گی
اور اسی اپنی خاص علمی شاخ اور تحقیقی میدان میں شہرت حاصل کرلے گی۔

تخلیقی کام جن مسائل کی تحقیق کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے ان کا لازمی طور پر ہمارے ہاں کے معاشیاتی مسائل پر اثر ہوگا یہ معاشیاتی مسائل مالگزاری اور مالی اور آخر میں چل کر ہمارے سیاسی اور سماجی مسئلوں پر اثر ڈالیں گے اس طرح ہندوستانی جامعات کا کام جو اولاً بیشتر تجدیدی ہوگا یعنے جو کام کی باتیں ملک میں چلی تھیں لیکن اب تباہ یا ناپید ہو گئی ہیں اُن کو پھر زندہ کرنا۔ یہ تجدیدی کام ساتھ ہی ساتھ بہترین اور اعلےٰ ترین معنوں میں تخلیقی کام بھی ثابت ہوگا اس لئے کہ اس کی بنیاد تو جوش انگیز داستان ماضی اور اس کی منزل مقصود قابل ناز اور

قومی قوت کا مستقبل ہوگی۔ ہندوستان اب کسی عہد پارینہ کے خوابی کی طرح اس سفر
خواہ یہ تغیر بھلا ہو یا برا۔ تجربہ اور اقوام کے تصادم نے ہمیں بدل دیا ہے
انحصار بیشتر ہمیں پر ہے کہ اس بات کا تصفیہ کریں کہ یہ تغیر ہمارے وطن کے لئے آئندہ
چل کر بھلا ثابت ہو یا برا۔ ہم جس زمانہ میں زندگانی کر رہے ہیں اس کے نئے نئے مسائل
نئے نئے مسائل کا ہمارے سامنے آنا اور ہمارا ان مسائل کو حل کرنا ضرور

تعلیم نسوان

ان مسائل میں سے صرف ایک کو لیجئے۔ مسئلہ تعلیم نسواں
میرا یہ راسخ عقیدہ ہے کہ آج کل ہندوستان کی شدید ترین
ضرورت یہ ہے کہ خاتونوں کو تعلیم دی جائے۔ اگر تعلیم یافتہ ماں پڑھے لکھے
بچہ کے لئے ادھوری ماں ہوتی ہے۔ ہندوستان کی قوت پاک خیالی اور اخلاص
میں من حیث القوم نسوانی دنیا کے تعلیم یافتہ ہونے سے جو اضافہ ہوگا اس کا اندازہ
بھی ممکن نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم اندھے پن کے ساتھ نسوانی تعلیم میں یورپ کی
تقلید کریں یا ایک تعلیمی نظام ایسا معرض وجود میں لائیں جو ہماری روایات اور ہمارے
ملک کی ضرورتوں کے لحاظ سے زیادہ موزوں ہو۔ مجھے روز بروز اس بات کا
احساس ہوتا جاتا ہے کہ عموماً جو تعلیم ہندوستانی لڑکیوں کے مدرسہ میں دی جاتی
ہے وہ کچھ زیادہ موزوں نہیں ہے اس لئے کہ اس سے ہندوستانی نسوانیت
کے بہترین جوہر ابھرتے نہیں۔ موجودہ تعلیم میں ہندوستان کی گزشتہ بڑی نامور
خواتین کی زندگانی اور کارناموں، ہندوستانی مستورات کے روحانی لگاؤ جس
کے لئے اُن کی روح تڑپتی ہے۔ اور اُن ہندوستانی گھرانوں کی خاص معاشیات کا جن
کی وہ ایک دن ملکہ بنتی ہیں کچھ لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اس قسم کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
اس طرح کی جدید تعلیم یافتہ ہندوستانی ماں خصوصاً ایسی صورت میں کہ قومی
خاندانی روایات اس کی روک تھام نہ کریں جس گھر کی گھر والی بنتی ہے اس کو

آ[illegible] نتیجہ ادھا بیڑا سا بنا دیتی ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ گھر ظاہر اور باطن دونوں
[illegible] ہندوستانی ہے۔ [illegible] یورپی کلچر کی بہت سی باتوں کو سچ مچ جذب کر کے
اپنے آپ کو زیادہ قیمتی بنالے۔ یہ نہ ہو کہ یورپ کی باتوں کا ہلکا اور سطحی رنگ اپنے اوپر
چڑھا لے۔

ان اقتدارات کے ملتے ہی جو میں جامعہ کے تفویض کرنا چاہتا ہوں
جامعہ کو [illegible] برسوں کے اندر اندر [illegible] فوراً [illegible] دگرگوں ہو جانا پڑے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ
میں ان اقتدارات کے بغیر بھی اس بات کا آرزومند ہوں کہ جامعہ اس زبردست
معاملے میں پبلک رائے کی [illegible] بھی دانشمندانہ رہبری کرے۔ جس تعلیمی کمی شن کی
میں نے سفارش کی ہے اُس کو اپنے دیگر مضامین دریافت طلب میں۔ اس مسئلہ
کو بھی شامل کرنا ہوگا اور جس وقت اس بارے میں یہ کمی شن تحقیقات کرے گی تو اُس
وقت اپنے ارکان میں صاحب الرائے ہندوستانی خواتین کو بھی داخل کرنا پڑے گا
تاکہ کمی شن کی رائے اس خصوص میں بھی وقیع اور قابل تسلیم ہو جائے۔

جب جامعہ اپنے دائرہ اثر میں سوچنے والے دماغ کی حیثیت حاصل کرلے گی
تو پھر اس طرح کے نئے مسائل رد و قدح اور حل کے لئے اور نئے تخلیقی کام اس
کے سامنے آجائیں گے۔

ایکا ہندوستان کو جس چیز کی مسئلہ طور پر نہایت شدید ضرورت اور جس کے
پیدا کرنے کی جامعہ خاص صلاحیت رکھتی ہے — وہ چیز ایکا ہے۔ ایسے لوگ موجود
ہیں جن کا خیال ہے کہ آج کل اتحاد کے پہلو سے ہماری حالت پہلے سے بدتر ہے
مجھ کو اس خصوص میں جو پہلو ہے وہ اس قدر مایوس کرنے والا نہیں ہے میرا خیال
ہے کہ ہم اپنی ساری تاریخ کے دوران میں کبھی ایکے کے اتنے قریب نہیں تھے
جتنے کہ آج کل ہیں۔ اس صورت حال کے لئے اور چیزوں کے علاوہ جیسا کہ

بہت سے ارباب رائے کا خیال ہے ہم بیشتر اسی چیز کے ریہن منت ہیں جس
میں نے موجودہ تعلیمی نظام کا ایک زبردست نقص بتلایا ہے۔ یعنی
ہندوستان کے لئے ایک پرائی زبان کا وسیلہ تعلیم قرار دیا جانا۔ اگر مجھے اس
کا گمان بھی ہوتا کہ دیسی زبانوں کو اس حیثیت کے دینے سے جس کی وہ مستحق ہیں
ہم نے اب تک ایکے کی طرف جو پیشقدمی کی ہے وہ سب ہاتھ سے جا
تو میں اپنی تو یہ کہتا ہوں کہ دیسی زبانوں کو وسیلہ تعلیم کردانے کے مسئلہ کو پیش
اور اس کی تائید کرنے میں مجھے ہچکچاہٹ ہوتی۔ اب جتنا کچھ ایکا موجود ہے
اس کے بھی نہ ہونے کی صورت میں جو کچھ میں نے بامعہ کے متعلق خیالات
ظاہر کئے ہیں وہ محض ایک خواب پریشاں اور ہندوستان کا آئندہ ایک
زبردست قوم بننا ایک خالی خولی ڈھکوسلہ رہ جاتا ہے۔ لیکن میں اس بات کو
نہیں مانتا کہ ہماری دیسی زبانوں کو وسیلہ تعلیم بنانے سے ہم بحیثیت تعلیم
رجعت قہقری کریں گے۔ اب ہم اپنی تاریخ کے تلخ سبق حاصل کر چکے ہیں۔
اس میں شک نہیں کہ اس وقت ہم میں پھوٹ کے آثار نمایاں ہیں جن سے
ہمارے وطن کی ترقی کے خواہ اور ہندوستان کے شاندار مستقبل پر اعتماد
رکھنے والے دوستوں کو بھی بے چینی اور تشویش ہوتی ہے۔ لوگ موجودہ افسوسناک
فسادوں کے اسباب مختلف بیان کرتے ہیں لیکن اصلی سبب جو سارے فساد
کی جڑ ہے وہ محض جہالت ہے۔ جہالت کے برخلاف علم ایکا پیدا کرتا ہے۔
یہی وجہ تھی کہ رسول عربی (صلعم) نے نوع انسان کو جو پیغام دیا وہ ایکے کا پیغام
تھا اور اس برگزیدہ ہستی نے علم کی ضرورت پر اس قدر زور دیا
یُوزَنُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مِدَادُ الْعُلَمَاءِ بِدَمِ الشُّھَدَاءِ
قیامت کے دن علماء کی روشنائی شہداء کے خون سے تولی جائے گی۔

مخلوق کی کائنات کا ایک ساعت کا مطالعہ سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔"

ہماری جامعوں میں ہندو اور مسلمان، سکھ اور پارسی، عیسائی اور یہودی ایک ہی جگہ اکٹھے ہوتے ہیں اور وہ اس جگہ حق کے طالب بن کر اور جاہلوں کی تنگ خیالی کو چھوڑ کر آتے ہیں۔ یہ لوگ خلوص اور صداقت کے ساتھ اور اس نیت سے کہ روح انسان کی بھلائی ہو حق کے جویا ہوتے ہیں اور یہی حق کی طلب ان کو۔ حالانکہ وہ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اس ذات باری کے قریب لیجاتی ہے جو ساری کائنات کا مالک لاشریک اور نفس انسانی کا رحیم و کریم خالق اور علم اور روشنی کا اصلی منبع ہے۔

جامعہ کی علمی اور ذہنی دنیا قومی ایکے کی زیادہ ضامن ہو سکتی ہے بمقابلہ ایسی جگہوں کے جہاں فرقہ بندی کی عضو بند صورت میں تفرقہ دوامی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور جہاں آزادانہ رائے کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ جامعہ کی حیثیت کو اس قدر بلند کرنا ضروری ہے کہ اس کی عقل و دانش کی آواز فرقہ پروری کی غل پکار کے باوجود لوگوں تک پہونچ سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ قوم دانشمند ہے جو دانشمندی کا بول بالا کرے۔

میری اپیل آپ سے یہی ہے کہ اس طرح کا دلوں کا اتحاد قائم کیا جائے جس کی بنیاد یہ ہو کہ مختلف خطوں اور نسلوں نے اس ہمارے وطن کو جن کلچر کی چیزوں سے مالا مال کیا ہے ان کی قدر و قیمت سمجھیں۔ اے سرخ و سپید پنج آپ کی اس جامعہ کے ارکان اور فارغ التحصیل حضرات میری اپیل خصوصیت کی ساتھ آپ سے اس لئے ہے کہ پہلے آپ ہی کے خطہ میں سے ہو کر مختلف تمدن اور نسلیں ہندوستان میں پھیلی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اپنی جامعہ میں علم و فضل کی تحصیل کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں اور اپنی جامعہ کو ایسا مرکز بنا دیں

جہاں سے لوگ آپس کی محبت، ایک دوسرے کی عزت اور باہمی ہمدردی کے سبق سیکھ کر نکلیں جن پر وہ اپنی جماعت کی بعد کی زندگی میں سیاسی نظم و نسق اور کاروباری میدانوں میں کاربند ہوں تو وہ مقدس ندی "سرسوتی" اپنی ریت دبی سطح سے پھر نکل پڑے گی اور اس ہماری جنم بھومی کو پھر ان پانچ ندیوں سے کہیں زیادہ سیراب کر دے گی جو محض روزانہ کھانے پینے کے لئے افراط سے غلہ فراہم کرتی ہیں۔ اس لئے سرسوتی سے ہمارے دل اور ہمارے روحیں مالا مال ہوں گی۔

ہندوستان ایک اچھی خاصی اقلیم ہے جہاں طرح طرح کی آب و ہوا نسلیں رسم و مذاہب عادات و اطوار پائے جاتے ہیں۔ اس ہندوستان۔ اس بڑے جزیرہ نما کے روحانی اور قومی ایکے کا خیال ایک چھپی ہوئی ندی کی طرح چپ چاپ بہتا چلا آیا ہے کیونکہ اس ملک کے لوگوں کے لئے یہ ایکے کا فطری خیال ہمیشہ ایک مقدس قصہ اور ایک خواب رہا ہے جو اب تک سورج کی روشنی میں صورت پذیر نہیں ہوا جس کو اب تک ایک واقعہ کی شکل میں کسی آنکھ نے نہیں دیکھا۔

باوجود اس کے بھی کون اس قدر جری ـــــ نہیں صاف صاف کیوں نہ کہوں ـــــ کون اس قدر بزدل ہے جو فریضہ وطن پرستی سے جی چرا کر یہ بات کہے کہ یہ ایکا ـــــ یہ ہندوستانی اتحاد کبھی صورت پذیر نہ ہوگا اور کوئی آنکھ اس دن کو نہ دیکھے گی جب کہ یہ ایکا ایک امر واقعی ہو جائے؟

ایکا ایک ایسا خیال ہے جو انسانوں کے دلوں میں ہمیشہ جاگزیں رہا ہے یہ ایک چاہیتا اور لاڈلا نصب العین ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ایکے کا خیال ایک ایسا نصب العین ہے جس کو ہزارہا انسان اپنے دلوں میں جگہ دئے ہوئے ہیں یہ ایک ایسا زوردار خیال ہے کہ اس کی ایک ہلکی سی واقعی جھلک سارے ملک کو ایک جھنڈے تلے اکٹھا کرنے اور ابھارنے کو کافی ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ

نی ایکے ۔ ایسے ایکے کی جس میں نفرت چھوت چھات اور ذات پات نام
نہ ہو جس کی بنیاد اُن سبھوں کا میل جول ہو جو ہماری مادر وطن کی خدمت کر رہے ہیں۔
وہ کالے بھورے یا گورے ہوں۔ لیچھ پاریا یا ملوناشر اماہوں، وشر شاہی پالی ٹی شین یا
کسان ہوں ۔۔۔ ایسے ایکے کی ایک جھلک، ایک نظارہ کس طرح اُن آنکھوں کو دکھایا
جائے جو اُس کے دیکھنے کو ترس رہی ہیں؛ کس طرح ایسے ایکے کے دئے کی ایک کرن دکھلائی
جائے جو رفتہ رفتہ سارے ملک کو روشن کر دے اور جس کو محبت اور صداقت کا تیل
برابر روشن رکھے۔ یہ روشنی اس طرح کی عارضی۔ غول بیابانی کی سی روشنی نہ ہو جو
جذبات جہالت اور نفرت کی زہریلی دلدلوں سے بھڑک اُٹھتی اور پھر غائب ہو جاتی ہے
میرا جواب یہ ہے۔ کہ وہ ارباب علم وفضل جو ہماری جامعوں میں اس وقت اکٹھے
ہیں۔ یہ ان لوگوں کا کام ہے کہ ایکے کا راستہ لوگوں کو دکھلائیں۔

میرے بھائیوں! جب ہم ہندوستان کو بہ حیثیت اپنی بھارت ماتا کے اور
اس کی آبادی کی بہبودی کو اپنا مقدس فریضہ تصور کرتے ہیں تو ہم سب میں اس قدر
جزو مشترک پایا جاتا ہے کہ ہمارے اختلافات اور ہمارے مقاصد خفیف بیہودہ
اور گرے ہوئے سے نظر آتے ہیں۔ یقین مانئے کہ جو چیزیں ہم میں مشترک ہیں وہ ہمارے
دیس کی بھلائی کی جان ہیں اور فی نفسہ اُن باتوں سے جن کی بابت ہم اختلاف کرتے
لڑتے جھگڑتے اور یہاں تک کہ ایک دوسرے کی جان بھی لے لیتے ہیں کہیں زیادہ
اہم ہیں۔

ہم سے ایک حقیقی سوراج کا وعدہ کیا گیا ہے بشرطیکہ ہم اس کے لئے تیار ہو جائیں
بعض لوگ اس وعدہ کو طعن آمیز خیال کرتے ہیں۔ ہم میں تفرقے اور جھگڑے۔
اندرونی مخالفتیں اور بدگمانیاں جوں کی توں ہیں اور اس درجہ ہیں کہ بیرون
ہندوستان جو لوگ ہمارے بہی خواہ ہیں ۔۔۔ نہیں خود ہندوستان کے عاشق پیشہ

بھی اس عقیدہ پر مجبور آآن ٹکتے ہیں کہ اگر ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دیا جائے تو ہم ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جائیں گے اور سوراج کے بدلے نراج ہو جائیگا کوئی حکومت ہی باقی نہ رہے گی۔ ہندوستان کا مدت سے نصب العین یکا رہا ہے آج کل ہندوستان کی نوزائیدگی نہیں۔ ہندوستان کی من حیث القوم بقا کے لئے ایکا ایک اٹل ضرورت ہے۔ اب قدرے۔ کسی قدر۔ جزئی نوزائیدگی ناممکن ہے۔ ہندوستان اس زمانہ میں ایک قوم کی حیثیت سے ہی باقی رہ سکتا ہے۔ اس ایکے کے بغیر سوراج ایک بے معنے سا لفظ رہے گا۔ نہیں بغیر ایکے کے اگر سوراج حاصل ہو بھی جائے تو ایسا سوراج ہمارے ملک کے لئے ایک لعنت، ایک تباہی ثابت ہوگا۔ ـــــ رحمت اور برکت نہ ہوگا۔ البتہ ایکے کے ہوتے ہی سوراج ایک جیتا جاگتا واقعہ بن جائے گا۔

میں ایک مسلم اور ساتھ ہی ایک ہندوستانی کی حیثیت سے جو اپنے کو ہندوستانی ہونے پر نازاں ہے ـــــ اور ایک ایسے صوبہ میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے آپ سے استدعا کرتا ہوں اس اندیشہ کو کہ ہم مسلمان سوراج کے بعد محض لکڑیاں کاٹنے اور پانی کھینچنے کے کام کے رہ جائیں گے اپنے دلوں سے نکال دیجئے اور ایسی دھمکیوں پر کہ ہم کو اسپین کے موروں کی طرح بوریئے بدھنے سمیت یہاں سے نکال دیا جائیگا قہقہہ لگائیے اور اپنی اکثریت کی قوت کی ترنگ میں بے خوف ہو کر آپ یہ دکھلا دیجئے کہ ایک اکثریت اپنی فیاضانہ بلند حوصلگی اور شرافت سے قلیل تعداد کے دلوں میں اعتماد اور محبت سے گھر کر سکتی ہے اور اس طرح محبت آمیز تعاون اور ہمکاری کی ایسی روایت اور مثال قائم کر سکتی ہے جس سے ملی (کمیونل) قلت اور اکثریت کے گلے پیلک سرگرمیوں کی فرہنگ سے حرف غلط کی طرح محو ہو جائیں۔ اے جامعہ پنجاب کے ارباب! اب آپ کا کام ہے کہ اس دلوں کے اتحاد ـــــ اس

اتحاد اخوت کے متعلق آپ اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنا وہ فریضہ جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے ـــــ دانشمندانہ فیاضانہ اور مردانہ طور پر ادا کیجئے۔ بغیر اس فریضہ کو انجام دئے ہم اپنے وطن کو اس عبرت انگیز حالت سے نجات نہیں دلا سکتے کہ خود اس کے جاں نثار پوت اس چیز کے حاصل ہونے سے ڈرتے ہیں جس کا بحیثیت ایک قوم کے ہمارا وطن طالب ہے۔ میرا مطلب سوراج سے ہے جو بغیر اس دلی اتحاد کے حاصل نہیں ہو سکتا جس پر میں نے ابھی بحث کی ہے۔

نوجوانوں! جو شیلے دلوں اور بیدار مغز انسانوں کے سامنے اس سے زیادہ اعلیٰ برتر اور نہایت بار آور کام نہیں ہو سکتا جو اس وقت آپ کے سامنے درپیش ہے اپنی قوم کو اللہ تعالےٰ کا نام لیکر اور اسی کی مدد سے سدھارنے کا بیڑا اٹھائیے اور آنے والی نسلیں نہ صرف اپنے وطن بلکہ ساری دنیا کی آپ کے نام پر درود اور رحمت بھیجیں گی۔

حضرات! اب میں قصہ کوتاہ کرتا ہوں۔ آپ لوگوں نے تحصیلی سندیں حاصل کی ہیں اور آج سے آپ زندگی کے رن میں قدم رکھیں گے۔ آپ میں سے ہر ایک کا مدار کار جدا جدا ہوگا اور آپ کے پاس وہی ذہنی ہتھیار ہوں گے جو اس جامعہ نے آپ کو دئے ہیں۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھئے کہ محض عقل آپ کو زندگی کے اکھاڑے میں بڑی جیت نہ دلوا سکے گی۔ اس کے لئے کیریکٹر بہترین ہتھیار ہے اور کیریکٹر کے معنے میں یہ سمجھتا ہوں ـــــ اعلےٰ ترین تخیلات کے لئے اپنے آپ کو ثابت قدمی سے وقف کر دینا۔ یہ اٹل نتیجہ کہ خیر کی جائے اور شر کو درست کیا جائے ہر ایک کے ساتھ کریمانہ شریفانہ اور مردانہ سلوک خواہ کوئی ہم سے برتر پست تو یا ہم مدمقابل ہو۔ ہر ایک کے متعلق یہ شریفانہ خیال کہ اس کی نیت خالص اور اپنی نیت کی طرح ارفع ہے تاکہ اس طرح رفاقت اور بھائی چارہ تلطف اور ذاتی وقار

کی روح پیدا ہو اور اُس کی دلکش کرنیں آپ سے نکلیں اور آپ کو ہر طرف سے گھیر لیں۔ جب نہایت معمولی کام بھی اس روح کی روشنی سے جگمگا اُٹھتا ہے تو اس کی انسانی قدر و قیمت بڑے سے بڑے کام سے کسی طرح ہیٹی نہیں ہوتی:۔

نہ کہیئے کہ ننھا سا ہے واقعہ
اسے آپ ننھا کہیں کس لئے؟
بڑا واقعہ آپ کہتے ہیں جس کو
تو کیا اُس کے ہونے گزرنے کے کارن
اُٹھانا پڑا دکھ کسی کو زیادہ؟
بُری یا کہ چھوٹی نظر میں خدا کی
سب اکساں ہے خدمت۔ اگرچہ سابق
ہے عرشِ علیٰ پہ حق جلوہ فرما
ہے اس ذات بیچوں کے انوار سے
زمیں اپنی لبریز۔ ہر شخص یاں
وہی کر رہا ہے جو ہے حق کی مرضی
یہاں کام کوئی نہ اعلےٰ نہ اَدنیٰ

(براؤننگ اپی پاپا سس والی نظم کا ایک گیت)

شریک بدر

*

مملکتِ آصفیہ
کی
امداد باہمی کی انجمنیں

"المعلم" بابتہ ماہ امرداد ۱۳۴۴ف (۱۹۳۴ء) مکتوبات فرنگ کو شائع کیا گیا تھا۔ اور اس وقت مولوی سید محمد مہدی صاحب کا مختصر طور پر تعارف بھی کرایا گیا تھا۔ صاحب موصوف ہماری ریاست ابد مدت کے ایک ہونہار عہدہ دار ہیں اور ہمیشہ اسی دھن میں رہتے ہیں کہ اپنے فرائض منصبی کے متعلق پوری واقفیت حاصل کی جائے اور اس واقفیت کو عملی جامہ پہنایا جائے جس سے ملک اور ابنائے ملک کی بہبودی میں مستقل اضافہ ہو

ہمارے قارئین کے لئے صاحب موصوف کا یہ مضمون بھی جو ذیل میں درج ہے اور جسے آپ نے حیدرآباد تعلیمی کانفرنس کے ایک اجلاس میں سنایا تھا ایک نہایت دلچسپ چیز ہے کیونکہ یہ پہلا موقع ہے کہ اس طرح اصطلاحات سے جدا ہو کر دولت آصفیہ کی امداد باہمی کی سرگرمیوں کو پبلک کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ امداد باہمی کی معاشیاتی جان ڈالنے والی تحریک کی کامیابی کا مدار اس پر ہے کہ اس کے مختلف پہلوؤں کو آنے والی پود کے ذہن نشین کرایا جائے ہمیں امید ہے کہ ہمارے معلمین جو ارباب علم و بینش ہیں اس بہبود عامہ کی تحریک کے فوائد اور اس کی ضرورت کو اپنے اپنے حلقہ اثر میں لوگوں کے دلوں پر نقش کرنے کی سعی فرمائیں گے۔ مولوی سید محمد مہدی

نے اپنے پہلے وعدہ کو بھلایا نہیں ہے۔ اپنی منصبی سرگرمیوں سے جب کبھی کافی مہلت آپ کو ملتی رہے گی آپ تحریک امداد باہمی پر مضامین تحریر فرماتے رہیں گے جو انشاء اللہ تعالیٰ العلم میں شائع ہوا کریں گے۔

شریک مدیر

جناب صدر و حاضرین محترم! فاضل معتمد صاحب کانفرنس کی دعوت اور سررشتہ امداد باہمی کی ہدایت پر آپ صاحبان علم کی خدمت میں ممالک محروسہ کی انجمن ہائے امداد باہمی کے نتائج اور میدان ترقی کے موضوع پر اس مختصر روئداد کا پیش کرنا میرا خوشگوار فریضہ ہے۔

تعلیم اور امداد باہمی کے اہم رشتہ قریبی کو سمجھنے اور محسوس کرنے میں پبلک کی جو بے توجہی دیکھنے میں آتی ہے اس کے نظر کرتے ہوئے ایک تعلیمی کانفرنس کے کام میں امداد باہمی کی اہمیت کے مدنظر اسکے نتیجہ عمل اور اس کی وسعت پذیری کے موضوع کو جگہ دینا عاملان کانفرنس کی روشن خیالی پر دال ہے اور بہی خواہان تحریک امداد باہمی کے لئے باعث تسکین و اطمینان

آپ صاحبان کی خدمت میں امداد باہمی کی روئداد بیان کرتے ہوئے صرف ممالک محروسہ کے پایہ عالی کی مختصر دہ سالہ سرگزشت سنانا میرا مقررہ کام ہے۔ ورنہ دنیا میں تحریک امداد باہمی کی صد سالہ ترقی کا بیان بھی کسی اور موقع پر کچھ کم دلچسپ نہ ہوگا۔

حضرات اس رپورٹ کو کسی سررشتہ کی رپورٹ تصور نہ فرمائیں بلکہ اپنے ملک کی یا اپنے گھر کی مالی اور معاشی ترقی کی ایک مختصر تاریخ خیال فرمائیں کہ اعداد و شمار میں دلچسپی پیدا ہو

حضرات! مثل اور ممالک کے ریاست حیدرآباد نے ممالک محروسہ میں اہل ملک کی معاشی فلاح و بہبود کیلئے قانونی مراعات کے ساتھ تحریک امداد باہمی کی بنیاد ڈالی کہ رعیت کا انفرادی تہی دست اور کمزور اعتبار جو قرضوں کے حاصل کرنے میں بے اثر یا منفرد

ہوتا ہے متحدہ قومی اور بااثر اعتبار سے بدل دیا جائے کہ ہر تنہا بہ تقدیر وہ ہراساں نصیب بے بضاعت رعیت جماعتی قوت سے اپنے معاشی امور کے انصرام میں اطمینان قلب اور اخلاق کی قوت کے ساتھ مشغول ہو۔

اس تحریک کی ترویج کے وقت سرکار کی نظر میں یہ امر بھی تھا کہ امداد باہمی کی انجمنوں میں اخلاق و عمل کی مضمر تعلیم بغیر کسی خاص تعلیمی اہتمام کے امداد باہمی کے شرکاء کو عملاً حاصل ہو۔ سرکار نے ایسے زمانہ میں اس تحریک کی ابتدا فرمائی جب کہ حکومت برطانیہ ہند میں دس سال کے تجربہ کے بعد امداد باہمی کے عملیات کو دیہی کاروبار سے متجاوز شہری معاشی زندگی میں بھی جاری کرنے کا تصفیہ کیا گیا تھا۔

حکومت برطانیہ ہند کے تجربوں سے فائدہ اٹھا کر ہماری سرکار نے امداد باہمی کی جدید تحریک کو ایسی قانونی وسعت کے ساتھ منظور فرمایا کہ جو شہر و دیہات کی آبادی کیلئے یکساں مقبول ہوا اور بالفاظ قانونی ہر ایسی انجمن کی جو بڑی محدود یا غیر محدود ذمہ داری کے ساتھ منظور کی جو امداد باہمی کے اصول کے مطابق ارکان انجمن کے اقتصادی اغراض میں ترقی کی غرض رکھتی ہو یا ایسی انجمن ہو کہ جس کا مقصد اغراض بالا کی تکمیل میں سہولت پیدا کرنا ہو

غرض ہر ایسی معاشی جد و جہد کی سرپرستی جو بہ مطابقت اصول امداد باہمی ہو بمراعات انتظامی و قانونی سرکار نے بطور خود اپنے ذمہ لی۔ ممالک محروسہ میں اس تحریک کا کام ۱۳۳۴ف سے آغاز ہوا۔ بہی خواہان ریاست نے [illegible] سے پہلے دیہاتی آبادی کو جو اس تحریک کی زیادہ محتاج ہے بہرہ ور کرنے کا انتظام فرمایا۔ سرکاری امداد اور رعایا کی اجتماعی نے انجمنوں کی وسعت اور مقبولیت میں ایسی جان ڈالدی کہ شرکائے امداد باہمی کی جماعت میں روز افزوں اضافہ نظر آنے لگا۔ سال اول ۱۳۳۴ف میں ایک مستقل ناظم امداد باہمی کی نگرانی میں (۴۵) انجمنیں قائم ہوئیں جن میں (۲۴) زرعی قرضہ کی انجمنیں تھیں اور ایک صدر بنک تھا جو دارالحکومت میں قائم کیا گیا۔ جملہ اراکین کی تعداد (۶۰۷) تھی اور سرمایہ زیر استعمال

ختم سال پر ایک لاکھ اڑسٹھ ہزار تھا۔ یہاں یہ ظاہر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ممالک محروسہ کی سب سے پہلی انجمن صدر بنک کے میر مجلس مسٹر حیدری منتخب ہوئے تھے جواب نواب حیدر نواز جنگ بہادر بانی و نگران امداد باہمی کے وزیر ہیں۔ صاحب معزی کی اعلیٰ انتظامی قابلیت اور شخصی اعتبار نے حیدرآباد کے اس پہلے بنک کی خاص طور پر اور تحریک امداد باہمی کی عام طور پر بے بہا مدد کی ہے جو اس تحریک کو ہمیشہ صاحب ممدوح کی مرہون منت رکھے گی۔

ابتدائی زمانہ میں جو انتظامی رد و بدل ہوتی ہے اُن کے مدنظر سال اول کے کام سے متعلق یہ اظہار ضروری ہے کہ شاید جان کینی صاحب ناظم زراعت وقت جن کے تفویض امداد باہمی کا کام کیا گیا تھا) کی پریشانی زیادہ تر اور کام کی ناواقفیت ایک وجہ تھی کہ سرکار کو ایک قابل فرد سے دیہار اگھواچاری مددگار ناظم انجمن ہائے امداد باہمی مدراس کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت داعی ہوئی۔ صاحب موصوف نے بجمل جانفشانی و دلسوزی مفوضہ خدمات کو انجام دیا اور بدنصیبی سے ۱۳۲۵ف میں ان کی وفات واقع ہوئی۔ اس نئے کام کا شیرازہ برہم ہونے لگا کہ سرکار نے پنجاب سے ایک نہایت دردمند دل رکھنے والے تجربہ کار ڈاکٹر عبدالمجید خاں صاحب کا اس کام کے لئے انتخاب فرمایا اور خاں صاحب موصوف نے ۱۳۲۵ف کے آخر میں خدمت نظامت کا جائزہ رائے شنکر پرشاد صاحب سے حاصل کیا جو دیہار اگھواچاری صاحب کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد عارضی طور پر نظامت امداد باہمی کے حامل بنائے گئے تھے ۱۳۲۵ف سے صوبہ پنجاب کے طریقہ عمل کی تقلید میں انجمنوں کی تشکیل ہونے لگی۔ اس سال کے ختم پر صدر بنک نے ایک لاکھ ۸۶ ہزار کا سرمایہ حاصل کرلیا جملہ انجمنوں کی تعداد (۵۴) ممبروں کی تعداد (۱۷۶۷) ان کا ذاتی سرمایہ (۴۱) ہزار اور سرمایہ زیر استعمال ساڑھے تین لاکھ ہوگیا۔ اسی زمانہ میں غیر زرعی انجمنوں کا قیام دیہی کاریگروں اور سرکاری ملازموں کے لئے عمل میں آنے لگا جن کی موجودہ وسعت آگے عرض کی جائے گی۔ سرکار نے سررشتہ امداد باہمی کی رہنمائی کیلئے ایک کمیٹی مشتمل بہ نواب عماد الملک بہادر

گلانسی صاحب وکٹ اچاری صاحب مقرر فرمائی تھی جو ۱۳۲۵ف سے ۱۳۲۷ف تک کام کرتی رہی اور اس کمیٹی کے قابل ہدایت سررشتہ کے کام میں بیحد مفید ثابت ہوئے۔

۱۳۲۶ف میں ایک جدید صدر بنک اورنگ آباد میں قائم کیا گیا اور اضلاع میں انجمنوں کی مقبولیت عام ہوتی گئی۔ گوان کے قیام میں مقامی مخالفتوں کی مشکلیں کم نہ تھیں۔

۱۳۲۶ف سے متعلق تحریک امداد باہمی کی ترقی کے اعداد حسب ذیل ہیں۔

دو صدر بنک اور دو سو (۲۹۳) انجمنیں (۶) ہزار (۲) سو (۵۵) ممبران ایک لاکھ ۶ ہزار ۵۰۰ سرمایہ ذاتی اور (۱۲) لاکھ سرمایہ زیر استعمال رہا۔

۱۳۲۷ف کے آغاز کے ساتھ تقسیم شدہ رقموں کی وصولی کا کام بھی شروع ہوا۔ یہ زمانہ حسن معاملت کی جانچ کا تھا اگرچہ جنگ کے باعث گرانی اور اکثر مقامات پر پلیگ کی کثرت اور کہیں بارش کی بے محل کثرت اور کہیں بارش کی قلت نے عام طور پر رعایا کو سراسیمہ کر دیا تھا ایسی حالت میں سررشتہ نے امداد باہمی کے کاموں کو وسعت دینا قرین صواب خیال کیا باوصف اس کشمکش کے (۵) جدید صدر بنک قائم ہوئے۔ اس سال صدر بنکوں کی تعداد (۷) اور ذیلی انجمنوں کی تعداد (۶۰۹) جملہ ممبروں کی تعداد (۱۵۱۹۳) ذاتی سرمایہ تین لاکھ ۳۳ ہزار ۵۰۰ اور جملہ سرمایہ زیر استعمال ۲۸ لاکھ ۵۸ ہزار رہا۔

امداد باہمی کی تحریک کو اس حد تک مقبولیت عام حاصل ہوئی کہ تعلقدار صاحبوں کی مدد سے اضلاع میں صدر بنکوں کے قائم کرنے میں حوصلہ افزا کامیابی ہوئی۔ سب سے پہلا صدر بنک حیدرآباد میں قائم کیا گیا تو پبلک کے اطمینان و اعتبار کے لئے اس کی ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ سرکار سے نفع زر حصص کے لئے چار فیصدی کی گیارنٹی حاصل کی جائے۔ مابعد کے تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ پبلک کو بنکوں کے کام سے ایسا کافی اطمینان اور اعتبار حاصل ہو گیا کہ بنکوں کا قیام اور اس کا انتظام ایسا مشکل نہیں رہا جیسا کہ ابتدائی تجربہ میں ثابت ہوا تھا۔ اس طرح ملک میں بنکوں کے قیام کا کامیابی سے راستہ کھل گیا

سنہ ۱۳۲۸ف کا سال تو تمام عالم کیلئے انفلوئنزا کی وجہ بڑی پریشانی کا رہا۔ گو دیہات کی غیر منظم زندگی اور بھی برہم ہوگی۔ خود میں نے کئی دیہات ایسے دیکھے ہیں کہ جہاں اس سال کی خریف کی تیار فصل کا کوئی درو کرنے والا نہ تھا اس پر مستزاد بارش کی قلت تھی کہ جس کی وجہ کاروبار میں خاطر خواہ ترقی نہ ہوسکی۔ اسی سال کلدار روپیہ کی اس قدر ارزانی ہوئی کہ کچھ دنوں کیلئے سکہ کلدار سکہ عثمانیہ کی قیمت کے مساوی ہوگیا۔ یہ ارزانی بھی صدر بنکوں کے سرمایہ میں اضافہ کی مانع ہوئی۔ غرض سنہ ۱۳۲۸ف میں ادر دو بنکوں کا اضافہ ہوکا جملہ انجمنوں کی تعداد (۹۸) جملہ ممبروں کی تعداد (۴۲) ہزار ذاتی سرمایہ ۹ لاکھ ۸۱ ہزار اور کل سرمایہ ۴۸ لاکھ ۶۳ ہزار ۵۰۰ رہا۔

سنہ ۱۳۲۹ف میں فصول ربیع و تابی کے لئے بارش کی قلت رہی اور خریف و آبی بھی خاطر خواہ ہاتھ نہ آسکیں اور گزشتہ سالوں کی مسلسل پریشانیوں کے سلسلہ میں قحط بھی شروع ہوا۔ سرکار نے سررشتہ باہمی سے بھی قحط کے امدادی کاموں میں انجمنوں کے ذریعہ بہت کچھ کام لیا۔

سال سنہ ۱۳۲۹ف میں ایک اور صدر بنک قائم کیا گیا جس سے جملہ صدر بنکوں کی تعداد (۱۰) ہوگئی جملہ انجمنوں کی تعداد ۱۲۵۲ اور ممبروں کی تعداد ۳۰ ہزار ۹ سو سرمایہ ذاتی ۱۴ لاکھ ۸۹ ہزار اور سرمایہ زیر استعمال ۶۳ لاکھ ۸۷ ہزار تک پہونچ گیا۔

سنہ ۱۳۳۰ف بھی قحط کا ایک سخت سال تھا۔ سررشتہ امداد باہمی کی کوششیں قرضہ جات کے دینے اور ممبروں کی جان و مال کے بچانے کی فکر میں مشکور ہیں۔ سنہ ۱۳۳۱ف سے اب تک گو قحط کا اعلان نہیں ہوا ہے مگر زراعت کی حالت بہت تباہ رہی ہے کہ ایک بھی فصل مناسب اندازہ میں رعیت کو حاصل نہیں ہوئی۔ اجناس کی گرانی نے پیداوار کی قلت کے باوجود کاشتکاروں کی ڈوبتی ہوئی زندگی کو تنکے کا سہارا دیا ہے۔ مگر خوشحالی اور فراغت کی زندگی اس ملک کے کسانوں کیلئے اس زمانے میں ایک خواب و خیال سے زیادہ نہیں ہے۔ گو رعایا ایسے زمانہ کی ہر طرح کے مصائب کی موجودگی میں جب کہ عام طور پر عقل و اخلاق

اور ذرائع معاشی دانستہ اضطرار میں تھے ہراساں تھی مگر تحریک امداد باہمی میں کوئی اضمحلال رونما نہیں ہوا

۱۳۳۱ف میں جب خان عبدالمجید خاں صاحب نے بعجلت ممکنہ کام کو انجام دیکر مستعفی ہونے کی امید پوری کردی تو سرکار نے مولوی عبدالباسط خاں صاحب ناظم حال کو برسرکار مقرر فرمایا صاحب موصوف کے زمانہ میں بھی کام میں وسعت اور استحکام کی کوشش جاری ہے چنانچہ ۱۳۳۴ف کے اعداد اس تحریک کی ترقی کے بزبان حال شاہد ہیں کہ اس سال میں (۱۹) صدر بنک ۱۷۴۰ انجمنیں ۲۶ ہزار ۶ سو ۴ ممبر بنے۔ ۴۰ لاکھ ۶۸ ہزار سرمایہ ذاتی اور سوا کروڑ کا سرمایہ زیر استعمال رہا۔ ان کے سوا علاقہ رزیڈنسی و سکندرآباد میں دس مختلف نوعیت کی انجمنیں مثل غلہ کی دکان، قرضہ کی انجمن اور تعمیر امکنہ کی انجمنوں کے ۱۸ سو ممبروں اور ۲ لاکھ ۵۵ ہزار کے سرمایہ سے قائم ہیں۔

ممالک محروسہ کی نشاندادہ انجمنوں میں ذیل کی انجمنیں بھی شامل ہیں کہ جن کے نام ظاہر کرنے سے ممالک محروسہ میں امداد باہمی کے کام کی تنوع نظر آسکتی ہے۔ ایک سوپچپن غیر زرعی قرضہ کی انجمن گیارہ اسٹور کی انجمن جو مایحتاج ممبران کی ممکنہ سربراہی اور پیداوار صنعتی کے اور مدارس میں صادر کتب کے فروخت کا انتظام کرتی ہیں۔ ۶۶ انجمنیں سوتی اور ریشمی پارچہ بافوں کی پانچ انجمنیں کاغذ سازوں کی دو انجمنیں، نجاروں کی چار انجمنیں۔ کساروں کی دو انجمنیں موچیوں کی ایک انجمن۔ بلس یعنی ڈیری سوسائٹی کی ایک انجمن گیتہ وارد کی ایک انجمن جھٹکہ والوں کی ایک انجمن بدری کاریگروں اور گیارہ انجمنیں قالین بافوں کی ہیں۔ اس وقت ایک انجمن افزائش نسل مویشی اور ایک نئی انجمن تعمیر امکنہ کی بھی زیر رجسٹری ہیں اور گرنٹ ومرسوسائٹی (صرف کرنیوالوں کی انجمن) بھی زیر تنظیم ہے۔ ان مختلف المقاصد وہیئت انجمن ہائے امداد باہمی نے ممبران متعلقہ کی معاشی اور اخلاقی سنبھال میں ایسا غنیمت حصہ لیا ہے کہ ہر نوعیت کی انجمن کی تاریخ دلچسپی اور امیدافزائی سے خالی نہیں ہے آج کی یہ مختصر فرصت ہر قسم کی انجمنوں کی ترقی کا تفصیلی حال بیان کرنے کیلئے کافی نہیں ہے

بریں ہم اجمالی ذکر ناگزیر ہے۔ آج کے موضوع بیان کا ابتدائی جز امداد باہمی کے اعداد و شمار اور نتائج سے متعلق ہے۔ اعداد پیش کردہ سے یہ روشن ہے کہ تعداد کی ترقی میں حیدرآباد کی تحریک امداد باہمی کسی صوبہ ہند یا دیگر ممالک سے بہ تناسب آبادی کی طرح کم نہیں رہی جو معاشی اور اخلاقی ترقی اس تحریک کو نصیب ہوئی ہے وہ بھی ناقابل لحاظ نہیں ہے۔

انجمن ہائے امداد باہمی عموماً ممبران کی دقتیہ ضرورتوں کے لئے قرض دیا کرتی ہیں اور خاص طور پر ممبروں کے حسن معاملت سے آگاہ ہونیکے بعد سابقہ قرضہ جات کی ادائی اور رہن شدہ زمینات کے انفکاک کے لئے بھی رقم قرض دیتی ہیں۔ ان دونوں مدات میں انجمنوں نے ممبروں کو گذشتہ سالوں میں ۴۰ لاکھ روپیہ قرض دیکر گرانبار قرضہ جات سے نجات دلائی۔ اس موقع پر یہ توضیح مناسب ہوگی کہ قرضہ جات سابقہ کی ادائی اور زیر بار رہن زمینات کا انفکاک بہت زیادہ سرمایہ چاہتا ہے کہ کم شرح سود پر بڑی میعاد کیلئے حاجتمندوں کو دیا جاسکے متمدن ممالک کی حکومتوں نے اس غرض کو پورا کرنے کیلئے انجمن ہائے امداد باہمی کے دوش بدوش خاص مالی سہولتوں کے ساتھ زمین گروی بنک بھی قائم کئے ہیں۔ ممالک محروسہ میں بھی مستقل طور پر اس شعبہ کا قائم کیا جانا متوقع ہے۔ اس شعبہ معاملات کے قائم ہونے تک جو کچھ بھی کام انجمنوں کی بدولت ہوا ہے یا ہو رہا ہے ملک کی ضرورت کے لحاظ سے گو ایک سعی ضعیف ہے مگر زرعی قرضداری کی تخفیف میں امداد باہمی کی مدد بھی اپنا حصہ رکھتی ہے۔ پنجاب کی زرعی قرضداری سے متعلق مسٹر ڈارلنگ نے یہ بتایا ہے کہ پنجاب کی زرعی قرضداری تقریباً پچاس کرور روپیہ کی ہے اور متوسط حیثیت کے پٹہ دار کا قرضہ ۵۰۰ روپیہ ہے ایسے پٹہ داروں کے درمیان جو انجمن ہائے امداد باہمی میں شریک نہیں ہیں ۱۹۰۰ فیصدی قرضدار نہیں ہیں اور جو مزارعین انجمن ہائے امداد باہمی کے اراکین ہیں اُن کی حالت یہ ہے کہ ۳۰ فیصدی فارغ القرضہ ہیں اور ۵۰ فیصدی کے قرضہ جات نصف کی حد تک ادا ہو چکے ہیں۔ حیدرآباد کیلئے کوئی ایسی اطلاع حاضر نہیں ہے۔

اس لئے ان اعداد سے حیدرآباد کی زرعی قرضداری کا اضافہ کے ساتھ اندازہ کیا جاسکتا ہے
کیا امداد باہمی کی اہمیت اور گرو ہی بنکوں کی ضرورت پر بھی بہی خواہان ملک کی توجہ مبذول ہے
شرکائے امداد باہمی کی مالی امداد کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ علاوہ اس سہولت اور
رعایت کے کہ جن کی انجمن سے امید رکھی جاسکتی ہے شرکاء کو بمقابلہ بازاری مروجہ شرح سود
کے بہت کم شرح پر قرضہ ملجاتا ہے۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ امداد باہمی کے سرمایہ پر جو نفع لیا
جاتا ہے وہ بازاری شرح سے عموماً باندازہ نصف یا اس سے بھی کم ہوتا ہے۔
مسٹر ف کا سرمایہ زیر استعمال ایک کروڑ ۲۴ لاکھ ۷۰ ہزار کے برابر ہے۔ اگر اس سرمایہ
کا سود ۱۲ لاکھ بھی رکھا جائے تو شرکائے انجمن امداد باہمی فی اپنے حق میں ۱۲ لاکھ کی دولت جمع
کی کہ اگر غیر امداد باہمی سرمایہ کی صورت ہوتی تو ۲۴ لاکھ روپیہ کا اوسط سود اس سرمایہ کے
استعمال کرنے والوں کو دینا ہوتا۔ اس ملک کی پست حال رعایا کی دولت میں اگر ۱۲ لاکھ
کی دولت کا صرف گزشتہ ایک سال میں اضافہ مان لیا جائے تو یہ خدمت بھی کہ جو امداد باہمی
محدود پیمانہ پر انجام دے رہی ہے بری نہیں ہے۔ دیہات میں مقامی انجمنوں کے قیام
نے ممبروں کی ہمتوں کو بلند کردیا ہے۔ دیہات کی بعض اچھی انجمنیں ایسی بھی ہیں کہ خود اپنے جمع
کئے ہوئے سرمایہ سے کام کررہی ہیں۔ حتےٰ کہ بنکوں سے قرضہ بھی لینے کی انکو ضرورت یا پرواہ
نہیں ہے۔ ہمیشہ سے سرکاری تقاوی کاشتکاروں کیلئے ایک بڑی لالچ کی شے تھی مگر
بعض سمجھدار انجمنوں نے سرکاری تقاوی اگر مل بھی سکتی تھی تو لینے سے انکار کردیا کہ قرضداری
کی گرانباری سے کفایت شعاری کا احساس امداد باہمی کی عملی تعلیم کی بدولت ہوچلا ہے
دیہاتی اور شہری انجمنوں میں کفایت شعاری کا احساس آئے دن کے تجربوں سے ظاہر
ہوتا ہے کہ اگر کوئی ممبر بھول قرضہ اغراض مظہرہ کے خلاف خرچ کرے تو ثالثی کے ذریعہ
قرضہ کی بازگشت کیلئے سررشتہ میں فوراً درخواست پیش ہوجاتی اور مقامی طور پر خود
انجمن بھی فضول خرچی کو قوت کے ساتھ روکتی ہے۔

ممالک محروسہ میں امداد باہمی کے ضمن میں تعلیمی ترقی کی سرگزشت اعداد کی شکل میں ظاہر کرنا مشکل ہے مگر عام طور پر انجمنوں میں تعلیم کا شوق دلایا جاتا ہے تحقیقوں اور معائنوں کے وقت ممبروں کو خود پڑھنے اور بچوں کو پڑھانے کی ترغیب دیجاتی ہے۔ قیام انجمن کے بعد بعض ممبروں نے اپنا نام بھی لکھنا سیکھ لیا ہے بعض ممبروں نے ہندسوں سے شناسائی پیدا کرلی ہے کہ ان کو اپنے حساب کے سمجھنے میں آسانی ہو بعض انجمنیں ایسی بھی ہیں کہ جہاں کی کمیٹی سے مدرس مامور اور ممبروں کی اولاد کو تعلیم دیتے ہیں۔

بعض دیہاتی انجمنوں میں برادر ترغیب تعلیم ممبروں کے مشورہ سے یہ تجویز کی گئی کہ جو ممبر صاحب اولاد ہوں اور بچوں کو تعلیم دلانے سے غفلت کرتے ہوں اُن کو انجمن سے کوئی قرضہ نہ دیا جائے۔ ایک گاؤں میں اس تجربہ کا یہ اثر ہوا کہ ممبروں نے اولاد کی تعلیم کا مناسب حال انتظام کرالیا۔ گزشتہ ہی مہینے کی بات ہے کہ ایک گاؤں میں جہاں انجمن تو ہے مگر کوئی مدرسہ قائم نہیں ہے انجمن نے ایک مدرس کو پندرہ روپیہ ماہوار پر نوکر رکھ لیا گاؤں کے پٹواری نے مدرسہ کے لئے اپنا مکان دیا۔ انجمن کے پنچ اور معتمد نے اپنی طرف سے مدرس کی ماہواری میں ۲ روپیہ اور انجمن نے ۱ روپیہ دینے کا تصفیہ کیا ۳۰ ایک طلبہ کی شرکت کا انتظام کیا گیا اور یہ بھی طے ہوا کہ جو برائے نام فیس بچوں سے لی جائے وہ انجمن میں جمع ہوا و رفہ مدرس کے تقرر اور نادار طلبہ کی مدد میں صرف کی جائے۔

سررشتہ تعلیمات کی جانب سے کوئی تحقیق عمل میں لائی جائے تو اس موجودہ حالت میں بھی یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ شرکائے امداد باہمی کی آبادی میں بمقابلہ غیر شرکائے امداد باہمی کے باندہ متناسب تعلیم کا شوق زیادہ ہے تعلیم کے مقاصد کو حاصل کرنے میں امداد باہمی کی تحریک سے عملی فوائد خود بخود حاصل ہوسکتے ہیں جن کو میں آگے چل کر عرض کروں گا۔

امداد باہمی کے زیر اثر اخلاقی ترقی بھی حسب توفیق نمایاں طور پر ہو رہی ہے جسکی بیسیوں مثالیں میرے علم میں ہیں جن کے بیان کرنے سے یہ ظاہر ہوگا کہ شرکائے انجمن ہائے امداد باہمی

معاشی اعتماد کی وجہ سے ذاتوں کی اونچ نیچ اور مذہبی لایعنی مخالفتوں سے بالاتر رہے ہیں۔ متعدد مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انجمن کی بدولت ممبروں میں خودداری اور راستبازی کا خاصہ احساس پیدا ہوا ہے۔

پٹن میں پارچہ بافوں کی ایک انجمن کے قائم ہونے سے قبل مجھکو بدنصیبی سے یہ دیکھنے کا موقع ملا تھا کہ ایک مغلوب الغضب نوجوان اپنے بڈھے باپ کے ساتھ ہمیشہ بے ادبی کے ساتھ پیش آیا کرتا تھا۔ پٹن کی پارچہ بافی کی مشہور صنعت کی حفاظت کی خاطر سررشتہ امداد باہمی پارچہ بافوں کی انجمن قائم کی۔ قیام انجمن سے بہت قریب زمانہ میں مجھکو اس خوشگوار مشاہدہ عینی کا موقع ملا کہ وہی ناخلف جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ایک نہایت باادب اور سعادتمند فرزند ہو گیا جو گھر اور انجمن کی خدمت گزاری میں خوش سلیقگی سے مشغول نظر آنے لگا۔ پارچہ بافوں میں افلاس کی وجہ سے جو بداخلاقیاں تھیں اُن کو اس انجمن نے کم کر دیا۔ ایک اور مثال عرض کرنا چاہتا ہوں جو کاغذی پورہ سے متعلق ہے۔

کاغذی پورہ میں اورنگ زیب کے زمانہ سے کاغذ سازی کی صنعت قائم ہے۔ پردیسی یا مشن ساختہ کاغذ کی ارزانی نے کاغذی پورہ کی صنعت اور آبادی کو تباہ کر دیا تھا مگر قدامت پسند ساہوکار جو دولت آباد کے کاغذ سے خوش عقیدگی رکھتے تھے دیوالی کے موقع پر بہی کھاتوں کیلئے دیسی کاغذ ہی کا روا جا استعمال کرتے تھے یا ان کے قدیم گھرانوں میں شادی بیاہ کے موقعوں پر دعوتی رقعوں اور فہرستوں کیلئے یا شائد اسم نویسوں کیلئے دولت آباد کا دیسی کاغذ استعمال کیا جاتا تھا۔ غرض اس محدود مانگ پر کاغذ سازی کی صنعت کا دارومدار رہ گیا تھا اور کام کی یہ حالت تھی کہ ہر سال میں چند روز کیلئے کاغذ ساز دو ایک بوسیدہ کارخانوں میں جمع ہو کر بہ مشکل تمام کچھ کاغذ بنا لیتے تھے اور باقی ایام فضل آباد اور اُس کے راستوں پر مسافروں سے بھیک مانگ کر بسر کرتے تھے۔ گاؤں ایک کھنڈروں کا ڈھیر تھا اور شکستہ و ریختہ مکان اس آبادی کے بقیہ تھے

سنہ ۱۳۲۶ف میں مولوی سید راس مسعود صاحب نواب مسعود جنگ بہادر اور مولوی عبدالحق صاحب کاغذ آباد کی طرف دورہ ہوا تھا۔ ان دونوں صاحبین کی بڑی خواہش تھی کہ جامعہ عثمانیہ کی کتابوں کی اشاعت دیسی کاغذ پر ہو۔ اس وقت میں سررشتہ مال میں کام کرتا تھا۔ میں نے ان صاحبوں کو یہ اطمینان دلایا کہ حسب ضرورت کاغذ کاغذی پورہ والوں سے مل سکتا ہے اور کاغذی پورہ چلنے کی دعوت دی جہاں کاغذ ساز بھی بلائے گئے تھے مولوی سید راس مسعود صاحب نے ان کاغذ سازوں کو کام کی طرف آمادہ کیا اور سمجھایا کہ سررشتہ تعلیمات کی طرف سے آئندہ ان کو ہر وقت کام مل سکے گا اور اسی وقت صاحب موصوف نے (۵) ہزار روپیہ کی کاغذ کی فرمایش بھی دی اور یہ بھی وعدہ فرمایا کہ جس کا کاغذ بہتر ہوگا اس کو سو روپیہ انعام بھی دیا جائے گا۔ اس معاملہ کی گفتگو کے ختم ہونے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ کاغذ سازوں نے معاملہ کی بات کو کاٹ کر بھیک مانگنا شروع کیا۔ جب ان کو معاملہ کی طرف پھر متوجہ کیا گیا تو کچھ لوگ تو دور کھڑے ہو گئے کچھ سر پر جا کر جمع ہو گئے جہاں بھیک مانگنے کی متحدہ کوشش کا اہتمام تھا اور کام کا سوال ان کے لئے ایک غیر متعلق بحث تھی۔ اس ماجرے کے بیان کرنے کے بعد ایک وہ زمانہ آتا ہے کہ بڑی مشکل سے کاغذ سازوں کی انجمن امداد باہمی قائم کی جاتی ہے۔ انجمن کے نام اور کام کے انتظام سے ممبر پریشان نظر آتے ہیں بالآخر سرکاری مدد سے سرمایہ بہم پہونچا کر کام شروع کیا جاتا ہے خان عبدالمجید خاں صاحب اور مولوی محمد رضا صاحب تعلقدار کی ذاتی دلچسپی اور اثرات سے مختلف سررشتہ جات کے افسران کی مدد اور ہمدردی میں اس قدر اضافہ ہوا کہ کاغذی پورہ کی ترقی کن انجمن نے خاطر خواہ تجارت شروع دی اور اس وقت ممبروں کی خوش حالی اور خود اعتمادی اور تعلیمی شوق کا مشاہدہ مقامی معائنہ میں بہتر ہو سکتا ہے۔ ان گداؤں کی عجائب کی اخلاقی ترقی کا یہ حال ہے کہ راستہ پر رہگذروں کی جھڑکیوں کا ان کو احساس نہ تھا یاد ہو آیا کہ اس انجمن کے ممبروں نے ایک موقع پر سررشتہ کو متوجہ کیا کہ انسپکٹر صاحب متعلقہ ان کو "آپ" سے مخاطب کرنے کے عوض "تم" سے مخاطب کرتے ہیں لہذا انکو ہدایت ہونی

چاہیئے۔ اس انجمن کی مالی حالت باوجود جنس کاغذ کی کساد بازاری کے ایسی اچھی ہے کہ انجمن کا سرمایہ زیر استعمال ۶ ہزار ہے اور اس کا ذاتی سرمایہ ۳ ہزار سے زیادہ ہے۔ انجمن کاغذی پورہ کے تجربہ نے یہ بھی ثابت کیا کہ دیہی صنعت کی تنظیم بغیر امداد باہمی کے ممکن نہیں اور صوبہ جات کے تجربہ بھی اس خیال کے موید ہیں۔ کاغذی پورہ کی انجمن کے سوائے اور بھی انجمنوں سے متعلق متعدد واقعات ہیں کہ جہاں ممبروں نے نشہ بازی کو ترک کرنے کا عہد کیا ہے اور صداقت کی عزت کو محسوس کرنے لگے ہیں ایسی بھی مثالیں خیال میں ہیں کہ کوئی ممبر بیمار ہو گیا ہے تو اسکی کھیتی انجمن نے کی ہے۔ کوئی کاریگر مفلوج ہو گیا ہے تو اسکے ماتھ پر دیگر شرکائے انجمن نے کام کیا ہے اور اس مفلوج ممبر اور اس کی چھوٹی لڑکی کی پرورش کی ہے۔

ایسی بھی مثال یاد آئی کہ ایک انجمن کا ممبر فوت ہوتا ہے اور اس کی ذمہ داریوں میں سرکار کا بقایا مالگزاری اور انجمن کا قرضہ ترکہ میں بہت ناقص اور کم قیمت فصل اور ایک کمزور گائے اور ورثاء میں ایک دہ سالہ لڑکا ہے۔ انجمن اس تنہا لڑکے کو اپنی حفاظت میں اور مالگذاری کی ادائی اور دوسرے انتظامات کو اپنے ذمہ لیتی ہے۔ معلوم ہوا کہ کورٹ آف وارڈز کے فرائض گاؤں کے گنوار دہقانوں کی انجمن بھی بہت خلوص صداقت اور دیانت کے ساتھ انجام دے سکتی ہے۔

انجمن کے قیام نے مقدمہ بازی میں بھی کمی کر دی ہے اور اس کا اندازہ افسران عدالتی بہتر فرما سکتے ہیں۔ اس موقع پر افسوس کے ساتھ ایک امر لائق اظہار ہے کہ امداد باہمی کی انجمنوں سے بعض عدالتیں وہ ہمدردی نہیں رکھتی ہیں جن کی انجمن کو ضرورت ہے اور اکثر انجمن کی جائز درخواستوں کی قانون اور ساہوکار کے زیر اثر شنوائی نہیں ہوتی اس کی اصلاح و اصغاء قانون اور ذمہ دار افسران انتظامی کی توجہ سے ممکن ہے۔ مقدمہ بازی کی کمی کا ذکر کرتے ہوئے جہاں بعض عدالتوں کی بے توجہی کا ذکر کیا گیا وہاں ایک ایسے صدر ناظم عدالت یا اب رکن عدالت کا حوالہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ جو امداد باہمی کے لئے ہمہ تن مدد ہیں۔

دیگر سررشتہ جات کے افسران کی عدم ہمدردی سے جہاں امداد باہمی کے بہت سے کام بگڑتے ہیں وہاں بعض حق پسند افسروں کی توجہ سے سررشتہ اور تحریک کو بڑی بڑی امداد بھی ملی ہے۔ علاقہ انگریزی میں ہر سررشتہ کے افسر گورنمنٹ کی پالیسی کے زیر اثر امداد باہمی کی ہر ممکنہ مدد کرتے ہیں جسکی یہاں بھی ضرورت ہے مختلف سررشتہ جات کے تعاون کی ایک اچھی مثال یاد آتی ہے کہ قصبہ بدی میڈھ میں جو پارچہ بافان کی آبادی کا ایک بڑا مرکز ہے اور کسی تشبیہ پسند نے اسے دکن کا مینچسٹر بھی کہا ہے پارچہ باف اپنی اولاد کو مدرسہ کی تعلیم سے محروم رکھتے تھے اور محروم رکھنے کیلئے انکے پاس معقول و نامعقول وجوہ بھی تھے صدر مہتمم صاحب تعلیمات وقت کی دلچسپی سے ایک بڑا صناع پارچہ باف جو تمام آبادی میں ممتاز اور مقامی انجمن امداد باہمی کا سیکرٹری بھی ہے مدرسہ وسطانیہ میں ایک مدرسی کی جگہہ پر مامور کر دیا گیا اور اس کی معرفت پارچہ بافوں کے بچے مدرسہ میں شریک ہونے لگے جو ایک خاص نصاب کے تحت جس میں ڈرائینگ کی تعلیم شریک تھی مدرسہ میں نوشت و خواند کی تعلیم اور کارخانہ میں پارچہ بافی کی عملی تعلیم پانے لگے۔ اس انتظام سے ایک ایسی مشکل حل ہوگئی کہ جسکا اور طور پر حل کرنا مشکل تھا

غرض امداد باہمی کی موجودہ حالت میں بلحاظ ان مشکلوں کے کہ جن کا سرسری ذکر اوپر کیا گیا ہے ملک کی عام لاعلمی کی ظلمت کو طے کرکے امداد باہمی کے اعلےٰ مقاصد و نصب العین کو پہونچانا حاملان تحریک کا اور تمام ملک کا فریضہ ہے جس کی کوشش بھی حسب توفیق جاری ہے

تحریک امداد باہمی کی موجودہ حالت کا ذکر ناقص رہے گا اگر میں ان تین مرکزی انجمنوں کا ذکر نہ کردوں جو علم و عمل و صنعت و حرفت اور جملہ انجمنوں کی مالی تنظیم کی ذمہ دار ہیں۔ امداد باہمی کے علم و عمل کی تبلیغ و اشاعت اور عوام میں امداد باہمی کی روح پھونکنے کا کام جوش پھیلانے موجودہ انجمنوں سے تعلق پیدا کرکے ان کے انتظامات میں مدد کرنے شرکائے امداد باہمی کے ہر جائز معاشی عمل میں ممکنہ ہدایت و حمایت اور امداد باہمی کو ملک کی علمی اور معاشی زندگی میں حسب ضرورت پیوستہ کرنے کیلئے ایک صدر جمعیت اتحاد امداد باہمی قائم ہوئی ہے۔ اس

جمعیت کے صدر نشین نواب حیدر نواز جنگ بہادر اور مجلس عاملہ کے صدر نشین رینکٹ رامارڈی صاحب اور معتمد سید بدر الحسن صاحب ہیں۔ اس انجمن کی بنا، دیگر مہذب ممالک کی تقلید میں کی گئی ہے کہ امداد باہمی کے نظام ترکیبی میں تحمیل ہو یقین ہے کہ پبلک کی توجہ اور سرکار کی مدد سے یہ انجمن بہت جلد میدان عمل میں کامیابی حاصل کرے گی۔ چنانچہ اس وقت جمعیت کے زیر غور حملہ ملکی ذیل میں ایک رسالہ اشاعت اور تبلیغی لکچروں اور تراجم کی تیاری کا انتظام ہے اور آئندہ کیلئے یہ باور کرنیکی وجہ موجود ہے کہ یہ جمعیت اپنی ترقی یافتہ نوبت پر ملک کی خاص علمی اور اخلاقی خدمت کا مرکز اصلی بن کر رہیگی۔ عام طور پر علم دوست حضرات سے امید ہے کہ اس جمعیت میں شریک ہونے کی جانب توجہ فرمائیں گے۔

دوسری مرکزی انجمن حیدرآباد میں انڈن انڈسٹریل کوآپریٹیو سوسائٹی کے نام سے قائم ہے جو نکی صنعتوں کی ترقی میں خاص اہتمام کرتی ہے۔ جو کچھ بھی کام اس انجمن نے صنعتی انجمن ہائے امداد باہمی کی پیداوار کو ترقی دینے اور اس کے فروخت کرنے میں انجام دیا ہے وہ لائق تعریف ہے۔ ریشم کاغذ اور قالین کی صنعت میں اس انجمن کی بدولت بہت کچھ ترقی ممکن ہوئی۔ صنعت قالین کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتا دینا بھی مناسب ہوگا کہ اس وقت ورنگل کے قالین باف مولوی فضل اللہ صاحب مددگار کی رہنمائی اور مشورہ سے اعلیٰ اعلیٰ ترکی ایرانی اور دکنی نمونوں کے قالین تیار کر رہے ہیں اور بیرون ملک ان کی مستقل مانگ بھی قائم ہوگئی ہے۔ امداد باہمی کی مدد سے گھریلو صنعتوں کی ترقی اور بقا میں ایسی بے بدل مدد ملی ہے کہ اس صنعت کی تباہی کے اندیشے اب وہم و گمان نظر آنے لگے ہیں۔ دیگر صوبہ جات ہند سے انجمن ہائے امداد باہمی کی مصنوعات کی نمائشوں کے ضمن میں ممالک محروسہ کی صنعتوں کی خاص طور پر طلبی کی جاتی ہے۔ چنانچہ سال پیوستہ بمبئی سے امداد باہمی کی گھریلو صنعتوں کو طلائی اور متعدد نقرئی تمغہ حاصل ہوئے۔

تیسری مرکزی انجمن مرکزی بنک امداد باہمی حیدرآباد ممالک محروسہ میں بڑا مرکزی بنک

ہے جو نظام مالیہ کا وہ بلند مرتبہ زینہ ہے جو آئندہ ہندوستان کے مجوزہ اعلےٰ صدر بنک امداد باہمی کا ریاست کی طرف سے شریک ہو سکے گا۔ اس مرکزی بنک کا مقصد صدر بنکوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا دیہات و اضلاع کے مقامی سرمایہ کو حسب ضرورت ملک میں پھیلانا شہر کی تجارتی تموّل سے دیہات کی زندگی کو مالی امداد سے آباد و خوش حال کرنا ہے۔ اس مرکزی بنک کی موجودگی میں اضلاع کے بنکوں کیلئے نقدی اعتبار کا حاصل کرنا سہل ہو گیا ہے۔ اس مرکزی بنک کے قابل اور ہمدرد صدر نشین راؤ بہادر آر مودم آئنگار صاحب ہیں۔ ایسے مرکزی بنک کا قیام گو امداد باہمی کی مشہور مک لگن کمیٹی کی سفارش پر عمل میں آیا ہے مگر اس کے قائم کرنے کی گراں قدر ذمہ داری کو مولوی حسام الدین احمد صاحب مرحوم نے پورا کیا تھا جنکی بے وقت وفات نے امداد باہمی کے مقاصد کو کمر توڑ صدمہ پہونچایا ہے۔

حضرات! میں نے تحریک امداد باہمی کی حالت موجودہ کو کم و بیش آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے کوئی امر لائق شکایت بھی اگر عرض کرنے سے رہ گیا ہے تو وہ یہ ہے کہ پبلک اس تحریک کی حمایت اور واقفیت میں بہت کم دلچسپی لیتی ہے جو خود اُس کے حق میں موجب نقصان ہے۔ انشاء اللہ وہ دن دور نہیں ہے کہ ان انتظامات کے مدنظر کہ جو سررشتہ کی کوشش اور جمعیت اتحاد باہمی کے زیر عمل ہیں اس تحریک کی واقفیت عام ہو جائے گی خصوصاً جب کہ امداد باہمی کے درس دیہی اور شہری مدرسوں میں دئے جائیں گے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں تعلیم امداد باہمی کا ایک مستقل شعبہ قائم ہو جائے گا ابتدائی دیہی مدارس کی تعلیم سے زراعت کی ترقی میں مدد ملے گی اور اعلےٰ تعلیم سے حیدرآباد کے تعلیمیافتوں کی بیکاری کا مسئلہ بہ لحاظ مختلف النوعیت کاروبار امداد باہمی کے بڑی حد تک حل ہو سکے گا یہ ضروری ہے کہ سائنس، ادب اور قانون کے گریجویٹوں کے ساتھ ایسے گریجویٹ بھی تیار ہوں جو امداد باہمی کے علمی خیالات کے نشر سے ترقی کے نئے میدان بنکنگ بیمہ، زراعت، ترقی زراعت، افزائش نسل مویشی، تعمیر مکانات، توسیع برقیات و ذرائع محل و نقل وغیرہ جیسے وسعت پذیر

کاروبار میں حاصل کریں۔ جامعہ عثمانیہ میں شعبہ تعلیم امداد باہمی کے لئے پروفیسری کی کرسی قائم کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ برلن یونیورسٹی میں امداد باہمی کے مضمون کیلئے ڈاکٹر اگست ملراور پیرس کی یونیورسٹی میں چارلس ژید جیسے فاضل اساتذہ اس وقت موجود ہیں۔ انگلستان اور دیگر ممالک میں امداد باہمی کے کالج قائم ہیں۔ روس میں امداد باہمی کی یونیورسٹی موجود ہے۔ ہندوستان میں بھی تعلیم امداد باہمی کی اہمیت کا خیال یونیورسٹیوں کے حلقوں میں پھیل رہا ہے۔ چنانچہ کلکتہ یونیورسٹی نے معاشیات کے تحت امداد باہمی کی تعلیم کا انتظام کیا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ عثمانیہ یونیورسٹی ہندوستان کی پہلی یونیورسٹی ہو جو قیام شعبہ امداد باہمی کے مقصد کو حاصل کرلے۔ عرصہ ہوا کہ یہ تحریک سررشتہ کے ملاحظہ میں پیش کردی گئی ہے جس کے نتیجہ کا مجھ کو برابر انتظار ہے۔ امید ہے کہ سررشتہ امداد باہمی اور صدر جمعیت اتحاد امداد باہمی کی کوشش اور سرکار کی فیاضی سے کوئی عملی صورت جلد نکل آئے اور عثمانیہ یونیورسٹی کا کوئی ایک پروفیسر علم امداد باہمی کی ڈاکٹری کیلئے یورپ ہو آئے۔ سرکار نے سررشتہ کی گزارشوں پر جہاں صدہا رعایتیں اس وقت تک اس تحریک کے نشو ونما کی خاطر فرمائی ہیں کاروبار امداد باہمی کے عمل سے واقف ہونے کیلئے اس وقت تک پندرہ ایک ملازمان سررشتہ کو علاقہ انگریزی میں اور ایک ملازم سررشتہ کو یورپ بھی روانہ فرمایا ہے۔ سررشتہ نے عام طور پر ملازمین سررشتہ کی تعلیم کیلئے ایک وسیع جماعت تعلیمی بھی قائم کی تھی جو تعلیمات، زراعت اور دیگر سررشتہ کے عہدہ داروں کی مدد سے کامیاب رہی۔ سرکار نے سال گزشتہ امداد باہمی کی تعلیم کے لئے ایک یورپ کا وظیفہ بھی منظور فرمایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تحریک امداد باہمی کا مدعا بانیان تحریک امداد باہمی کے نزدیک ایسی تعلیمی ترقی تھی کہ جس سے قومی زندگی کے اعلےٰ نصب العین حاصل ہوں اس لئے امداد باہمی کی تحریک کو ایک تعلیمی تحریک کہنا بیجا نہ ہوگا۔ معاشی تنظیم کے ساتھ ساتھ تعلیم

کا فاطر خواہ انتظام ہمیشہ سے قائدان امداد باہمی نے ملحوظ رکھا ہے۔ راچڈیل کے پیشہ وان نے آج سے اسّی سال قبل امداد باہمی کی دکان کے ساتھ جس تعلیم کی بنا ڈالی تھی اُس کی تعلیم آج اس نوبت پر ہے کہ باوجود قومی سرکاری اور میونسپل اعلیٰ انتظام تعلیم کے تحریک امداد باہمی بھی اپنے حلقوں میں کروڑہا پونڈ تعلیم پر صرف کرچکی ہے اور اب بھی سالانہ تیس لاکھ روپیہ کے قریب امداد باہمی کی تعلیمی انجمنوں کی جانب سے صرف کئے جاتے ہیں۔ اس سے امداد باہمی کی تعلیمی اہمیت کا احساس جو اور ملکوں میں ہے ظاہر ہوتا ہے۔ امداد باہمی کا ایک قوی عنصر تعلیم معاشی کے سوائے عملی اور اخلاقی بھی ہے کہ جس سے ذاتی اغراض کو جماعتی اغراض کے تابع رکھکر ذاتی حقوق کی حفاظت کے ساتھ بلا خیال رقابت معاشی عمل میں جد وجہد اور زندگی میں جدید ذوق عمل کا درس دینا مقصود ہے۔ انجمن ہائے امداد باہمی نیک عمل کے ایسی تعلیم گاہیں ہیں کہ جہاں ہر فرد کا کل افراد کیلئے اور کل افراد کا ہر فرد کیلئے ہونے کی تعلیم ملتی ہے۔

انجمن ہائے امداد باہمی کو اگر اخلاقی جمہوریت کے نام سے بھی موسوم کیا جائے تو نامناسب نہوگا کہ اس میں خود اعتمادی اور باہمی اعتبار کے ساتھ خداداد انتظامی قابلیت کے اظہار کے مواقع بھی حاصل ہیں کہ جن کے اظہار کا اور طور پر شائد انجمنوں کے اکثر شرکاء کو موقع نہ ملے۔

امداد باہمی کے اعلےٰ خیال و مقاصد کے تحت عام اصلاح کے نصب العین کو پھیلانے اور اس کو برقرار رکھنے کیلئے تعلیم ضروری ہے۔ تعلیم اُس کے وسیع مفہوم میں ایک بہترین سرمایہ ہے جو انسان اپنی زندگی میں جمع کرسکتا ہے۔ اور اغراض امداد باہمی کیلئے یہ سرمایہ علم مالی اعتبار سے بھی نفع بخش ہے۔ امداد باہمی کی تعلیم کا مقصد ہر فرد کی پنہاں ذاتی قابلیت کو اُبھارنا اور اُس کی ذات کو سوسائٹی کے لئے اہل بنانا ہے پروفیسر ٹونی کا خیال امداد باہمی کے اصول کے مطابق یہ ہے کہ "تعلیم کا مقصد صرف

صرف یہ نہیں رہا ہے کہ شخصی طور پر ذخیرۂ علم جمع ہو اور ذہنی تربیت سے انسان کو مکمل بنایا جائے جو بجائے خود عظیم مقصد ہیں بلکہ سوسائٹی کی حیثیت میں ایک مشترک نصب العین کے ساتھ ترقی کرنے کی تعلیم دیجائے۔" اس طرح کہ جو کسان بن سکتا ہو وہ کسان بنے جو طبیب بن سکتا ہو وہ طبیب بنے نہ کہ اس کا برعکس تاکہ ہر فرد کی قابلیت کی سودمندی کل افراد کیلئے اور کل افراد کی علمی سودمندی ہر فرد کیلئے کارآمد ہو کہ سوسائٹی تعلیم کے ظلم سے بمعنی وضع الشی علی غیر محلہ محفوظ رہے۔

کیا بہ لحاظ تعلیم کیا بہ لحاظ اخلاق کیا بہ لحاظ معاشیات انجمن ہائے امداد باہمی میں ہر اصلاح کی گنجایش موجود ہے۔ بقول لارکار "میکل کے گاؤں کی انجمن گاؤں کی محافظ بنک عدالت مدرسہ، مجلس صفائی اور قدیم دیہی زندگی کی مجدد ہے۔ ہولی اوک نے تحریک امداد باہمی کیلئے کہا ہے کہ امداد باہمی کا اخلاقی مذہب جدید دنیا میں ہر مرد و زن کی ممکنہ خوشی میں ترقی دینے کی ان تھک مسلسل اور اپنی طاقت کے موافق بلا لحاظ تفریق درجہ و جماعت، نژاد و رنگ کوشش کرنا ہے۔ یہی مفہوم سعدی صاحب کے اشعار سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگراند ✤ کہ در آفرینش ز یک جوہراند
چو عضوی بدرد آورد روزگار ✤ دگر عضوہا را نماند قرار

آئرلینڈ میں مذہبی اور سیاسی خونریز اختلافات کے باوصف میرے مشاہدہ میں جس حد تک امداد باہمی کے معاملات کا تعلق رہا کامل شیر و شکر کی طرح ملے ہوئے نظر آئے۔ ان اعلیٰ اصول کے تحت ہندوستان کیلئے عموماً اور حیدرآباد کیلئے جہاں کی آبادی مختلف زبانیں، مختلف تربیتیں، مختلف مذاہب اور مختلف ذاتیں رکھتی ہیں امداد باہمی کی صلح جو عافیت آموز تحریک ترقی ملک کا باعث اور ریاست سے وفاداری اور دلی عقیدتمندی اور حب وطن کے جوش، خیالات کے اتحاد، رواداری اور ہمسائگی کے احساس، خدمت گزاری اور کفایت شعاری کے عادات اور مہذب پبلک لائے

کے ساتھ معاشی مفاد کی تکمیل میں کامیاب ہوسکتی ہے۔

جیسا کہ اور ممالک میں امداد باہمی کی انجمنیں آج اچھے خیالات کی اشاعت کا ذریعہ بنائی گئی ہیں ملک حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں بھی زرعی اور صنعتی تعلیم کو امداد باہمی کی انجمنوں کے ذریعہ عام کیا جاسکتا ہے کہ جس سے صنعتی اور زراعتی پیداوار میں ترقی نصیب ہو۔ اس تنظیم کے تحت صنعتی اور زراعتی مدرسہ ملک کے ہر مناسب حصہ میں قائم ہوسکتے ہیں جیسے کہ ڈنمارک میں ہیں تعلیم رشدیہ (پرائمری تعلیم) کو دیہی انجمنوں کی وساطت سے پھیلایا جاسکتا ہے اور بڑے چھوٹے مدارس میں انجمنیں قائم کی جاسکتی ہیں جو طالب علموں کو امداد باہمی کے معاشی عمل سے آشنا کرنیکے سوائے حاجتمند طالب علموں کی وظائف اور دیگر ضروریات تعلیم سے مدد کرسکیں گی۔ امداد باہمی ترقی زراعت کیلئے ایک موثر تدبیر ثابت ہوئی ہے۔ حیدرآباد میں بھی انجمنوں کی متحدہ قوت اور مشترکہ سرمایہ سے زراعت اور طریقہ زراعت میں اور اس طرح پیداوار زراعت میں ترقی اور رعایا کی دولت میں اقزائش کا ذریعہ ہوسکتی ہے۔ امداد باہمی کی مدد سے پیداوار زراعت میں ترقی ایک اہم مقصد ہے۔ شرکا کی جمعیتی قوت سے ضروریات زندگی و زراعت کی خریدی پیداوار زراعت کے فروخت میں صرف کرنے والوں اور پیدا کرنے والوں کے لئے نفع کامل حاصل ہوسکتا ہے۔ امداد باہمی کی اس شکل میں مناسب تنظیم ضروری ہے کہ بے بس رعایا کی دولتمندی میں اضافہ ہو

امداد باہمی کی برکت اور جدید طریقہ ہائے زراعت کی مدد سے پیداوار زراعت میں توفیر ایک مسلمہ ہے۔ ڈنمارک کی زمین بمقابلہ انگلستان کی زمین کے بہت ادنیٰ قسم کی سمجھی گئی ہے اور انگلستان کی زمین بمقابلہ ہندوستان کی زرخیز زمین کے کوئی نسبت نہیں رکھتی بریں ہم ان تینوں ملکوں کی پیداوار زراعت کا مقابلہ کیا جائے تو ہندوستان میں فی ایکر صرف ۱۳ بشل گیہوں پیدا ہوتے ہیں تو انگلستان میں ۳۱ بشل فی ایکر اور ڈنمارک میں ۴۸ بشل فی ایکر اوسط پیداوار ہے۔ امداد باہمی کی گزشتہ ۷۰ سالہ ترقی کے ضمن

یہ بتایا جاتا ہے کہ آج سے ۲۰ سال پہلے جب کہ امداد باہمی کی زرعی تنظیم ڈنمارک میں خاطر خواہ اچھی نہ تھی فی ایکر صرف ۱۵ بشل گیہوں کی پیداوار اوسط حاصل ہوتی تھی اور موجودہ سہ چند سے زیادہ پیداوار کی ترقی محض امداد باہمی کی مدد سے اچھی زراعت کا نتیجہ ہے پس امداد باہمی کی تنظیم سے پیداوار زراعت کی ترقی میں ہندوستان جیسے مفلس اور نادار ملک میں جہاں کہ شخصی ماہانہ اوسط آمدنی بمشکل ڈھائی روپیہ خیال کی جاتی ہے ازبس ضروری ہے اور اس ضرورت کی تکمیل حیدرآباد میں بھی لازمی ہے۔ مکانوں کی مشکلوں کو بھی آسان کرنے میں امداد باہمی کے مختلف طریقوں سے مدد مل سکتی ہے مثلاً ایک مشترکہ زمین پر مختلف شرکاء کا جو ذی استطاعت ہوں اپنے اپنے مکان تیار کر کے بود و باش اختیار کرنے کی ایک شکل ہو سکتی ہے تو دوسری شکل کم استطاعت اشخاص کا مل کر اسی انجمن کا قائم کرنا ہی کہ جس میں انجمن کے سرمایہ سے مکان تعمیر کئے جائیں اور ممبر کرایہ خردی کے طریقہ پر بالاقساط قیمت کی ادائی کے بعد مکان کے مالک ہو جائیں۔

تیسری شکل اور بھی کم استطاعت اشخاص کی ہے جو مذکورہ بالا طریقوں سے کوئی مکان حاصل نہ کر سکتے ہوں وہ بہ طریقہ ٹنٹ کوپارٹنرشپ مشترکہ سرمایہ سے مکان تعمیر کریں اس طرح کہ ہر شخص کچھ سرمایہ حسب استطاعت تعمیر میں لگائے اور تعمیر کے تکمیل کے لئے ڈپنچر یا قرضہ سے سرمایہ فراہم کیا جائے۔ چوتھی شکل اور بھی کمتر حیثیت استطاعت کے اشخاص کے لئے ہے کہ جو اچھے مکان کی تعمیر کسی شکل سے بھی نہ کر سکتے ہوں وہ اچھے مکانوں کو کرایہ پر لینے کی انجمن بنائیں۔ غیر آباد رقبہ جات کی نو آبادی بھی انجمن ہائے امداد باہمی کی مدد سے کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ اور مہذب ممالک میں ہوتی ہے غرض حالات و ضروریات کے لحاظ سے امداد باہمی کی ہر ممکنہ انجمن قائم ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ قائم کرنے والے اور کام کرنے والے پیدا ہوں اور ملازمین سررشتہ میں صداقت و دیانت کی فضا بھی قائم رہے۔

سر فریڈرک نکلس نے ۱۸۹۵ء میں جب کہ ہندوستان کو امداد باہمی کی انجمنوں کے قیام کا مشورہ دیا تو یہ بھی کہا کہ تحریک آغاز کے ساتھ ریفائنس بھی تلاش کئے جائیں کہ جو اس تحریک کو کامیاب بنا سکیں۔ ہندوستان میں ایک ریفائنس کیا صدہا ریفائنس مل سکتے ہیں جس کیلئے تعلیم اور تلاش کی ضرورت ہے۔ حیدرآباد میں امداد باہمی کا مستقبل کیا ہوگا اس کا جواب مختصر یہ ہے کہ حالات امید افزا ہیں۔ پبلک کی توجہ سے ہر وہ ترقی ممکن ہے کہ جو دوسرے ملکوں نے امداد باہمی کی مدد سے حاصل کی ہے۔

یورپ کے ممالک شمل ڈنمارک جرمنی انگلستان بالخصوص آئرلینڈ کی مثالوں کے پیش کرنے سے زیادہ قریب کی مثال جاپان کی معلوم ہوتی ہے جو اگاتا کی کتاب موسوم بہ جاپان میں امداد باہمی سے اخذ کی گئی ہے کہ جاپان میں گزشتہ بیس سال میں تحریک امداد باہمی نے جو ترقی حاصل کی ہے وہ ذیل کے انتظامات سے ظاہر ہوتی ہے۔ جاپان کی "حوت کشا" انجمنوں نے جو ہمارے ملک کی زرعی انجمن ہائے امداد باہمی کے ہم اصول و ہم مقاصد ہیں اپنے قواعد و اغراض میں یہ لازم گردانا ہے کہ ہر ممبر اپنے بچوں کو تعلیم دلائے۔ اکثر انجمنوں میں استادوں اور ملازمین سررشتہ امداد باہمی کی طرف سے لکچروں کا انتظام ہوتا ہے۔ شام میں جماعتوں کے طور پر لکچروں کے انتظام کئے جاتے ہیں، باوفا ممبروں کو انعام دئے جاتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ممبروں کی موت یا کسی حادثہ کی صورت میں سلوک مناسب کرنے کیلئے انجمن کے مدات منافع میں گنجائش رکھی جاتی ہے۔ عورتوں کی دلچسپی اور بہبودی کیلئے انجمنیں بنائی جاتی ہیں۔ انجمنوں کی جانب سے مقامی طور پر پیداوار زراعت کی نمائشیں کی جاتی ہیں۔ مدارس اور دیگر خیراتی کاموں کیلئے چندے دئے جاتے ہیں ممبروں کی قانونی رہنمائی کے لئے کمیٹیاں مقرر کی جاتی ہیں۔

عام اثر انجمن ہائے امداد باہمی کا جو جاپان میں نظر آتا ہے وہ طریقہ زراعت میں ترقی پیدا ہونا، نئے نئے اوزار اور آلات زراعت کے استعمال میں زیادتی ہے۔ اس کے سوائے

انجمنوں نے بنجروں کو قابل کاشت بنایا ہے اور زراعتی تجربہ گاہ قائم کئے ہیں۔ دیہات کے راستہ اور مخازن آب درست کئے ہیں، ناقص جھاڑیوں کی کھاد بنائی گئی ہے۔ زمینات میں رطوبت رکھنے کی قابلیت پیدا کی ہے۔ زراعت کے متعلق کارخانہ قائم کئے ہیں۔ ریشمی کیڑوں کی پرورش کیلئے انجمنوں کی طرف سے مشترکہ گھر بنائے گئے ہیں مرغیوں اور زراعتی مویشی کی پرورش کیلئے انتظامات مناسب عمل میں لائے گئے ہیں چنانچہ ہر انجمن سے مرغیوں اور زراعتی مویشی کی زیادتی کی اطلاعیں ملتی رہتی ہیں۔ جانوں کی تجارت کو ساہوکاروں کی زیادتی سے بچا کر انجمنوں نے اپنے قابو میں کر لیا ہے رہا قطعاً موقوف ہے۔ دیہاتیوں کا شہروں کی طرف کسب معاش میں رخ کرنا موقوف ہو گیا ہے۔ انجمنوں نے مبروں کو تباہ کن قرضہ جات سے نجات دلائی ہے۔ اس تحریک کی بدولت جو اخلاقی فوائد کہ جاپان کی انجمن ہائے امداد باہمی کو حاصل ہوئے ہیں وہ کفایت شعاری، صنعت کی ترقی، فضول خرچیوں کا استیصال، قمار بازی کا انسداد، تساہل کی بیخ کنی ہیں۔ دیہات کی مصروفیتوں میں ایسا اضافہ ہوا کہ چار خانوں کے دروازے بند نظر آنے لگے۔ دیہات میں جو سیاسی مناقشے ہوا کرتے تھے وہ بھی امداد باہمی کی صحت بخش مصروفیتوں کی وجہ سے موقوف ہو گئے۔ امداد باہمی کی تحریک نے جملہ مبروں کیلئے ایک ایسی دلچسپی پیدا کر دی کہ جس سے خاندانی اور قدیم اختلافات بھی رفع ہو گئے۔ مفید اور سوشیل تقاریب میں آئے دن ترقی ہونے لگی۔ انجمنوں کی وجہ سے سرکاری محاصل کی ادائی میں وقت کی پابندی ہونے لگی اور عدالتی نزاعات اور جرائم میں نمایاں تخفیف ہو گئی۔ چونکہ امداد باہمی کا اصول اول اخلاقی معیار کی بنا پر نقدی لین دین کا اعتبار قائم کرنا ہے تو انجمنوں نے اس اصول کی اس حد تک واقفیت بڑھا دی ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر دولہا کے اخلاق کا اندازہ اس کے کسی انجمن کے ممبر ہونے یا نہ ہونے پر سے کیا جاتا ہے۔ شادی کی تقریبوں میں فضول تحفہ جات کے عوض

انجمنوں کے صداقت نامہ جات حصص دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح کی بے شمار ترقیاں حیدرآباد کے حصہ میں بھی آسکتی ہیں۔ غرض امداد باہمی کا مستقبل بہ لحاظ اس کے کہ اصولاً اس تعلیمی، اخلاقی، اور معاشی تحریک کو کہ جس کا مسلک مذہب اور سیاست سے الگ رہکر بنی نوع انسان کی خدمت کرنا ہے ہر طرح امید افزا نظر آتا ہے۔

آخر میں فاضل و عالم صدر نشین صاحب کے محولہ کیلنگ والے قول سے متعلق عرض کروں گا کہ اعلےٰ تعلیمی ترقی کی نوبت پر مشرق و مغرب کے جس ملاپ کی تمنا صاحب معزنے ظاہر فرمائی ہے اُس سے متعلق میں ایک انگریزی رسالہ کی ذیل کی عبارت سے اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ امداد باہمی (کواپریشن) نے اس میدان اتحاد کو بھی حاصل کر لیا ہے۔

"مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب
دونوں مل جائیں یہ ممکن ہے کب"

یہ بیت شہنشاہیت کی سکھائی پڑھائی ہے۔ لیکن شہنشاہیت، اُسے بڑھ کر بھی ایک قوت ہے جو مشرق اور مغرب کو ملاتی ہے، اُمداد باہمی۔ بھائی بندی کا مرادف لفظ بن گیا ہے اور کس قدر، اُحسان ہے اصول امداد باہمی کا کہ یہاں مشرق اور مغرب، دونوں آن ملے ہیں اور مل سکتے ہیں۔"

اب امداد باہمی کے علم و عمل کی آرزو پر اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔

*

*

مطالعہ قدرت۔ جڑیں

آج ہم قارئین کرام سے اپنے ایک نئے قلمی معاون کو روشناس کرانا چاہتے ہیں۔ اُوپر کی سُرخی والا مضمون مولوی بابر مرزا صاحب بی۔ ایس۔ سی کے قلم سے ہے۔ صاحب موصوف مولوی محمد عزیز مرزا صاحب مرحوم کے فرزند ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اپنے نامور والد ماجد کی طرح ان کو بھی نہ صرف علمی ذوق ہے بلکہ قلم سے اظہار خیال کی چٹک بھی ہے۔

آپ نے حیاتیات میں تحصیلی سند (ڈگری) جامعہ بمبئی سے حاصل کی ہے اور جامعہ عثمانیہ میں اسی فن کی تعلیم دیتے ہیں۔ جڑوں پر جو مضمون آپ نے ہماری فرمائش پر عنایت فرما کر لکھا ہے اُس کے سلجھے ہوئے بیان سے ایک ہونہار قلم کی بو باس آتی ہے۔ صاحب موصوف نے وعدہ فرمایا ہے کہ العلم کے قارئین کے لئے مطالعہ فطرت پر ضروری اور کارآمد مضامین عنایت فرماتے رہینگے

شریک مدیر

ہر پودے کی جانچ کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ پودے کی شکل و ساخت اور اُس کے حصّوں کے نمو کی جانچ کی جائے لیکن اُن حصّوں کی جاندار سیرت پر غور نہ کیا جائے۔ یعنے پودے کو ایسی ہی نظر سے دیکھا جائے جیسے کہ ایک بے جان چیز کو۔ مثلاً کرسی یا میز۔ دوسرے یہ کہ پودے کو جاندار تصور کر کے جانچ کی جائے اور اُس کے مختلف حصّے اور اعضاء کے افعال پر غور کیا جائے۔

ان دو طریقوں سے ہم پودے کی جڑ، تنے، پتے یا اُس کے کسی اور حصے

کی جانچ کرتے ہیں۔ ہم بغیر اُن کی جاندار سیرت کا خیال کئے ہوئے اُن کی شکل و ساخت کا مشاہدہ کرتے ہیں یا اُن کی شکل و ساخت کو نظر انداز کر کے صرف اُن افعال کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جن کو یہ حصے انجام دیتے ہیں۔

جڑوں کی جانچ کرنے میں ہم ان دونوں نکتوں کو مدنظر رکھیں گے۔ اس بیان میں صرف جڑوں کی شکل و ساخت پر غور کریں گے اور آئندہ ان کے افعال کی تحقیق کرینگے

اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ جڑ کی شکل و ساخت بلا وجہ وقوع میں نہیں آئی ہے ہر جڑ اپنی شکل و ساخت کی مناسبت سے اپنا کام کرتی ہے۔ اگر کسی جڑ کی شکل میں تغیر ہو تو اُس کے افعال میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے۔

دس یا بارہ پودوں کو زمین سے اُکھاڑ کر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہر ایک کی جڑ مختلف شکل کی ہوتی ہے۔ اب ہم کو چاہیئے کہ ان مختلف اشکال میں تمیز کرنے کیلئے ان کے چند گروہ بنائیں۔

سب سے آسان ترتیب یہ ہے کہ جڑوں کو تاگے نما (ریشہ دار) اور گدیلی کہیں۔ گھاس کی جڑیں تاگے نما جڑوں کی مثال ہیں (شکل ۴) اور گدیلی جڑوں کی مثال گاجر ہے (شکل ۱)۔ ریشہ دار اور گدیلی جڑوں کی کئی قسمیں ہیں لیکن فی الوقت ہم تمام زمین دوز جڑوں کو صرف دو سرخیوں میں ترتیب دیں گے

گدیلی جڑوں کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی بعض قسمیں

(۱) مخروطی جڑ (گاجر)
(۲) کردی یا شلجمی جڑ (شلجم)
(۳) تُربی جڑ (مولی)
(۴) ریشہ دار جڑ (گھاس)
(۵) گٹھیلی جڑ (دھالیا)

بہت عام ہوتی ہیں اور ہر قسم کو ایک خاص نام سے موسوم کیا ہے۔

پس گاجر راس پر چوڑی ہوتی ہے اور نیچے کی طرف پتلی ہوتی جاتی ہے۔ اس قسم کی تمام جڑوں کو مخروطی جڑیں کہتے ہیں۔ مولی کی شکل بالکل مختلف ہوتی ہے (شکل ۳) دونوں سرے پتلے ہوتے ہیں اور بیچ کا حصہ موٹا ہوتا ہے۔ اس شکل کی جڑوں کو ترکی جڑیں کہتے ہیں۔ گردی شکل کی جڑوں کی مثال شلجم ہے (شکل ۲) اور ایسی جڑوں کو شلجمی جڑیں کہتے ہیں۔

گٹھیلی جڑ۔ دھالیا پودے کی جڑیں ایک خاص شکل کی ہوتی ہیں (شکل ۵)۔ اس پودے کی ریشہ دار جڑوں میں اس قدر غذائیت جمع ہو جاتی ہے کہ یہ خوب پھول جاتی ہیں۔ ایسی جڑوں کو گٹھیلی جڑیں کہتے ہیں۔

اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ سب جڑیں دھالیا کی طرح زمین میں دو تر بصیلہ نما شکلیں نہیں ہوتیں۔ اکثر پودوں کے تنے بھی جڑوں کی طرح زمین کے اندر رہتے ہیں اور جڑوں کی طرح پھول جاتے ہیں۔ مثلاً آلو زمین کے اندر اگتا ہے لیکن یہ جڑ نہیں ہے پس جیسے گٹھیلی جڑیں ہوتی ہیں ویسے ہی گٹھیلے تنے ہوتے ہیں۔ ان دونوں کا امتیازی فرق ہمیشہ ذہن نشین رہنا چاہیئے۔

ظاہرہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جڑ کی شاخیں اس جڑ کی بیرونی سطح سے نکلتی ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ایک جڑ کی شاخیں اس جڑ کی اندرونی تہ کی ایک گاجر کو بیچوں بیچ کھڑا تراش کر اس بات کا یقین کر سکتے ہو۔

عملی کام کے لئے ہدایات۔ کسی کھیت یا باغ میں سے کچھ پودے اکھاڑ کر ان کی جڑوں کی شکل بیان کرو

کسی باغ کی تمام ساگ و پات کی جڑوں کی شکلیں بیان کرو اور ان کی شکلوں کے خاکے کھینچو۔

مخروطی جڑوں، ترکی جڑوں اور گٹھلی جڑوں کی اور دو دو مثالیں دو۔
گاجر وغیرہ کو بیچوں بیچ تراش کر دیکھو کہ تمام سطحی جڑیں دراصل گاجر کے مغز سے نکلتی ہیں یا نہیں؟

پیشوں کی تعلیم

یہ مضمون مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔اے (کنٹب) کے قلم سے ہے۔ صاحب موصوف بلدہ فرخندہ بنیاد کے صدر مہتمم تعلیمات ہیں۔ اس جگہ آنے سے پہلے آپ صوبہ گلبرگہ کے صدر مہتمم اور سررشتہ تعلیمات کے انتظامی عہدہ پر آنے سے قبل آپ نظام کالج میں پروفیسر تھے۔ آپ کا تدریسی اور انتظامی تعلیمی تجربہ وسیع ہے اور آپ نے اپنے فرائض منصبی کو جس انہماک، مستعدی اور قابلیت سے انجام دیا ہے اس کا پتہ سررشتہ تعلیمات کی سالانہ رپورٹوں سے چلتا ہے۔

ایک بڑی کام کی خصوصیت آپ کی یہ ہے کہ آپ نے انگلستان میں تعلیم حاصل کی اور اس کے ساتھ ہی وہاں کے بہترین کلچر کو جذب کیا اور جذب کرنے کے بعد اور زیادہ ہندوستانی ہوگئے ان معنوں میں کہ اپنے وطن اور ابنائے وطن کی خدمت کو اپنی زندگی کا اصلی نصب العین قرار دیا۔ اس خصوصیت کی طرف ہم نے خاص طور پر اس لئے اشارہ کیا ہے کہ جن خوش نصیب ارباب کو انگلستان میں رہ کر تعلیم پانے اور وہاں کی شائستہ تمدنی قوتوں سے دوچار ہونا پڑا ہے وہی احباب ہندوستان

کی تعلیمی حالت کی اصلاح میں کار آمد حصہ لے سکتے ہیں۔

اس مضمون سے قارئین کو بہت سے کار آمد خیالات ملیں گے اور چونکہ ا۔ عام رجحان زمانہ کے تیور دیکھکر اس جانب ہو چلا ہے کہ پیشہ وری کی تعلیم کی داغ بیل ہی نہیں بلکہ اس قسم کی تعلیم کو بہت جلد ہندوستانی طلبہ کے لئے کافی طور پر فراہم کیا جائے یہ مضمون دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

شیرمک مدیر

تعلیم کی غایت یہ ہے کہ ہمارے قوائے جسمانی، دماغی اور اخلاقی کو ایسی تربیت ترقی اور نشو و نما حاصل ہو کہ آیندہ چل کر ہم اپنے اور اپنے ملک اور قوم کے لئے مفید ثابت ہو سکیں اس مقصد کی تکمیل کے لئے منجملہ اور امور کے ایک ضروری امر یہ ہے کہ نظام تعلیم ملک کے تمدنی اور معاشی حالات کے مطابق ہو۔

یورپ اور امریکہ کے عروج الحال ہونے کی وجہ یہی نہیں ہے کہ وہاں خواندہ اور ڈگری یافتہ لوگوں کی کثرت ہے بلکہ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہاں طلبہ کو اُن کی آیندہ زندگی کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور والدین ابتدا ہی سے اپنے بچوں کا رجحان معلوم کرنے کی اور اُس کے مطابق اُن کو تعلیم دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یونی ورسٹی کی تعلیم صرف وہی چند مخصوص لڑکے حاصل کرتے ہیں جو کہ اپنے مقصودوں کے لحاظ سے اس کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں اور جن میں ایسی اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے جن پیشوں پر کہ ملک کی ترقی کا دارومدار ہے ان کی تعلیم کا خاص انتظام ہے اور فنی تعلیم کو وہی عزت، وقار اور ہر دلعزیزی حاصل ہے جو کہ محض ادبی تعلیم کو حاصل ہے۔

ہندوستان میں عموماً اور حیدرآباد میں خصوصاً بہت کم ایسے طلبہ جو کہ یہ فیصلہ کر کے تعلیم پاتے ہوں کہ وہ اپنی آیندہ زندگی میں کیا کام کریں گے۔ اکثر لڑکوں کے ذہن میں صرف یہی بسا ہوتا ہے کہ کسی طرح ڈگری مل جائے اور چونکہ وہ ایسی تعلیم حاصل

کرتے ہیں کہ وہ بجز سرکاری ملازمت کے اور کسی کام کے اہل نہیں ہوتے۔ اس لئے اُن کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہوتے ہی سرکاری دفاتر میں ملازمت کیلئے ان کی درخواستوں کی بوچھاڑ شروع ہوتی ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے طلبہ سرکاری ملازمت کیلئے بھی تیاری نہیں کرتے اور پہلے سے یہ سوچ نہیں لیتے کہ وہ کونسے سررشتہ کیلئے مفید ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ باوجود سررشتہ تعلیمات کے اس اعلان کے کہ سررشتہ کی ضروریات کے مدنظر صرف ایسے امیدواروں کی درخواستیں قبول کی جاسکتی ہیں جو کہ مدارس ثانویہ میں سائنس اور ریاضی کی تعلیم دے سکیں نو فیصدی گراجیوٹس اور انڈر گراجیوٹس جو کہ سررشتہ تعلیمات میں ملازمت اختیار کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں سائنس اور ریاضی سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اسی طرح میں بعض ایسے طلبہ سے بھی واقف ہوں جو کہ منطق اور تاریخ کے ساتھ امتحان انٹرمیڈیٹ کامیاب کرنے کے بعد تمنی اور کوشاں ہیں کہ سررشتہ جنگلات میں ان کو کوئی جگہ مل جائے۔ علاوہ بریں سرکاری ملازمت کا دائرہ محدود ہے اور ہر ایک سررشتہ میں یہ حالت ہے کہ جائدادیں کم اور امیدوار زیادہ ہیں۔ بلکہ اب تو یہ مشکل پیدا ہوگئی ہے کہ صرف انڈر گراجیوٹس بلکہ ڈگری یافتہ اشخاص کو (سو) روپیہ کی جگہ بھی آسانی سے نہیں ملتی۔

بہرحال باوجود تعلیم پر سالانہ ایک کثیر اور وافر رقم صرف ہونے کے ملک کے افلاس میں کوئی کمی نظر نہیں آرہی ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ محض نظری اور ادبی تعلیم ملک کی ترقی کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ پیشوں کی طرف بھی توجہ کرنا اور اُن کی تعلیم کا مناسب انتظام کرنا ضروری ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ملک کے نوجوان تعلیم یافتہ اشخاص کے لئے علاوہ سرکاری ملازمت کے دیگر ذرائع معاش پیدا کرنے کی فکر کی جائے۔ ہمارے ملک میں وکلاء اور اطباء کی تعداد تو خاصی ہے بلکہ وکلاء ضرورت سے زیادہ ہیں لیکن دوسرے پیشوں کو جن پر کہ ملک

کی معاشی ترقی کا بلا واسطہ انحصار ہے عام طور پر ذلت و خواری کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ عزت ہے تو بس سرکاری ملازمت میں ہے حتیٰ کہ خود پیشہ ور لوگوں کی اولاد تھوڑی بہت مشکل تعلیم حاصل کرنے کے بعد کسی پیشہ کو اختیار کرنا اپنے لئے ننگ و عار سمجھنے لگتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم سے بجائے ذرائع معاش وسیع ہونے کے اور زیادہ تنگ ہوتے جارہے ہیں۔

صنعت و حرفت اور زراعت کی ترقی کیلئے تعلیم کی ضرورت

ہندوستان میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ جسمانی کام کرنے والے تعلیم کی ضرورت کو محسوس نہیں کرتے اور دماغی کام کرنے والوں کو جسمانی کام سے نفرت ہے۔ سر ٹی ہالینڈ کا یہ مقولہ بالکل درست ہے کہ "ہندوستان میں تعلیم اور صنعت و حرفت کے مابین ایک وسیع خلیج حائل ہے جسمانی محنت کرنے والے جاہل ہیں اور تعلیمیافتہ افراد جسمانی محنت سے قاصر ہیں"

اس اختلاف علم و عمل کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو تعلیمیافتہ طبقہ پیشوں کو ذلیل و خوار سمجھتا ہے اور دوسری طرف جسمانی کام کرنے والے طبقہ میں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ پیشہ کیلئے جس مہارت کی ضرورت ہے وہ نسل در نسل چلتی ہے اور جو کچھ آبا و اجداد سے چلا آیا ہے وہی کافی ہے پھر تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ اس خیال کی غلطی بالکل عیاں ہے اسلئے کہ باپ صرف اسی قدر سکھا سکتا ہے جس قدر کہ وہ خود جانتا ہے۔ مہارت میں اضافہ کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ لیکن زمانہ ایک حالت میں نہیں رہتا۔ احتیاجات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لوگ نئی نئی چیزوں کے شائق ہوجاتے ہیں۔ نئی نئی خام پیداوار دریافت ہوتی رہتی ہے۔ آلات و اوزار کے ذریعہ سے وقت، محنت اور مصارف میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ پرانی صنعت کی چیزیں متروک ہوتی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے دستکار عموماً ان تبدیلیوں سے ناواقف ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہی چیزیں بنتی ہیں جو پہلے بنتی تھیں اور وہ بالکل

اُسی طرح تیار ہوتی ہیں جیسا کہ پہلے تیار ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کا ریشم اولاً چین کے ہاتھ کے بنائے ہوئے ریشم اور بعد میں یورپ اور امریکہ اور جاپان کے مشین بنائے ہوئے ریشم کا مقابلہ نہ کر سکا۔ فن زراعت میں بھی زمانہ کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں۔ پرانی فصلیں متروک ہو کر نئی نئی چیزیں کاشت ہوتی ہیں اور پیداوار میں اضافہ کرنے کی غرض سے نئے نئے آلات و اوزار سے کام لیا جاتا ہے بہرکیف خواہ زراعت ہو یا صنعت و حرفت یا تجارت۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ لڑکے اپنے والدین سے بھی کام سیکھیں اور تعلیم کے ذریعہ سے نئے طریقوں اور چیزوں کو بھی معلوم کریں تاکہ جو چیزیں مطلوب ہیں ان کو وہ اُسی عمدگی سے تیار کر سکیں جیسا کہ اُن کے باپ دادا پرانی وضع کی چیزوں کو تیار کرتے تھے۔ تعلیم کی بدولت ان لڑکوں میں استقلال، سلیقہ، ایمانداری، جفاکشی اور کفایت شعاری کی صفات پیدا ہونگی اور نہ صرف اُن کی آمدنی میں بلکہ ملک کی دولت میں بھی اضافہ ہوگا۔

ابتدائی تعلیم تو ہر ایک کام کیلئے ضروری ہے لیکن فنی تعلیم کو کامیاب بنانے کیلئے اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ پرائمری جماعتوں میں دستی مشاغل کی جانب خاص توجہ کی جائے۔ دستی مشاغل فنی تعلیم کی بنیاد ہیں۔ کیونکہ اگر شروع ہی سے طلبہ کے ہاتھوں اور آنکھوں کو تربیت نہ دیجائے تو آئندہ ان کو کسی فن کے سیکھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ دستی مشاغل سے طلبہ میں چستی اور چالاکی پیدا ہوتی ہے۔ ان کی ذہنی تربیت میں مدد ملتی ہے۔ ان کی قوت مشاہدہ کی نشوونما ہوتی ہے۔ ہر کام کو صحت کے ساتھ کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ قوائے اختراعیہ کو ترقی ہوتی ہے۔ نیز دستی کام مضامین مدرسہ میں تنوع کا باعث ہو کر طلبہ کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ تازہ دم اور بشاش ہو کر مطالعہ میں اور بھی زیادہ شوق دکھاتے ہیں۔ دماغی کام کا تکان رفع ہوتا ہے اور مدرسہ سے جی نہیں اُکتا جاتا۔ اس سے دوسرے مضامین کی تعلیم میں

مدد ملتی ہے اور جو لڑکے دوسرے مضامین میں ترقی نہیں کرتے اُن کے لئے مدرسہ میں ایک ایسا کام مہیا ہو جاتا ہے جس میں کہ وہ اپنی مہارت بتا سکتے ہیں۔ ان فوائد کے علاوہ دستی مشاغل کے دو نہایت اہم فوائد حسب ذیل ہیں۔

(۱) جسمانی کام اور دستکاری سے عام طور پر جو نفرت ہے وہ دور ہو جاتی ہے

(۲) بچوں کے رجحان طبع معلوم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ہر ایک طالب علم عالم و فاضل نہیں ہو سکتا۔ کوئی مدرسہ ایسے طلبہ سے خالی نہیں ہے جو کہ حافظہ کی کمزوری یا ذہن کی سستی کی وجہ سے اپنی جماعت میں خاطر خواہ ترقی نہیں کرتے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ ایسے لڑکے چند سال کے بعد تعلیم ترک کر کے قلیل تنخواہ پر کہیں ملازم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے لڑکوں میں چند ایسی قوتیں ہوتی ہیں کہ اگر ان کی نشو و نما ہوتی تو یہ لڑکے ایک معقول معاش پیدا کرنے کے قابل ہوتے اور ملک کو بھی ان سے بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ ہمارے ہاں کے ہائی اسکولوں اور کالجوں میں سینکڑوں ایسے طلبہ ہیں جو کہ درحقیقت اعلےٰ تعلیم پانے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ نہ صرف ان لڑکوں کیلئے بلکہ ملک کیلئے یہ زیادہ مفید ہوتا کہ ابتدا ہی میں ان کا رجحان معلوم کر کے اسکے اعتبار سے ان کو کسی فن یا پیشہ کی تعلیم دی جاتی

ممالک محروسہ سرکار عالی میں صنعتی تعلیم کا انتظام

دستکاری کا سکھانا اور چیز ہے اور کسی خاص فن کی تعلیم اور شے اور چیز ہے۔ خاص خاص فنون کی تعلیم کا انتظام معمولی مدارس میں ممکن نہیں ہے۔ ان کے لئے فنی اور صنعتی مدارس کی ضرورت ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں صرف سات صنعتی مدارس ہیں جو بالکل ناکافی ہیں۔ حیدرآباد میں تین اورنگ آباد نظام آباد بیدر اور ناراین پیٹھ میں ایک ایک۔ اگر ڈکٹوریہ میموریل آرفینج سرور نگر کو اس کے خاص حالات کے لحاظ سے قطع نظر کیا جائے تو ان طلبہ کی تعداد جو صنعتی تعلیم حاصل کر رہے ہیں پانچ یا چھ سو

سے زیادہ نہیں ہے۔ نظام آباد، بیدر اور نارائن پیٹھ کے۔ ارس کے اخراجات تو کنفنڈ سے ادا ہوتے ہیں۔ ان مدارس کی موجودہ حالت قابل اطمینان نہیں ہے۔ انکی ضروریات کو پورا کرکے ان کو کامیاب بنانے کی سعی کرنی چاہئے۔ علاوہ بریں ممالک محروسہ سرکار عالی میں دوسرے بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں کہ صنعتی مدارس کے قیام کی ضرورت ہے مثلاً اضلاع ورنگل اور عادل آباد کے بعض مقامات پر لکڑی کا نہایت عمدہ کام ہوتا ہے لیکن ان اضلاع میں کوئی صنعتی مدارس نہیں ہیں جہاں کاریگروں کے لڑکوں اور دیگر طلبہ کو جن کا رجحان اس کام کی طرف ہے جدید اصول اور طریقوں کے مطابق نجاری سکھائی جاسکے۔ اسی طرح ضلع بیڑ میں دھات اور ضلع کریمنگر میں چاندی کے کاریگروں کے بچوں کی تعلیم کیلئے صنعتی مدارس کے قیام کی ضرورت ہے۔

صنعتی مدارس کی کامیابی کے شرائط

صنعتی مدارس ایسے ہی مقامات پر قائم کرنے چاہئیں جہاں صنعتی روایات موجود ہوں اور ہر ایک مدرسہ میں اسی صنعت کو سکھانے کا انتظام کرنا چاہیئے جسکی طلب ہو اور جو مقامی حالات کے اعتبار سے موزوں ہو۔ کسی خالص زرعی مقام پر جہاں کسی مخصوص صنعت کا رواج نہ ہو صنعتی مدرسہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔

محض صنعتی مدارس کے افتتاح سے حصول معاش اور ملک کی اقتصادی ترقی کے مسئلے حل نہیں ہوسکتے۔ ان مدارس کی کامیابی کے لئے پہلے تو اس امر کی ضرورت ہے کہ دارالسلطنت میں اعلیٰ پیمانہ پر ایک ٹریننگ کالج قائم کیا جائے تاکہ واقف اور ماہر اساتذہ پیدا کئے جاسکیں۔ ثانیاً عام مدارس میں دستی مشاغل کی طرف خاص توجہ کیجائے تاکہ عام طور پر جسمانی کام سے جو نفرت ہے وہ دور ہوسکے اور جن طلبہ کا رجحان صنعتی تعلیم کی طرف ہے اُن کو ابتدا ہی سے اس کے لئے تیار کیا جاسکے۔ تیسری اور سب سے اہم شرط یہ ہے کہ صنعتی تعلیم گاہوں کے ساتھ ساتھ صنعت وحرفت کو ترقی دیجائے اور نئے نئے کارخانے بھی قائم کئے جائیں تاکہ صنعتی مدارس کے طلبہ کو عملی کام سیکھنے کا کافی موقع ملے

اور بعد فراغ تعلیم ان کو کسب معیشت میں بھی سہولت ہو۔ اگر صنعتی مدارس کے افتتاح پر اکتفا کر کے کارخانوں کے قیام اور اُن کی ترقی کے لئے کوشش نہیں کی جائے گی تو اندیشہ ہے کہ صنعتی فارغ التحصیل طلبہ کا بھی وہی مایوس کن حشر ہوگا جو کہ آج کل یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ گروہ کا ہو رہا ہے۔

پس ان مصنوعات کی ترقی کے لئے جو کہ ملک کے مناسب حال ہیں سررشتہ صنعت و حرفت کو جد وجہد کرنی چاہئے اور یونیورسٹی کو بھی چاہئے کہ صنعتی کیمیا (انڈسٹریل کیمسٹری) کی تعلیم کا خاص طور پر انتظام کر کے اس بارہ میں سررشتہ صنعت و حرفت کا ہاتھ بٹائے

زراعتی تعلیم صنعتی تعلیم پر زور دینے سے میرا منشا یہ نہیں ہے کہ ہندوستان کی اقتصادی فطرت سے قطع نظر کر کے اس کو مثل دوسرے صنعتی ممالک مثلاً انگلستان و جاپان کے خالص صنعتی ملک بنا دیا جائے۔ ہندوستان کے حالات اُن ممالک سے جدا ہیں اور جہاں تقریباً زائد از اسّی فی صدی باشندوں کا پیشہ زراعت ہے وہاں زراعت کی ترقی کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ دیہی مدارس میں زراعت کے ابتدائی اصول سکھائے جائیں اور زراعت کی عملی تعلیم جدید طریقوں پر دیجائے۔ عملی تعلیم بغیر زمین کے نہیں دی جاسکتی اور آراضی کے مہیا کرنے کے لئے سررشتہ تعلیمات کو سررشتہ مال کی امداد کی ضرورت ہے۔ سردست اگر فی تعلقہ ایک مدرسہ میں بھی زراعتی تعلیم کا انتظام ہو جائے تو زراعت کو بہت کچھ ترقی ہو سکتی ہے۔

اس کے ساتھ چند مختص الفن مدارس کی بھی ضرورت ہے تاکہ دیہی مدارس میں زراعت کی باقاعدہ تعلیم دینے کیلئے اساتذہ بہم پہونچ سکیں۔

گو فن زراعت کی تعلیم صنعت و حرفت کی تعلیم سے کم اہمیت نہیں رکھتی ہے تاہم ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے یہ نہایت ضروری ہے کہ زراعت پیشہ طبقہ کسی نہ کسی صنعت سے ضرور واقف ہو۔ زراعت کا انحصار تمام تر بارش پر ہے

جس پر انسان کو کوئی قابو نہیں۔ جب جب ضرورت بارش نہیں ہوتی ہے تو زراعت پیشہ کو سخت نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے بلکہ اکثر فاقہ کشی کی نوبت آجاتی ہے۔ زراعت پیشہ کو کافی فرصت ملتی ہے اور اگر وہ اپنی فرصت کے گھنٹوں میں گھر پر کوئی صنعتی کام کیا کرے تو پھر قحط کے زمانہ میں اس کو فاقہ کشی کا کوئی خوف نہیں ہو سکتا کیونکہ بارش نہ ہونے کی صورت میں وہ صنعت کے ذریعہ سے معاش پیدا کر سکتا ہے اور اگر بارش ہو تو کھیتی باڑی سے جب کبھی اس کو فرصت ملے وہ صنعتی کام میں مشغول ہو کر اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکتا ہے۔

گو اہل بصیرت یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ محض ادبی تعلیم سے کسی کا افلاس دور نہیں ہو سکتا لیکن عام طور پر طلبہ اور اُن کے والدین میں اس کا بہت کم احساس ہے پس مدرسین کا فرض ہے کہ وہ طلبہ کے دلوں میں پیشہ کا وقار پیدا کرنے کی کوشش کریں اور ہر ایک طالب علم کے والدین کو بھی چاہیئے کہ وہ اس کو اعلےٰ ادبی تعلیم صرف ایسی حالت میں دلوائیں جب کہ اُس میں ایسی تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت اور قابلیت ہو ورنہ حسب ضرورت ادبی تعلیم دلانیکے بعد اُسکے رجحان کے مطابق اسکو کوئی پیشہ سکھایا

رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

شمالی ہند کا نامی گرامی تعلیمی رسالہ بیس سال سے پوری شان و شوکت کے ساتھ شہر لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔ اسکی خوبیاں اسکے مطالعہ سے ظاہر ہو سکتی ہیں قیمت سالانہ تین روپیہ کلاں حجم ماہانہ (۱۲۰) صفحہ

ملنے کا پتہ

ماسٹر جگت سنگھ پروپرائٹر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

تبصرہ

نورس

اورنگ آباد انٹر میڈیٹ کالج سے یہ دو ماہی رسالہ شائع ہوا ہے۔ وضع قطع موہنی اور ٹائپ واضح اور ستھرا ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں یہ اپنی نوعیت کا دوسرا رسالہ ہے۔ پہلا رسالہ نظام کالج میگزین ہے جو شائع ہوا بند ہوگیا اور اب پھر شائع ہوا ہے۔ لیکن طباعت کی عمدگی وضع قطع کے حسن میں نورس اپنی آپ نظیر ہے۔ یہ دراصل طلبہ کا ایک رسالہ ہے اور جیسا کہ قابل مدیر صاحب نے ایک جگہ ذکر کیا ہے مقصود یہ ہے کہ طلبہ کی تربیت کے بعد یہ رسالہ رفتہ رفتہ بالکل انھیں کے ہاتھ میں دیدیا جائے گا۔

حیات کی سرگرمی محض اظہار ذات ہے۔ ہر انسانی کام روح کے ایک یا کئی پہلوؤں کو معرض ظہور میں لاتا ہے۔ اعلےٰ اور سچی تعلیم وہی ہے جو طلبہ کو اظہار ذات کا اہل بنائے یعنے ان کی روحوں کو بھچا بھچا نہ رہنے دے اور ان کے نفوس کو اظہار کی رکاوٹوں سے نجات دلائے۔ نفس کی ہر لہر کا مقصود اصلی یہ ہے کہ وہ اعصاب اور اعضاء کے وسیلہ سے خارجی عالم میں دوسرے نفوس سے دست و گریباں ہوجائے۔ اپنے آپ کو دوسرے نفوس تک پہونچائے اور پھر وہاں بھی ختم نہ ہو بلکہ ان نفوس میں بھی ہیجان پیدا کردے۔

ناقص تعلیم گھریلو ہو یا مکتبی، ہندوستانی ہو یا انگلستانی دل و دماغ کو گھولتی نہیں بہت سے تعلیم یافتہ آپ کو ایسے ملیں گے جنھوں نے بے گنتی کتابیں چاٹ لی ہیں اور بعض تو ایسے لوگ بھی ہیں جو خط کتابت میں خوب خامہ فرسائیاں کرتے

ہیں اور بات چیت میں خوب کھیل کھیلتے ہیں لیکن چھاپہ کی صورت میں اظہار خیال کرتے بغلیں جھانکتے ہیں۔ بعض تو واقعی ایسے ہوتے ہیں کہ فطری طور پر اظہار ذات میں ان کے انجان نے بڑے بڑے روڑے اٹکا دئے ہوتے ہیں جن کو مدرسہ کی تعلیمی نظام ہٹا نہیں سکتا۔ بعض طلبات مطالعہ کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ لکھنے کی عادت نہیں پیدا کرتے اور قلم دوات سے جی چراتے ہیں۔ چند ایسے لوگ بھی ہیں جو زعم میں اپنے آپ کو بہت ہی لائق فائق سمجھتے ہیں اور لکھنے سے اس لئے پرہیز کرتے ہیں کہ وہ دنیا کو مکمل چیز ——— ایسی چیز دینی چاہتے ہیں جس پر ہر طرف سے واہ واہ ہو اور کوئی نکتہ چینی نہ کر سکے۔ ایسے لوگ اپنے عقیدتمند ارباب کے مختصر حلقے میں بہت ہی قابل سمجھے جاتے ہیں لیکن انکی عجیب و غریب قابلیت سے دنیا محروم رہتی ہے۔

کالجوں کی تعلیم میں قلم اور زبان سے اظہار ذات بڑی چیز ہے۔ درسی کتابیں محض ایک طرح کی معاون ہوتی ہیں۔ استادوں کے لکچر بھی سوائے خاص صورتوں کے طلبہ کے دماغ کو جگانے کے بجائے سلا دیتے ہیں ——— پکی پکائی ہنڈیا انکے سامنے رکھ دیتے ہیں اور طلبہ ذہنی منصبدار اور واحدی بن جاتے ہیں۔

کالج میں اصلی تعلیم کی صرف تین چیزیں ہیں۔ انجمن مباحثہ تجربہ خانہ اور کالج کا رسالہ تعلیمی جماعتیں اظہار ذات کی ان بڑی سرگرمیوں کی محض معاون ہونی چاہئیے۔ تجربہ خانہ محض ان معنوں میں نہیں کہ کتابی تجربوں کو کامیابی سے کر لیا جائے۔ نہیں ذاتی تجربے اور ان تجربوں کی ناکامیابیاں اور پھر مستقل مزاجی اور تلاش کا بدستور قائم رہنا۔ یہ چیزیں تجربہ خانہ میں اظہار ذات کی اعلےٰ صورتیں ہیں۔ کالج کے رسالہ میں طلبہ کو اظہار ذات کا بہترین موقع مل سکتا ہے اور ان کو ایسی تربیت دی جا سکتی ہے کہ تنقید کو سکیں اور ذاتیات سے علیحدہ ہو کر خود تنقید کر سکیں۔

بعض لوگ جیسا کہ ابھی عرض کیا ہے اپنی چیزیں دنیا کے سامنے محض اس لئے پیش نہیں کرتے کہ کہیں اعتراض نہ ہو جائے ایسے لوگ یا تو اپنے دماغ میں سڑے ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں اور یا تنقید سے بری طرح مرعوب ہوتے ہیں۔ کالج کے رسالہ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے بد دماغی اور ذہنی بزدلی دونوں باتوں سے جوان دماغ بچ سکتے ہیں۔ جو امتحان اوپر گزر رہے ہے اسے صحیح مان لینے کے بعد کالج کے رسالوں کی تعلیمی زبردست اہمیت واضح ہو جاتی ہے ہمیں توقع ہے کہ نورس نے ممالک محروسہ کے کارعالی کی تعلیمی سرگرمی میں جس باب کو اس عمدگی سے کھولا ہے اس کے اثرات دور رس ہونگے اور اس کا پھل یہ ہوگا کہ ہمارے ماں کی اٹھتی پود کو قلم پر زیادہ دسترس ہو جائے گی۔

نورس کے پہلے اور دوسرے نمبروں میں سب مضمون دلچسپ ہیں اور پہلے نمبر میں طلبہ کے دو مضمون بہت ہی اچھے ہیں۔ دوسرے نمبر میں مولی ایر کے ایک کھیل نکاح بالجبر کو بڑی ہی عمدگی سے اپنایا گیا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ ظرافت کے دیوتا کی اس چیز کو بالکل اپنا کر لیا گیا ہے۔ علامہ خجندی مرنے کیلئے پیدا نہیں ہوئے ہیں یہ اردو ادب میں ڈان کگ زوٹ اور مسٹر پک وک کی طرح ہمیشہ ہنساتے رہیں گے۔ جناب جوش صاحب کی نظم بھٹکی ہوئی نیکی ایک اور جیتی جاگتی چیز ہے جو بندش کی لطافت اور مضمون کی ندرت اور صداقت کے لحاظ سے واقعی ایک شہپارہ ہے۔ دونوں نمبروں میں جو علمی شذرے دئے گئے ہیں وہ بلحاظ معلومات اور اسلوب داد کے قابل ہیں۔ ان دونوں نمبروں میں نورس نے جو کہنے کو ایک انٹرمیڈیٹ کالج کا رسالہ ہے اردو کی خدمت کی جو اُفتاد ڈالی ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ رسالہ اگر مالی اور دیگر حالات اس کے مساعد رہیں تو کس قدر سونہا ہے۔ دوسرے نمبر میں من کی موج، ایک مستقل سُرخی قائم کی گئی ہے اور اس کے

تحت ظریفانہ تحریریں شائع ہوں گی۔ اردو ادب اس قدر روکھا ہو گیا ہے کہ ہنس مکھ پہلو کو ابھارنے اور اجاگر کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں سے مخفی والے قلم بگیمارت کی زبان میں "نین مٹکے" سے ہو گئے ہیں۔ من کی موج کے تحت ہمیں امید ہے کہ زندگی کی لہروں کی بالائی سطح کو ہلکے پھلکے اسلوب میں پیش کیا جائے گا اگر من کی موج میں ذرا سا بھی غوطہ لگایا گیا تو پھر ہمیں اندیشہ ہے کہ ــــــ روکھا پن تو پیدا نہ ہو گا ــــــ لیکن ہنسی کی دیوی کی نقرئی گھنٹیوں والی کھل کھلاہٹ ضرور باقی نہیں رہے گی۔ من کی موج کو ہم لندن پنچ کا ہمرنگ دیکھنا چاہتے ہیں۔

نرس ہمارے ہاں کے مدارس کے لئے ایک سبق آموز اور بڑی بات یہ ہے کہ حوصلہ افزا رسالہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے مدارس میں اس کی خریداری ذوق و شوق سے ہو گی تاکہ ایک طرف ہماری مدرسہ جانے والی آبادی میں حوصلے پیدا ہوں اور ان کی معلومات میں اضافہ ہو اور دوسری طرف اپنے ملک اور اپنے ایک ہونہار کالج کی عمدہ اور نفیس دینی اور صحیح معنوں میں تعلیمی کوشش مالی پہلو سے پائدار ہو جائے۔

شریک مدیر

شذرات

ماہ اسفندار کا المعلم بھی ضروری تعلیمی مضامین کی وجہ سے دیر اشائع کیا گیا تھا اس لئے کہ یہ مناسب نہیں سمجھا گیا کہ ضروری مضامین اور تعلیمی تبصروں کی اشاعت میں اتنی دیر کی جائے کہ مضامین باسی ہو کر پھیکے اور بے رونق ہو جائیں ماہ فروردی میں نواب حیدر نواز جنگ بہادر کا یادگار اور معرکۃ الآرا خطبہ کا پورا ترجمہ دینا اس لئے ضروری تھا کہ اس خطبہ میں نواب صاحب ممدوح کے تعلیمی

تجربہ رکھتا ہے۔ چونکہ اسٹنڈرڈ کا پرچہ بھی دہرا تھا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ذوردی اور اردی بہشت کی اشاعت کو ایک کر دیا جائے۔ قارئین کرام کی خدمت میں بھی گویا تین مہینوں میں پانچ نمبروں کا مواد مل جائے گا۔ المعلم تو جی سے چاہتا ہے کہ اپنے مواد کو کتنا چوگنا کر دے لیکن ابھی اس کے مالی حالات ان بلند منصوبوں کے مساعد نہیں ہیں۔

المعلم کے ہمدردوں کے لئے یہ بات باعث مسرت ہوگی کہ بمبئی کے سکریٹری ڈیرکٹر اسکولز کمیٹی نے اس سال بطور خاص المعلم کو اپنے تحت کے مدارس میں جاری فرمایا ہے۔ ہم اس عنایت کے شکر گزار ہیں اور امید ہے کہ المعلم کے مضامین سے بمبئی پریسیڈنسی اسکولوں کے اساتذہ کو اپنے فرائض منصبی کی ادائی میں کافی مدد ملے گی اور تعلیمی مسائل میں ان کی نظر وسیع ہوگی۔

تازہ ترین اعداد و شمار مظہر ہیں کہ ہندوستان میں ہر سال پندرہ لاکھ بچے مرتے ہیں یا بالفاظ دیگر ہر مہینہ پینتیس ہزار یا ہر روز پانچ ہزار معصوم بچے شکار اجل بنتے ہیں

غریب زچاؤں کی شرح اموات بھی بچوں سے کچھ کم نہیں ہے۔ ہر ہزار زچاؤں میں سات فوت ہوتی ہیں۔ بہ خلاف اس کے انگلستان میں دو ہزار زچاؤں میں صرف ایک فوت ہوتی ہے۔

لندن کے عجائب گھر میں ایسی مچھلی موجود ہے جو اپنی ایک خصوصیت کی وجہ

تھنڈر فش یعنی گرج مچھلی کہلاتی ہے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ مچھلی عموماً کیچڑ میں دبی پڑی رہتی ہے لیکن بجلی کے کڑکنے اور بادل کے گرجنے سے چوبیس گھنٹہ قبل کیچڑ سے نکل کر نہایت تیزی و بیقراری کے ساتھ سطح آب پر تیرنے لگتی ہے اور طوفان کی خبر دیتی ہے۔

کیپٹن ٹیاول نے "مسئلہ افلاس" پر تقریر کرتے ہوئے یہ تجویز کی کہ تعلیم یافتہ لوگوں کا افلاس اور بے روزگاری "تعلیمی کالونی" یعنی تعلیم یافتہ اشخاص کے کسی غیر آباد مقام پر جمع ہو کر کھیتی باڑی اختیار کرنے سے دور ہو سکتی ہے۔ متوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگوں کی بے روزگاری کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ سوائے سرکاری ملازمت کے دوسرا پیشہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔

انگلستان کے ایک مشہور ڈاکٹر کی رائے ہے کہ خالص شہد گوشت کے شوربہ اور یخنی سے زیادہ مفید ہے۔ تھکے ماندے مدرسین جن کے قوا کمزور ہو گئے ہوں شہد کا استعمال کریں تو بہت فائدہ مند ثابت ہوگا۔

کئی سال کی کوشش کے بعد بیدر میں جہاں محمود گاواں کے مدرسہ محمودیہ نے برسوں علم کے دریا بہائے بوجہ انضمام مدرسہ فوقانیہ و وسطانیہ پھر اس کی یاد اور کارنامے تازہ کرنے کا سامان ہو گیا ہے۔

مسلم یونی ورسٹی کی طرف سے نواب عماد الملک بہادر کو ڈاکٹر آف لیٹرچر کی ڈگری دی گئی ہے

شمع

یہ شمع نہایت آب و تاب سے [illegible] ہے لکھائی چھپائی کاغذ غرض ہر لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے ہر ضمون مذہب، مجرک خیال اور معلومات جدیدہ کا بہترین نمونہ ہوتا ہے اور تاریخی سیاسی و اقتصادی و ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کے مقاصد علمی و ادبی ہیں۔ لائق مدیران شمع مسٹر محمد صیب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ و مسٹر حسن عابد جعفری (آکسن) بیرایٹ لا آگرہ ہیں۔ یہ حضرات بہترین تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ اعلےٰ درجہ کے نقاد اور ادیب ہیں اور فن اخبار نویسی سے واقف ہیں اور ادبی و علمی خدمت کی آرزو میں رسالہ کی ترتیب میں مصروف ہیں اور اس میں کوئی ذاتی فائدہ شامل نہیں اور نہ کسی تجارتی اصول پر اس کو پیش کرنا چاہتے ہیں شمع ہر ماہ میں پابندی وقت سے شائع ہوتا ہے۔ تصاویر بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حجم (۱۱۲) صفحہ قیمت سالانہ لے نمونہ کا پرچہ ۱۰

منیجر صاحب رسالہ شمع حسن منزل شاہ گنج آگرہ سے طلب فرمایئے

اخبار تعلیم لاہور

ہر قسم کے تعلیمی معاملات پر آزادانہ بحث کرنے والا مدرسین کا وکیل اور ترجمان طلبہ کا معاون و مددگار، افسران محکمہ تعلیم کا خیر خواہ، سررشتہ تعلیم کا مشیر، ہر قسم کے علمی، اخلاقی طبی وغیرہ مضامین کا مخزن ہفتہ وار اخبار تعلیم لاہور سے شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ چار روپیہ ششماہی دو روپیہ آٹھ آنہ سہ ماہی ڈیڑھ روپیہ

منشی طالب علی صاحب پانڈ قریشی ایڈیٹر اخبار تعلیم لاہور سے طلب کیجئے

*

دی حیدرآباد بک ڈپو

توپکا سانچہ حیدرآباد دکن

ہمارے پاس ہر قسم کی جدید و قدیم انگریزی و اردو کتب کا بہترین ذخیرہ ہے۔ ہم نے ایسا انتظام کیا ہے کہ تازہ ترین کتب شائع ہوتے ہی ہمارے پاس سے دستیاب ہوسکتی ہیں۔ ہماری قیمتیں بہت کم ہیں۔ جو کتاب بمبئی یا مدراس وغیرہ میں ۴ ار کلدار کو ملتی ہے وہ ہم بلا لحاظ نرخ کلدار ـــــ ۶ سکہ عثمانیہ میں فروخت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس صادر کا بہترین سامان ہے۔ قسم قسم کے پنسل، کاغذ داب لفافہ کاغذ ببر چاک، سامان ڈرائینگ، نقشہ جات وغیرہ وغیرہ موجود ہیں۔

مدارس کے ساتھ خاص رعایت کی جاتی ہے۔ براہ کرم اپنی ضروریات سے مطلع فرمائیے اور استفسار کرنے میں تامل نہ فرمائیے۔ ہماری دکان پر ایک دفعہ تو ضرور تشریف لائیے رفاہ عام کی غرض سے ہم نے نشست و برخاست کا بھی معقول انتظام کیا ہے۔ شائقین علم و ادب ہماری دکان پر تشریف لاکر ہر قسم کی کتابوں کا بلا معاوضہ مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

دی حیدرآباد بک ڈپو توپکا سانچہ حیدرآباد دکن

۷۸۶

رجسٹرڈ پیسہ اخبار انگریزی و عربی نشان سلطنت

جریدہ پیسہ اخبار عالی نشان سلطنت

جلد دوم

نمبر ۱۰

المعلم

ع

خورداد سنہ ۱۳۳۵ فصلی

مدیر ..... محمد سجاد مرزا ایم۔ اے (کنٹب) .....

شریک مدیر ..... محمد عظمت اللہ خاں بی۔ اے .....

اعظم اسٹیم پریس چاپینا

حیدرآباد دکن

*

قواعد

(۱) یہ محض تعلیمی رسالہ ہے جس میں تعلیم کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہونگے سیاسی یا مذہبی مضامین شریک نہ کئے جائیں گے

(۲) یہ رسالہ ہر ماہ فصلی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا

(۳) پرچہ وصول نہ ہو تو ہر ماہ فصلی کی ۲۵ تاریخ تک خریدار صاحبان بحوالہ نمبر خریداری مطلع فرمائیں

(۴) جو مضامین ناقابل طبع متصور ہوں گے ان کی واپسی خریدہ ڈاک کی روانگی پر منحصر ہوگی

(۵) اس رسالہ کی قیمت سالانہ (۴ر) مع محصول ڈاک ہے جو پیشگی لی جائے گی۔

(۶) نمونہ کا پرچہ پانچ آنہ کے ٹکٹ وصول ہونے پر ارسال کیا جائے گا۔

(۷) جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ وصول ہونا چاہیئے ورنہ ادائی جواب میں مجبوری رہے گی

(۸) اُجرت طبع اشتہارات درج ذیل ہے۔ قسم وصول ہونے پر اشتہارات طبع کئے جائیں گے

تعداد مدت	صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
ایک بار	۱ع	۸	۴
سہ ماہ	۲ع	۱۲	۸
ششماہ	۳ع	۲۰	۱۲
سالانہ	۵ع	۳۰	۲۰

(۹) جملہ مراسلت و ترسیل رقوم منی آرڈر وغیرہ موسومہ شریک مدیر پتہ ذیل پر ہونی چاہیئے

محمد عظمت اللہ خان بی اے شریک مدیر

دفتر رسالہ المعلم بلگرامی ہوز سانچہ توپ

حیدرآباد (دکن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مندرجات

المعلم

(۱) ضبط و انتظام مدرسہ نمبر (۲) ..... از مولوی ملک سردار علی صاحب بی اے بی ٹی مہتمم تعلیمات ضلع نلگنڈہ (۱ تا ۱۲)

(۲) تدریس میں ناکامیابی نمبر (۳) ..... از مولوی محمد حسین صاحب ایم اے صدر مدرس مدرسہ نوقا عثمانیہ عثمان آباد (۱۳ تا ۱۹)

(۳) تبصرہ ..... از مولوی ملک سردار علی صاحب بی اے بی ٹی مہتمم تعلیمات ضلع نلگنڈہ (۱۹ تا ۲۷)

(۴) شذرات ..... از شریک مدیر (۲۸ تا ۳۱)

(۵) قلمی معاونیں سے دو دو باتیں .... ،، (۳۱ تا ۳۲)

جلد ۲ | بابتہ ماہ خورداد سنہ ۱۳۳۵ ف | نمبر ۱۰

ضبط و انتظام مدرسہ

نمبر ۲

استواری عادات چونکہ تعلیم و تربیت مدرسہ کا اہم ترین مقصد درستی اخلاق و عادات ہے اور ضبط قائم رکھنے میں نہ صرف یہ مدعا حاصل ہوتا ہے بلکہ ایک قسم کی سہولت بہم پہونچکر ابتدائی باقاعدہ جد و جہد کے بعد دائمی فراغت حاصل ہو جاتی ہے مناسب ہوگا کہ استواری عادات کے متعلق مختصر سی بحث کی جائے۔

مختلف گھروں اور گوناگون طبائع کے بچوں کی نرالی اور انوکھی عادات کا مشاہدہ مدرسہ کی ابتدائی جماعتوں میں کرنے سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان سب کا ایک ہی اصول اور قاعدے کے تحت دن بھر تک ایک ہی جگہ رہنا اور ایک ہی قسم کی تعلیم و تربیت میں شرکت کرنا کس قدر مشکل اور پریشان کن ہے۔ ایک شریر ہے تو دوسرا غریب و مسکین، ایک تعد و چالاک ہے تو دوسرا سست و کاہل، کوئی مطیع و فرمانبردار ہے تو کوئی بالکل شوخ و گستاخ، غرضیکہ ہر ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور نرالا ہے۔ مدرسہ کی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور ہو کر ان سب کو کم و بیش ایک ہی قسم کے ستودہ خصائل اور پسندیدہ اطوار سے آراستہ کرنا ہمارے پیش نظر ہے۔ ایسی یکسانیت بیشک بالکل غیر ممکن اور امر محال ہے کہ سب کے سب مختلف گھڑیوں کی طرح ایک ہی طرح برابر رفتار کے ساتھ حرکت کرتے اور ایک ہی وقت دکھلاتے رہیں۔ جوہر جبلی اور وصف ذاتی کا بقا لازمی ہے اس لئے کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ اپنی اپنی فطرت و جبلت کے زیر اثر رہ کر ممکنہ نیک و ستودہ عادات و اطوار کی جانب مائل ہو کر انہیں پختہ و مستحکم کرنے کی جانب مشغول و مصروف رہیں۔

بہ لحاظ مدارج عادات تین اقسام پر منقسم ہیں۔ اول جسمانی عادات مثلاً صفائی جسم و لباس، چستی و چالاکی، سستی و کاہلی، ورزش، اعتدال خورد و نوش وغیرہ۔ دوم دماغی عادات مشاہدہ، غور و خوض، نتیجہ خیز تفکر، سلسل استدلال وغیرہ۔ سوم اخلاقی راست گوئی، ہمدردی باہمی سلوک، باہمی رواداری وغیرہ۔ تربیت عادات و اطوار میں اس قسم کا زیادہ لحاظ تو نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ جسم و دماغ اور نفس ایک ساتھ ہی نشو و نما پاتے ہیں۔ البتہ اس حد تک لحاظ رکھنا مناسب و ضروری ہے کہ ابتدائی جماعتوں میں مثلاً صغیر سے دوم تک زیادہ تر جسمانی عادات کی جانب توجہ ہونی چاہیئے۔ سوم و چہارم میں دماغی اور درجات وسطانیہ میں اخلاقی عادات کی درستی و اصلاح اور استواری و استحکام پر زور دیا جائے۔

نیک و ستودہ عادات کے لئے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بار بار ان کے اعادہ و تواتر کی ترغیب و تحریص ہونی چاہیئے اور قبیح و بد افعال و حرکات کی مذمت سے ان کا فوری انسداد

رہنے کے لئے ہر وقت مستعد و تیار رہنا چاہیئے۔

فلسفہ عادات کا ذرہ سے واقف دس مرتبہ ایک طرح سے کام کیا جا کر گیارھویں مرتبہ اس کے خلاف عمل ہو تو سابقہ دس مرتبہ کی کوشش بالکل رائگاں جاتی ہے۔ اس لئے حتے الامکان اختلاف عمل کو نوراً روکنا اور اس کی نگرانی کرنا نہایت ضروری ہے مگر اس قدر یکسانیت جائز نہوگی کہ جو ہر ذاتی زائل ہو کر بالکل عادت کا غلام ہونا پڑے۔ نیک کام اگر کسی غیر معمولی طریقہ سے انجام پانے کی کوشش کا اظہار کسی طالب علم سے ظاہر ہو تو اس کی دل افزائی کر کے زیادہ شوق دلایا جانا چاہیئے۔ الغرض مدرسہ کی تربیت میں یہ بدعا پیش نظر رہنا چاہیئے کہ طلبہ محض مشین کے پرزوں کی طرح عادات کے غلام نہ ہونے پائیں بلکہ اپنے عقل و شعور کو کام میں لا کر موقع و محل کے لحاظ سے عین اپنے کانشنس کے موافق کام کو شروع کر کے ختم کرنے کی صلاحیت بہم پہنچا سکیں کسی عادت کے آغاز ہونے پر بچے کو فرحت و خوشی اس قدر حاصل ہونی چاہیئے کہ آئندہ وہ نہایت جوش و مستعدی کے ساتھ خود اس کا خوگر ہونے کی کوشش کرے۔ اگر جنگلی کتے کو غلامی میں آکر جنگل کی بہ نسبت زیادہ آرام اور عمدہ خوراک بہ فراغت نصیب ہو تو ہرگز بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اسی طرح بچوں کو ورزش کا عادی بناتے ہوئے اُن کے جسم و قوت کا لحاظ رکھتے ہوئے سہل و آسان ورزش دی جائے جس سے زیادہ تکان اور زحمت نہ ہو تو ایک قسم کی فرحت حاصل کر کے آئندہ بھی اُس کو جاری رکھنا بخوشی پسند کریں گے۔

شکست عادات کے لئے کسی قسم کا جبر و اکراہ اس قدر مفید نہیں ہو سکتا جتنا کہ کسی بدعادت کی مذمت کر کے اُس کے بجائے اُسی سے متعلق نیک عادت کا قائم کرنا موزوں ہوگا تاکہ سابقہ مالی اور نفسی نقصان دہ راستوں کے مٹنے کے ساتھ ہی قوت کے اظہار کے لئے جدید راستے تیار ہو جائیں۔ بعض مدرسین اکثر اوقات ایسی امتناعی ہدایات استعمال کرتے رہتے ہیں جن سے کسی قسم کا فائدہ ہونا تو درکنار نقصان پہنچنے کا قوی احتمال ہوتا ہے مثلاً "جھوٹ مت بولو" "چوری مت کرو" "جوا مت کھیلو" وغیرہ وغیرہ۔ چھوٹے اور کم سن بچوں پر ان ہدایات کا

کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اوّل تو وہ بچے ان برائیوں سے کماحقہ واقف نہیں ہوتے۔ انھیں سمجھنے کی کوشش کرتے کرتے ہی اُن کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ دوسرے بعض ایسے شریف طبائع جو ایسی ہدایتوں کو متبرک اور مقدس سمجھکر ان کو قابل عمل منصور کر بھی لیتے ہیں تو سمجھنے سے قطعاً قاصر رہتے ہیں کہ اُن کے بجائے کیا کرنا چاہیے۔ اس لئے اگر ایسی ہدایت میں اس طرح ترمیم کی جائے کہ "جھوٹ بولنے سے احتراز کرنا اور راستی کو مقدم سمجھنا ہر طالب علم کا فریضہ ہے" "نیک بنو چوری سے گریز کرکے ہمیشہ دیانت داری اختیار کرتے ہیں" وغیرہ تو ایک ہی وقت میں شکست و استواری عادات کے دونوں مقاصد حل ہو جاتے ہیں۔

صدر مدرس متذکرہ بالا اصولوں کا صحیح منشا صرف اُسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب کہ اُن کا استعمال کنندہ صدر مدرس زبردست شخصیت رکھتا اور اُن پر عمل پیرا ہونے کی قوت رکھتا ہو ضبط و انتظام مدرسہ کی اصل روح رواں صدر مدرس ہے۔ اُس کی شخصیت ہر ایک اصول اور ایک قاعدے میں مضمر ہوتی ہے چند بڑے مدارس میں نہایت اچھے قاعدے اور اصول تراشنے کے باوجود بھی خاطر خواہ نتائج بدست نہیں ہوتے کیونکہ صدر مدرس کی شخصیت اس قدر موثر و عادی نہیں ہوتی کہ ان اصول اور قاعدوں کا استعمال باقاعدگی و پابندی کے ساتھ ہو سکے کئی ایک خامیاں برآمد ہوتی رہتی ایک شگوفے کھلتے ہی رہتے ہیں۔ اس کے بالکل برعکس بعض صدر مدرسین جدید قواعد و اصول سے گو زیادہ واقف نہیں ہوتے مگر اپنے ذاتی اثر اور انتظامی قوت کی بدولت عمدہ اور قابل تحسین نتائج برآمد کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ الغرض اگر صدر مدرس نااہل اور اُس میں انتظامی مادہ مفقود ہو تو جملہ اصول و قواعد بیکار و بے سود ہوتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اس زبردست ہستی کے متعلق چند ضروری خیالات کا اظہار کیا جائے۔

ایک منتظم اور کامیاب صدر مدرس میں ضبط قائم رکھنے کیلئے وہ سب اوصاف ہونے چاہئیں جو ایک عمدہ مدرس کی شان کے شایاں ہیں۔ خود اُس میں اس قدر ضبط و پابندی

پائی، بانی چاہیئے کہ وہ اپنے مددگاروں اور شاگردوں کیلئے نیک نمونہ بن سکے۔ اُس کا اخلاقی کیرکٹر ہر ایک برائی سے ۱۱ اور اُس کا دامن شہرت ہر ایک تہمت سے معرا ہو۔ اپنی قوم و سوسائٹی میں عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور خورد و کلاں کی ہمدردی حاصل کرتا ہو۔ نفاست طبع، صفائی و پاکیزگی، پابندی احکام و ضوابط، اطاعت گزاری اور خوش اخلاقی میں ایک اعلےٰ نمونہ پیش کرتا ہو۔ عام طور پر منصف مزاج و امین اور فہیم و ہمدرد ہو۔ فنون درسی سے کامل طور پر واقفیت رکھتے ہوئے طریقہ تعلیم میں بھی ماہر ہو۔ اس کی صحت درست، جسامت قوی اور رفتار و گفتار پسندیدہ مرغوب ہو۔ وہ اپنے اختیارات و اقتدارات سنجیدگی سے استعمال کرتا اور اُس کے جملہ احکام و ہدایات نافذہ سے محبت و اخلاص مترشح ہو۔ ضبط بذریعہ چشم میں کافی ماہر اور زیادہ گفتار کے بجائے کسی قدر خاموشی سے کام لینے کا عادی ہو۔

ایسی عمدہ صفات سے بہرہ ور صدر مدرس مدرسہ کی ضروریات کے لحاظ سے ہر کام کے بطریقہ احسن سرانجام پانے کیلئے مناسب و معقول انتظام کرے گا۔ مکان و احاطۂ مدرسہ کی صفائی، فرنیچر کی ترتیب و پرداخت، باغیچہ و کتب خانہ کی نگرانی، جماعتوں کی منتقلی اور کھیل و تفریح کا انتظام مناسب و معقول طریقہ پر مددگاروں اور مانیٹروں میں ایسی خوش اسلوبی و حسن تدبیر سے تقسیم کرے گا کہ بلا خلل جملہ انتظامات خود بخود اوقات مقررہ پر ہوتے رہیں۔ یعنی مدرسہ شروع ہونے سے پہلے ہی خادم مدرسہ صفائی، فراہمی آب، آبرسانی باغیچہ اور نشستوں کی ترتیب و پرداخت سے فارغ ہو جائیں گے۔ اوقات مدرسہ سے دس پندرہ منٹ قبل آکر مددگاروں کی حاضری سے فارغ ہو کر اُن سے ضروری سامان و آلات تعلیم کی ترتیب و پرداخت کا انتظام کروائے گا۔ رخصت یاب مدرسین کی جماعتوں کا حسب استعداد و اوقات معینہ انتظام تجویز کر کے مدرسہ کی آخری گھنٹی ہونے پر خود ایک نمایاں جگہ پر کھڑے ہو کر تمام جماعتوں کی ترتیب کے ساتھ ہال میں جمع ہو کر مصروف بہ دعا شتا اور بعد انفراغ جملہ جماعتوں کے اپنے کمروں میں باقاعدگی و ترتیب کے ساتھ جم جانے کے بعد بلا مدرسہ کے اندر و باہر دو ایک گشت لگاتے ہوئے ضروری امور کی نگرانی اور دیر حاضر طلبہ کی باز پرس سے

فارغ ہوکر رجسٹرات وتختہ جات حاضری کی تکمیل کی نگرانی کرے گا۔ یقیناً دس پندرہ یا زیادہ سے زیادہ منٹ میں ان ابتدائی مراحل کو طے کرکے مدرسین کو کام پر تعلیم کی تنقیح میں مصروف ہوگا۔ مختلف جماعتوں میں جاکر مختلف مددگاروں کے طریقہ تعلیم کی نگرانی وتنقید کرکے کسی فرصت کے وقت انھیں طلب کرکے حسب ضرورت ہدایات یا مشوروں سے مستفیض کرے گا۔ باری باری دو ایک جماعتوں کے ہوم ورک، رجسٹرات ترقی تعلیم اور مانیٹوریل سسٹم، بازیگاہ وباغیچہ وغیرہ کے کارنامہ اور روئیداد کا ملاحظہ کرنا اور گاہ بگاہ حسب ضرورت مددگاروں اور مانیٹروں سے مکالمہ کرنا بھی اس کے فرائض میں ہوگا۔ اپنی مفوضہ جماعتوں کی تعلیم پابندی اور خوش اسلوبی سے دینے میں بھی کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرے گا اور بعض اوقات حسب ضرورت اپنے اسباق میں چند مدرسین کو شریک کرکے انھیں طریقہ تعلیم کا نمونہ دیگا۔ مدرسہ کے ضروری حسابات، دفتر کی تہذیب اور مراسلت، برخواست وتفریح کے انتظامات وغیرہ میں اپنے مددگاروں سے حسب استعداد ضرورت کافی امداد لیکر خود مرتبہ اصول وضوابط کے لحاظ سے جملہ امور وانتظام ونظم ونسق مدرسہ کی نگرانی میں مصروف رہے گا۔ اس کے مددگار مونس، ہمدرد ورہنما کی حیثیت سے اور اُس کے شاگرد مربی وشفق ہادی کی حیثیت سے اُسے تصور کریں گے۔ غرضیکہ اُس کا حکم محض خوف وہراس کے بجائے رغبت واشتیاق کے ساتھ شایان تعمیل متصور ہوگا۔

عام ضبط وانتظام مدرسہ کے ضمن میں سرسری طور پر جماعت کے ضبط وانتظام پر نظر ڈالنا بھی خارج از دلچسپی نہ ہوگا۔ کسی جماعت کے ضبط وانتظام کے قیام وشکست کیلئے تین شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ (۱) نظم ونسق (۲) انتظام اطفال (۳) طریقہ تعلیم۔

(۱) **علم نظم ونسق** کسی کمرے کی وسعت یا ذرائع آمد ورفت روشنی وہوا میں اگر کوئی نقص واقع ہو تو یقیناً طلبہ اطمینان کے ساتھ تعلیم میں مشغول نہیں رہ سکتے۔ ایک زبردست مدرس ممکن ہے کہ شور وغل کے روکنے میں کامیاب ہوسکے مگر طلبہ کی بیزاری یا عدم دلچسپی کے رفع کرنے پر قطعاً قاصر رہے گا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دیہات کے ان مدرسین میں جہاں تنگ وتاریک کوٹھریوں

میں چھوٹے بچوں کو بلا لحاظ موسم بلیک ہول کے مانند بھر دیا جاتا ہے کہاں تک قابو میں رہ سکتے ہیں اور تعلیم کس قدر بھی دی جائے۔ لیکن کیوں نہ ہو کیسے موثر ہو سکتی ہے۔ اس لئے کمرہ جماعت کی ہیئت مجموعی اس کا محل وقوع اور وسعت، روشنی اور ہوا کے کافی ذرائع انتظام صفائی اور عام آرائش کمرہ فرنیچر اور اس کی ترتیب، طلبہ کی جماعت بندی اور ان کی نشستوں کا بلحاظ مدارج انتظام۔ تعداد طلبہ اور ٹائم ٹیبل کی ترتیب وغیرہ کا ضبط جماعت پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ جب تک مندرجہ بالا امور کا انتظام خوش اسلوبی اور مقررہ اصولوں کے تحت نہ ہو ضبط جماعت باحسن الوجوہ قائم نہیں رہ سکتا۔ انتخاب کتب درسی واستعمال مختلف آلات تعلیمی کا بھی مناسب لحاظ ہونا ضروری ہے۔

(۴) **مدبرانہ انتظام اطفال** | مدرس کو اپنا کامل رعب بحال رکھتے ہوئے بچوں کو ایسی خوش اسلوبی وحکمت کے ساتھ اپنے زیر اثر رکھنا چاہئے کہ بلا تکلیف ومزاحمت تمام بچے خوشی بخوشی اس کی رہنمائی سے مستفیض ہونے کی دلی تمنا رکھتے ہوں۔ ایسی حالت کے قیام کے لئے محض اسی قدر کافی نہیں ہے کہ مدرس شور وغل کا انسداد کر سکے بلکہ طلبہ میں ایسی نیک اسپرٹ پیدا ہونی چاہئے کہ جس طرز عمل کی توقعات وہ ان سے رکھتا ہے وہ اپنی عین کانشنس کے مطابق پوری کرتے ہوئے خوش وخرم دکھائی دیں اور اس کے خلاف کسی قسم کے محرکات اور ولولوں کے پیدا ہونے کا احتمال نہ رہے اور اس میں صرف مفید تعلیم یا دلچسپ تدریس سے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ مدرس کا ذاتی اثر اس قدر حاوی ہونا چاہئے کہ تمام اطفال پر اس کا گہرا پرتو پڑ سکے۔ ضبط وپابندی میں خود اس کی نیک مثال اور عمدہ نمونہ تطہیر کن رہنمائی کا کام دے۔ تمام جماعت میں اس کی شخصیت زبردست ہونی چاہئے۔ نہ ایسی زبردست کہ اطفال کے خوف وہراس کا باعث ہو بلکہ ایسی دلکش کہ اس کی خوشنودی کے حصول کی جد وجہد بچوں میں ترقی پذیر رہے۔ اس کی علمی قابلیت وعام قابلیت مسلمہ ہو جملہ فنون درسیہ سے پورے طور پر واقفیت رکھتے ہوئے روزانہ اسباق پر اچھی طرح حاوی ہو۔ اس کی زبان مفرق ہو بجائے غرور وتکبر اور شیخی ومشیخت کے شرم وحیا اس کا شیوہ ہو۔ اس کی قوت بیانیہ اس قدر بلیغ ہو کہ واقعات کو پیش نظر کرتے ہوئے ان کے اندر ایک زندہ روح پھونک سکے۔

اور طلبہ کے روبرو ایک حقیقی فوٹو کھچ جائے۔ اُس کی عام شہرت اور نیک رویہ قابل تقلید ہو کلاس کے روبرو وہ ہر وقت بشاش و شاداں نظر آئے۔ اُس کی ہمدردی طلبہ کو مدرسہ میں لانے کیلئے زبردست کشش رکھتی ہو۔ اولیائے طلبہ کو اس پر اس قدر اعتماد ہو کہ بلا تامل اپنے لختِ جگر کو اس کی ودیعت میں کر دیں۔ وضعداری میں قدرت سے بہت بڑا حصہ لئے ہوئے جسامت مضبوط اور صحت درست رکھتا ہو۔ جملہ طلبہ جماعت میں سے ہر ایک کے ساتھ اُسے اس قدر الجھن اور اُنس ہو کہ ہر ایک سے بحیثیت انفرادی وہ بخوبی واقف ہوتے ہوئے مدرسہ کے باہر بھی اُنکی نگرانی میں مشغول اور مشاغل تفریح و بازی میں شریک و معاون رہے۔ اُس کی بصارت و سماعت نہایت تیز و چست ہونی چاہیئے۔ اُس کی آواز سنجیدہ و نرم متانت سے لبریز اور یقیناً تحکمانہ ہو غرضیکہ ہر بات و ہر امر میں چستی طراری اور جوش و مستعدی کا علانیہ اظہار ہو۔

ایسے اوصاف حمیدہ سے بہرہ ور ہوتے ہوئے وہ یقیناً عمدہ پیرایہ میں اپنی جماعت کا ضبط قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ تمام جماعت میں راستی و صداقت کی پرت پیدا کر کے اُن کی بری خواہشات اور اُمنگوں کے اندفاع اور ناپسندیدہ عادات کی درستی کر سکتا ہے۔ فطرتاً بچے ضبط کو پسند کرتے اور اُس کے زیر اثر نہایت خوش و خرم رہتے ہیں۔ صرف اُسی وقت وہ بے قابو ہونا چاہتے ہیں جب کہ مدرس اپنی کمزوری کا اظہار کرتے ہوئے چڑچڑے پن سے پیش آئے۔ ابتداً جب کوئی نیا مدرس کسی جماعت کو اپنے چارج میں لے تو اُسے نہایت متانت اور تکلف کے ساتھ تحکمانہ لہجہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ مگر بتدریج حصول واقفیت کے ساتھ ہی جبکہ اُن میں کافی طور پر مل جل جائے زیادہ ملنساری اور ہمدردی کا اظہار ہونا چاہیئے ضبط کی بحالی کے لئے مدرس کا کسی قدر فاصلہ پر رہنا ہی مناسب ہے۔ اُسے نہایت حکمت و تدبر کے ساتھ طلبہ سے پیش آنا چاہیئے۔ خواہ مخواہ مخالفت و مخاصمت کے اظہار پر اُنھیں آمادہ ہونے کی جانب مائل نہیں ہونے دینا چاہیئے جہاں تک ہو سکے بہت کم احکام اور عام قواعد مرتب کئے جائیں اور جو احکام نافذ ہوں اُن کی فوری اور بلا استثنا تعمیل کرانا نہایت ضروری ہے۔ ایسے احکام نہایت مضبوطی و استحکام اور صراحت و صفائی

کے ساتھ دیئے جائیں۔ ان احکام کی تعمیل میں بجائے آواز کے زیادہ تر آنکھ اور مخصوص اشاروں سے کام لینا چاہیئے مگر ساتھ اس امر کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ طلبہ کی آزادی و فراغت میں کسی قسم کا خلل نہ ہونے پائے۔

ہر وقت مدرس کو جماعت میں اس قدر محتاط اور چوکنا رہنا چاہیئے کہ معمولی سے معمولی آواز اور خفیف سے خفیف اشارے کو بھی فوراً بند کر سکے۔ ضرورت سے زیادہ آزادی طلبہ کے لئے علیحدہ ایک طرف نمایاں جگہ پر نشست قائم ہونی چاہیئے۔

جب دوسرے اندرونی اصول اور قاعدے کارگر ثابت نہ ہوں تو لامحالہ سزا کا استعمال کرنا ہی پڑتا ہے جس سے کبھی پیچھے ہٹنا نہیں چاہیئے۔ اگر پہلے پانچ خاطیوں کو فوری اور بر موقع تدارک ہو جائے تو چھٹا خاطی کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتا اور ہمیشہ اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ سزا روزانہ معمول کے طور پر استعمال نہ ہونے پائے ورنہ اس کی تاثیر زایل ہو جائے گی۔ جب کوئی بدانتظامی یا شرارت ظاہر ہو تو فی الفور مگر نہایت متانت و اطمینان کے ساتھ اس کا تدارک کیا جائے اور آئندہ کے لئے انسداد کیا جائے۔ اصولاً مدرسہ میں سزا آئندہ کی عبرت کیلئے ہونی چاہیئے نہ کہ گزشتہ خطاؤں کے انتقام کے طور پر۔ بدیں لحاظ ہر خطا کا موقع و محل کے لحاظ سے تدارک کیا جانا چاہیئے غیور و حیادار طبائع کو بھی ڈھیٹھ اور شوخ طبائع کی طرح تصور کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔

تعلیم و تربیت مدرسہ میں بخلاف طریقہ عدالتی عدم واقفیت قاعدہ یا اصول کا عذر یقیناً قابل لحاظ متصور ہو سکتا ہے اور حتے الامکان خاطی کو قصور کے اعتراف و آئندہ کی اصلاح کے وعدے پر درگزر کرنا متعدد حالتوں میں مفید و کارگر ثابت ہوا ہے۔ جماعت کی چند بدنظمیوں اور ان کے اندفاع کی تمثیلات سے ان اصول کو واضح کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے

(۱) کسی عارضی شوخ اور نئے تمیز بچے کے بلالحاظ موقع و محل کسی قابل اعتراض لفظ یا جمع کے استعمال کرنے پر اس کی جانب عدم توجہی اختیار کرنا ہی اس کے حق میں کافی سزا ہو جاتی ہے (۲) اور بعض اوقات یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے شریر بچوں کو جو دوسرے بلالحاظ موقع و محل بات چیت کرنے یا چھیڑ چھاڑ

کرنے کے مرتکب ہوں دوسروں سے بالکل علیحدہ کونے میں بٹھائے جائیں۔ (۳) بعض اوقات کسی حرکت یا بات کی ناپسندیدگی کا اظہار مختلف علامات مثلاً آنکھیں دکھانے یا ہلکی سی جنبش سے کیا جا سکتا ہے (۴) زیادہ ڈھیٹ اور شوخ طلبہ کے ساتھ تخلیہ کی گفتگو، نصیحت یا علانیہ جھڑکی و سرزنش کا استعمال بھی کرنا پڑتا ہے (۵) چند بچے منہ میں پان وغیرہ رکھکر اکثر جگالی کرنے یا دانتوں کے کریدنے کے عادی ہوتے ہیں انھیں فوراً جماعت سے باہر بھیجکر منہ صاف کرنے کی ہدایت ملنی چاہیئے۔ (۶) بعض نچلے بازار بچے ڈیسک کے نیچے چھپکر چاقو، پنسل اور بعض جماعتوں میں ربر کی گیند سے کھیلنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ ایسے مشاغل کے ذرائع فوراً چھین لئے جائیں۔ اگر بڑی جماعتوں میں ایسی حرکت نمودار ہو تو خاطی کو جماعت سے باہر کرنا ہی ناگزیر ہوگا (۷) شور و غل، بیجا حرکات وغیرہ کے متعلق اظہار غصہ بذریعہ چشم ہونا چاہیئے (۸) جماعت میں اٹھتے بیٹھتے یا بورڈ پر آتے جاتے کسی طالب علم کے شور و شر کرنے کا فوراً انسداد ہونا بھی ضروری ہے (۹) اظہار گستاخی اور شوخ چشمی کو جس قدر ہو سکے روکنا چاہیئے۔ جس کے لئے مدرس کا ہمدرد ہونا ضروری ہے مسلسل اور متواتر مکالمہ ایسے بچے سے ہرگز نہ ہونا چاہیئے (۱۰) کسی بچے کے چشم آلود یا کسی قدر مغموم مگر گستاخانہ انداز پر اسے فوراً کسی غور طلب سوال سے چونکا کر دوسری جانب لگانا چاہیئے۔ سزائے جسمانی ایسی حالتوں میں عموماً مضرت رساں اور غیر مفید ثابت ہوتی ہے (۱۱) کسی ناکارہ اور سست بچے سے متواتر اور زیادہ سوالات کرنا نامناسب ہوگا (۱۲) معقول اور قابل التفات عذرات پر خطاؤں سے درگزر کرنا ہی مناسب ہے (۱۳) دیر باشی کے عادی طلبہ کو عموماً زیادہ دیر تک کھڑا رکھنا ہی ضروری ہے (۱۴) فراری اور آوارہ گردی کے عادیوں کے ساتھ مناسب سلوک ہونا چاہیئے۔ اسباب فراری پر غور کرکے خانگی حالات کی حد تک والدین کے توسط سے اور تعلیمی امور کے نظر کرتے خود مدرس کو ہی اندفاع و انسداد کے ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔

طریقہ تعلیم اکثر اوقات جماعت کی بدانتظامی کی وجہ ناقص طریقہ تعلیم و طرز تدریس ہوا کرتی ہے اور اگر طریقہ تعلیم معینہ اصولوں کے مطابق ہو تو ضبط و انتظام میں کسی قسم کی دشواری نہیں

ہوسکتی جیسا ۔ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہوگا۔

(۱) بعض مدرسین طلبہ کو پس پشت ڈالکر ان سے بڑھ کر زیادہ کام کرتے اور اس کو عین اپنی کارگزاری تصور کرتے ہیں۔ پڑ۔ بی سے [illegible] فی ہیں بجائے اس کے کہ طلبہ کی خواندگی درست کی جائے خود ہی مقررہ سبق پڑھ دیتے ہیں اور نظم کے اسباق میں تو زیادہ تر مدرس ہی شعر پڑھتا اور مطالب و معانی بیان کرتا دیکھا گیا ہے۔ یہ طریقہ اصول تعلیم کے سراسر خلاف ہے اور طلبہ بالکل خالی بیٹھے بیٹھے بدنظمی کی جانب مائل ہوتے ہیں۔ اسی طرح ریاضی یا حساب کے سوالات کے حل کرانے میں مدرس صاحب خود تختہ بورڈ پر مشق کرنے میں ایسے محو ہو جاتے ہیں کہ طلبہ کو مدرسہ کے باہر کے جملہ مشاغل کی جانب متوجہ ہوکر اصل سبق سے یقیناً جھکنا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر مدرس صاحب یہی کام طلبہ سے لیا کریں یعنی خواندگی کے وقت طلبہ سے ہی پڑھوا کر اغلاط کی درستی بھی دوسرے طلبہ کی امداد سے کروائیں اسی طرح تصریف افعال نحو و مصروف رکھنے میں ہی کامیاب ہوں بلکہ طلبہ کی ذاتی استعداد کو کام میں لاکر سبق کو زیادہ دلچسپ اور موثر بنا سکیں گے۔ اسی طرح اگر کبھی مدرس کو خود کوئی مشق بورڈ پر کرنے کی ضرورت عائد ہو تو اسے طلبہ سے ہی وہی مشق اپنی اپنی کاپیوں پر کرنے کی پابندی کرانی چاہیئے۔ حتے کہ جماعت میں طلبہ کو اس قدر کافی اور زیادہ کام دیا جائے کہ سالم وقت تک اس میں مصروف رہ سکیں اور اسی طرح انھیں اپنی قوت بیانیہ کے اظہار کا موقع ملنا چاہیئے۔ اُن پر کثرت سے سرعت کے ساتھ سوالات کرکے دلچسپی و توجہ میں اضافہ کرنا اور خصوصاً بیزاری اور بے توجہی کو روکنا چاہیئے ع۔ خانہ خالی را دیو گیرد

(۲) تعریف و توصیف سے حسب ضرورت موقع و محل کام لینا چاہیئے۔ بعض دفعہ مدرس کی معمولی مسکراہٹ جس سے خوشنودی و پسندیدگی کا اظہار ہو کئی کلمات تعریف سے زیادہ کام کرتی ہے۔

(۳) ہوشیار و تیز طلبہ کی نگرانی رکھی جائے کہ حد درجہ متجاوز ہوکر اپنی شوخی و چالاکی کا اظہار نہ کرنے پائیں

(۴) اوقات تدریس میں حتے الامکان بہت کم لعنت و ملامت یا جھڑکی کا استعمال ہونا چاہیئے اشارہ پشم شب آلود نظر یا معمولی بیدار کرنے والے سوالات ہی اکثر اوقات اکتفا کرنا چاہیئے۔

(۵) کسی قدر فاصلے پر کھڑے ہو کر مدرس کو زیادہ تر اجماعی سوالات بلا تکلف و تصنع استعمال کرنے چاہئیں۔ اس کی زبان اور اطوار میں کوئی ایسا خاص انداز نہ ظاہر ہو، چاہئے جو طلبہ کو سبق سے بھٹکا کر اپنی جانب متوجہ کر سکے۔ آواز قابو سے باہر نہ ہونے پائے۔ اس کا لب و لہجہ واضح اور صریح ہو مگر للکار کر پڑھانے سے گریز کرے۔

(۶) خود سبق میں ایسی دلچسپی ہو کہ طلبہ خاص طور پر محو و متوجہ رہ کر اس سے ایک قسم کا لطف و حظ اٹھائیں۔ بعض خشک مضامین میں خود مدرس کو ایسی تمثیلات اور دیگر ذرائع بشاشتی سوچ چنداں اختیار کرنے چاہئیں جن سے بیزاری نمودار نہ ہونے پائے۔

(۷) تدریس میں ایک ہی طریقہ و پیرایہ اختیار کرنا باعث بیزاری ہوگا معمولی طریقہ سے انحراف بعض اوقات کرنا بالکل ناگزیر ہوتا ہے۔ مثلاً حساب کے سوالات حل کرتے کرتے اگر طلبہ بیزار ہو جائیں تو اوزان اور پیمانوں سے عملی کام شروع کرنا چاہئے۔

(۸) واقعات کا انکشاف کرتے وقت اس قدر تجسس و متانت سے بیان ہو کہ طلبہ میں تھوڑی سی حیرت پیدا ہو کر انہیں واقعات کی اصل تہ تک خود بخود پہونچنے کا اشتیاق دلایا جائے کسی قصہ کہانی یا تاریخی واقعہ کے تذکرہ میں ہمیشہ مخالف و موافق پہلوؤں کا کافی لحاظ رکھتے ہوئے نیک و ستودہ خصائل و افعال کی جانب ان کی ہمدردی مبذول کرائی جائے اور چور ڈاکو یا ظالم سے ہمیشہ نفرت کا اظہار ہوتا رہے۔

(۹) باہمی رشک دلانے میں نہایت احتیاط و حکمت سے کام لیا جائے تاکہ فضول خودستائی یا پستی سے بعض طلبہ بے توجہ نہ ہونے پائیں۔

غرضیکہ مدرس کو ایسے جملہ ذرائع اختیار کرنے چاہئیں کہ تمام جماعت ایک ساتھ ہو کر مقررہ سبق میں خاصی دلچسپی کا اظہار کرے کسی دیگر جانب علانیہ یا پوشیدہ طور پر رجوع نہ ہونے پائے جس کا اظہار ہاتھ پاؤں کی حرکت یا چہرہ کے بغور مشاہدہ کرنے سے فوراً ہو سکتا ہے

*

تدریس میں ناکامیابی

نمبر ۳

۵ خلاصہ جات تختہ سیاہ اگر طلبہ کے صرف ایک حواس سے کام لینے کے بجائے دو حواسوں سے کام لیا جائے تو سبق زیادہ موثر و مفید ہوگا۔ لہذا ان کی قوت سامعہ اور قوت باصرہ دونوں سے کام لینا چاہیے۔ اس غرض کے حصول کے لئے تختہ سیاہ نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ سبق کا خلاصہ تختہ سیاہ پر لکھدینے سے طلبہ کے خیالات بالکل صاف ہو جاتے ہیں اور درس بخوبی ان کے ذہن نشین ہو جاتا ہے لیکن خلاصہ جات کی تیاری میں بڑی احتیاط و ہوشیاری شرط ہے۔ مدرس کو چاہیئے کہ خلاصہ جات مختصر، واضح، باترتیب اور خوشخط لکھے تاکہ طلبہ کے ذہن میں سبق کا پورا ٹھیک اور صاف تصور قائم ہو۔ اگر خلاصہ جات بے ترتیب خلط ملط اور گڈمڈ ہونگے تو متعلمین کے خیالات میں بھی انتشار، غلطی، بے ترتیبی اور بے ربطی پائی جائے گی۔ مدرس کو خیال رکھنا چاہیئے کہ واقعات کی اہمیت کے لحاظ سے تحریر موٹی یا باریک ہو۔ مشہور الفاظ و فقرات خط کشیدہ ہوں اور سرخیاں جلی خط سے لکھی جائیں اشتیاق آفرینی اور جلب توجہ کے لئے اگر رنگین کھریا استعمال کی جائے تو مناسب ہے علاوہ بریں ترتیب و تشکیل خلاصہ کے لئے چند قواعد مقرر ہیں جن کو نظر انداز کرنے سے تدریس کا اثر جلد زائل ہو جائے گا۔ دوران درس میں جب کوئی نیا لفظ یا نئی اصطلاح استعمال کی جائے تو اسکے معنی و مطلب تختہ سیاہ پر لکھدینا چاہیئے تاکہ وہ طلبہ کے دل پر نقش ہو جائے نئے اشخاص اور نئے مقامات کے نام بھی تختہ سیاہ پر درج کردینے چاہئیں۔ اسباق بیانیہ پڑھاتے وقت ہر زینہ کے بعد

طلبہ سے سوالات کرنے چاہئیں اور ان کے جوابات کو حسب ضرورت بدلکر صحیح اور مناسب الفاظ میں تختہ سیاہ پر لکھتے جانا چاہیے۔ حکمیات، ریاضیات اور صرف و نحو وغیرہ کی تعلیم میں تفصیلات و تمثیلات کے بعد بذریعہ مقابلہ و تجرید جو عام اصول، قاعدہ یا تعریف مدلی جائے اسے بھی فوراً تختہ سیاہ پر درج کر دینا چاہیے۔ جو کچھ تختہ سیاہ پر لکھا جائے اُسے مٹانا نہیں چاہیئے بلکہ اختتام ساعت تک اسے طلبہ کے پیش نظر رہنے دینا چاہیئے تاکہ بعد ختم درس اعادۂ سبق کے وقت اس سے مدد لی جا سکے اگر ان ہدایات پر مدرس کاربند نہ ہوگا تو اُس کی تدریس پر تاثیر و مفید نہ ہوگی۔

۴۔ **ناکامیابی تدریس بہ لحاظ امور انتظامی** (۱) اُمور غیر اقتداری:۔ جن واقعات و حالات کے زیر اثر طلبہ مصروف بہ کار رہتے ہیں ان کی خامی و بدنظمی ناکامیابی تدریس کا باعث ہوا کرتی ہے چند خارجی امور مدرسین کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں لیکن ان کے استقام خوبی تدریس کے لئے سنگ راہ بنتے ہیں جیسے عمارت مدرسہ کی تنگی۔ کمرۂ جماعت کی ناموزونیت ناکافی روشنی، بادکشی کا عدم انتظام، سامان کی کمی، ناکافی آلات تعلیمی، اساتذہ کی کمی وغیرہ۔ عمارت مدرسہ کی تنگی کی وجہ سے لامحالہ ایک ہی کمرہ میں دو یا تین جماعتیں بیٹھیں گی اور شور و غل ہوا کرے گا۔ اگر طلبہ خاموش بھی رہے تو بیک وقت کئی مدرسین کے پڑھانے کی آواز سے کمرہ گونج اُٹھے گا اور متعلمین کی توجہ ایک جانب قائم نہیں رہے گی۔ بہرحال کسی حد تک اُس قسم کی تلافی کی تدبیر یہ ہے کہ پردوں سے جماعتیں علیحدہ علیحدہ گھیر دی جائیں اور نظام الاوقات اس طرح مرتب کیا جائے کہ متصلہ جماعتوں میں بیک وقت بلند آواز سے درس نہ دینا پڑے یعنی اگر ایک جماعت میں مضمون بیانیہ جیسے علوم عامہ یا ادب کی تعلیم ہو رہی ہو تو دوسری جماعت میں سکوت طلب مضمون مثلاً نقشہ کشی خطاطی یا حساب سکھایا جائے۔ کمرۂ جماعت میں اتنی گنجایش ہونی چاہیئے کہ وہاں تمام طلبہ کی نشست کا بآسانی انتظام ہو سکے۔ حفظ صحت کے اصول پر فی متعلم ۱۲۰ مکعب فٹ کی حساب سے کمرہ کی وسعت ہونی چاہیئے۔ اس کا فرش گرم و خشک رہنے کے علاوہ بناوٹ کے لحاظ سے ایسا ہونا چاہیئے کہ چلتے وقت بہت شور نہ پیدا ہو۔ کمرہ جماعت میں پوری روشنی

کی آمد کے لئے کافی روشندان اور دریچے ہونے چاہئیں۔ اس کا بھی اہتمام چاہئے کہ روشنی بائیں جانب سے علیٰ سطح الرؤس آئے۔ نمناک و تاریک، کمرہ طلبہ کی طبیعت کو افسردہ و پژمردہ بنا دیتا ہے۔ ہندوستان جیسے گرم ممالک میں بہ زمانہ تابستاں بادکشی کا مناسب انتظام ہونا چاہئے ورنہ گرمی سے بے چین اور پسینہ سے تربتر طلبہ سبق کی طرف دھیان نہ دے سکیں گے۔ اگر پنکھے کا انتظام نہ ہو سکے تو مدرسہ کا وقت صبح ۶ سے ۱۰ بجے تک رکھنا مناسب ہے۔ اکثر سامان کی کمی بھی ناکامیابی تدریس کا باعث ہوا کرتی ہے۔ کمی سامان کی وجہ سے اگر ایک بنچ پر ضرورت سے زیادہ لڑکے بٹھائے جائیں تو وہ تکلیف اور بے چینی محسوس کریں گے اور گڑبڑ مچانے لگیں گے۔ بہرحال سامان کی کمی مدصادر سے چٹائیاں خرید کر پوری کی جا سکتی ہے لیکن یہاں یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ایک ہی جماعت میں کچھ بنچ اور کچھ چٹائیاں نہ دی جائیں ورنہ لڑکے بنچ پر بیٹھنے کیلئے آپس میں جھگڑنے لگیں گے اور کوئی بوریہ نشینی پسند نہیں کرے گا۔ ناکامیابی تدریس کی بڑی وجہ آلات تعلیمی کی عدم موجودگی بھی ہے کیونکہ بہت سے توضیح طلب امور کی تشریح اور تجربات و اختبارات کا عمل بغیر آلات تعلیمی مشکل ہے۔ تاہم ہوشیار و تجربہ کار مدرس تختہ سیاہ پر خاکے کھینچ کر کسی حد تک اس کمی کی تلافی کر سکتا ہے۔ اساتذہ کی کمی کی وجہ سے مدرسین کو مسلسل کئی گھنٹے تعلیم دینی پڑتی ہے اور انھیں فرصت کی ساعت شاذ و نادر ہی ملتی ہے اس لئے وہ تکان محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ان کا جوش عمل زائل ہو جاتا ہے اور ان کی تدریس پھیکی اور بے جان ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں بعض اوقات مدرسین کی جز معاشی اور قلیل تنخواہ بھی ان کی گرمجوشی کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ کیونکہ "مزد و رخوشدل کند کار بیش" کے مقولہ سے طبقہ معلمین مستثنیٰ نہیں ہے۔ تاہم مدرسین کا مطمح نظر طمع زر اور حرص دولت سے بلند تر ہونا چاہئے۔ ان کے دلوں میں قناعت، حب الوطنی، رفاہ عام اور ایثار و قربانی کے جذبات موجزن ہونے چاہئیں

(ب) امور اقتداری: — بہرکیف بعض امور انتظامی ایسے ہیں جن پر مدرسین کی پوری دسترس ہے اور جن کا صحیح یا غلط اہتمام معلمین کے حیطۂ اقتدار میں ہے۔ اگر مدرس ان امور کا انتظام درست نہ رکھے تو اس کی تدریس مفید و پر تاثیر نہ ہوگی۔ تختہ سیاہ ایسی جگہ پر رکھنا اور نقشہ ایسے موقع پر

آویزاں کرنا چاہیئے کہ تمام طلبہ جماعت انھیں بخوبی دیکھ سکیں ورنہ وہ ادھر اُدھر جھکینگے اور کبھی کھڑے ہوں گے جس سے انتظام جماعت میں خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہے۔ بعض مدرسین طلبہ کی ریاضات جانچنے یا زبانی درس دینے کے وقت لڑکوں کو اپنے میز کے گرداگرد جمع کر لیتے ہیں چند طلبہ کھڑے، چند جھکے اور چند بیٹھے رہتے ہیں۔ جو لڑکے نظر سے پوشیدہ ہو جاتے ہیں وہ طرح طرح کی شرارتیں کرنے لگتے ہیں۔ اس قسم کی بدنظمی جماعتی مفاد کے لئے سم قاتل ہے۔ مدرس کی نشست ایسی جگہ پر ہونی چاہیئے جہاں سے وہ بیک نظر تمام طلبہ کی حرکات و سکنات دیکھ سکے۔ جماعت وسیع رقبہ میں پھیلی ہوئی نہیں رہنی چاہیئے کیوں کہ اس صورت میں درس کو مکمن السمع ہونے کیلئے زور زور سے چلانا پڑے گا۔ اکثر چھوٹے بچے دیر تک ایک ہی کل بیٹھے بیٹھے اکتا جاتے ہیں۔ اور بےچینی و پریشانی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ انھیں چست و چاق بنانے کیلئے مناسب ہے کہ ان کو دو چار بار تیزی سے اٹھنے اور بیٹھنے کا حکم دیا جائے۔ اگر طلبہ آپس میں نشست کا بھی تبادلہ کر لیں تو بہتر ہے بسا اوقات ناکامیابی تدریس کا باعث طلبہ کی دماغی سطوح کی ناہمواری ہوا کرتی ہے بعض لڑکے تیز اور ذہین اور بعض غبی اور سست ہوا کرتے ہیں لہذا جماعت بندی کے وقت احتیاط رکھنی چاہیئے کہ ایک جماعت کے تمام طلبہ مساوی ذہنی قابلیت کے ہوں لیکن اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک ہی متعلم بعض مضامین میں مضبوط اور بعض میں کمزور ہوا کرتا ہے لہذا اصولاً ہر مضمون کے لحاظ سے الگ الگ جماعت بندی ہونی چاہیئے لیکن عملاً یہ ناممکن ہے۔ بہرحال مضامین مماثل یا نیات و مضامین مماثل ادبیات کے لحاظ سے جماعت بندی کا اثنویہ طریقہ قرین مصلحت ہے مدرسین کی تقسیم بھی ان کی استعداد، رغبت اور انتظامی قابلیت کے اعتبار سے ہونی چاہیئے۔ مدرس کو ایسا مضمون پڑھانا چاہیئے جس پر اس کو کافی عبور حاصل ہو اور جس سے اس کو خاص دلچسپی حاصل ہو۔ اعلےٰ اور ادنےٰ جماعتوں کا انتظام بہ نسبت درمیانی جماعتوں کے زیادہ مشکل ہے لہذا جن مدرسین میں قیام منبط کی اعلےٰ قابلیت ہو اُن کے تفویض فوقانی و تحتانی جماعتیں ہونی چاہئیں اور وسطانی جماعتیں معمولی انتظامی صلاحیت رکھنے والے معلمین کے سپرد کرنی چاہئیں کامیابی تدریس

میں نظام الاوقات کی ترتیب کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اگر مشکل مضامین علے الاتصال پڑھائے جائیں تو طلبہ خستگی محسوس کرنے لگیں گے اور ان کا دماغ پورے طور سے کام نہیں کریگا۔ اس لئے تدریس موثر نہ ہوگی۔ لہذا رسیپ نظام الاوقات کے وقت مدرس کو خیال رکھنا چاہئے کہ مشکل اور آسان مضامین کے گھنٹے یکے بعد دیگرے مقرر کئے جائیں سخت مضامین اول وقت یا بعد از وقفہ پڑھانے چاہئیں کیونکہ اس وقت طلبہ کا دماغ تر و تازہ رہتا ہے۔ ساعت تعلیمی کی درازی طلبہ کی عمر و ادراک کے لحاظ سے ہونی چاہئے کیونکہ چھوٹے بچے دیر تک ایک ہی جانب اپنی توجہ قائم نہیں رکھ سکتے۔ بعض اوقات بیکاری کی وجہ سے طلبہ قیام ضبط میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ ان کو ذرا سی مہلت ملی کہ گڑبڑ مچانے لگتے ہیں لہذا مدرس کو چاہئے کہ پوری تعلیمی ساعت میں لڑکوں کو مشغول رکھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے مدرس کو پہلے سے اچھی طرح سبق تیار کر لینا چاہئے۔ اگر مدرس پورا تیار نہ ہوگا تو سبق کا ایک زینہ ختم کرنے کے بعد دوسرا زینہ شروع کرنے کیلئے سوچ بچار کرنے لگے گا اور لڑکے مہلت پاکر شور و شغب میں مشغول ہو جائیں گے۔ بہرحال درس کو پُر تاثیر اور کامیاب بنانے کیلئے مندرجہ بالا ہدایت پر کاربند ہونا ہر مدرس کیلئے ضروری ہے

۵۔ ناکامیابی تدریس بلحاظ شخصیت معلم تدریس کی کامیابی کا بڑا راز معلم کی شخصیت میں مضمر ہے۔ لڑکوں میں تقلید کا مادہ بہت زبردست ہوتا ہے۔ وہ مدرسین کی صرف ظاہرداری اور تصنع کا نہیں بلکہ اُن کی اصلی اور حقیقی روش کا بھی اتباع کرتے ہیں۔ لہذا معلمین کو چاہئے کہ وہ سیرت ساز ہونے کی حیثیت سے طلبہ کے سامنے اعلےٰ نمونہ اور شریف مثال پیش کریں۔ مدرسین کو شمع ہدایت بننا چاہئے تاکہ متعلمین ان کے نقش قدم پر چلکر سچے "شہری" اور محب وطن بنیں۔ بہتر سے بہتر طریقہ تعلیم بھی ہرگز مفید اور کارآمد نتائج نہیں پیدا کر سکتا اگر اس طریق کا مستعمل نااہل معلم کی نقل و حرکت، رفتار و کردار اور طرز برتاؤ سے غمخواری، ہمدردی اور محبت و الفت کے اوصاف ٹپکنے چاہئیں۔ اس کے علاوہ مدرس کو شیریں کلامی، خوش خلقی، ضبط، تحمل اور نرم شناسی کی صفات حمیدہ سے متصف ہونا ضروری ہے۔ معلم کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ مستعد

اور سرگرم کار رہے اور مایوسی و ناامیدی کو کبھی پاس پھٹکنے نہ دے جب خود مدرس کا دل امید سے لبریز رہے گا تو وہ طلبہ کی حوصلہ افزائی کر سکے گا تاکہ وہ سردمہری اور مشکل کے مقابلہ کیلئے سینہ سپر رہیں۔ اگر معلم جماعت میں ہشاش بشاش اور خنداں و شاداں رہے گا تو طلبہ کو اس کے درس سے بڑی دلچسپی حاصل ہوگی لیکن اگر وہ ترش روئی اور تنک مزاجی کا اظہار کرے گا تو طلبہ کا ذوق و شوق جاتا رہے گا اور درس کا ان پر مفید اثر نہیں پڑے گا۔ طلبہ کو تابع فرمان رکھنے کیلئے مدرس کو چاہئے کہ وہ پہلے خود اپنے نفس پر قابو حاصل کرے۔ کیونکہ جو شخص اپنے نفس پر حکومت کر سکتا ہے اس کے لئے دوسروں پر حکومت کرنا آسان ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بخلاف سیاسی حکومت کے مدرس کی حکومت جبر و قہر پر نہیں بلکہ لطف و مہر پر مبنی ہوتی ہے۔ تاہم بعض ناتجربہ کار مدرسین سوٹے کے زور سے طلبہ کو دباؤ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ گویا ان کی نگاہ میں مدرسہ محبس، طلبہ اسیر اور وہ خود داروغہ محبس ہیں حقیقت الامر یہ ہے کہ سرزنش و چشم نمائی اور تہدید و تخویف کے فولادی اسلحہ طلبہ کے دل و دماغ پر ویسا گہرا اور دیرپا اثر نہیں پیدا کر سکتے جیسا ہمدردی و انس اور خندہ روئی و شیریں کلامی کے نرم و غیر متنفر حربے۔ کار تعلیمی کی ضروریات کے لحاظ سے مدرس کو خیال رکھنا چاہئے کہ اس کی زبان میں سلاست، صحت اور روانی ہو۔ اس کا تلفظ صاف، واضح اور نطری ہو اور اس کی معلومات وسیع، وافر اور باقاعدہ ہوں۔ مدرس کو حکمت عملی کا پورا سرمایہ دار ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ اس کو موقعہ شناس ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ فوراً معلوم کرلے کہ کس موقع پر کونسی تدبیر کارگر ہوگی۔ اس میں حاضر جوابی کا بھی مادہ ہونا لازمی ہے تاکہ وہ طلبہ کے سوالات اعتراضات کا بروقت برجستہ اور تشفی بخش جواب دے سکے۔ مدرس کو چاہئے کہ وہ صفائی اور ستھرے پن کا بطور خاص خیال رکھے تاکہ طلبہ اسکی دیکھا دیکھی صاف اور ستھرا رہنا سیکھیں۔ مدرس کا لباس بھی سادہ صاف اور رسم و رواج کے مطابق ہونا چاہئے۔ ورنہ خلاف وضع اور پھٹے پرانے کپڑے باعث تضحیک و تمسخر ہونگے مدرس کو اپنی خودداری عزت اور وقار کا پورا خیال چاہئے عادات و اطوار اور شمائل و

خصائل کے لحاظ سے مدرس کو نہ صرف طلبہ کے لئے بلکہ قوم کے لئے بھی نمونہ ہونا چاہیے۔ چونکہ معلمین بچوں کی فلاح و بہبودی کے ضامن ہیں لہٰذا آئندہ قومی باگ انھیں کے ہاتھوں میں ہے اس لئے ان کو اپنی اعلےٰ ذمہ داریوں کا پورا احساس ہونا چاہیئے۔ اگر مندرجہ بالا امور کا لحاظ رکھکر معلمین اپنی شخصیت کو عظیم الشان بنائیں گے تو نہ صرف ان کی تدریس پر تاثیر و کامیاب ہوگی بلکہ ان کی کوششوں سے تھوڑے ہی دنوں کے بعد قومی زندگی میں محیر العقول انقلاب رونما ہوگا۔

تبصرہ

قائد القواعد | میں نے قائد القواعد کو بغور دیکھا اور پڑھا۔ فاضل مولف نے جس عرق ریزی محنت شاقہ اور جدت سے اسے تیار کیا ہے اس کا اندازہ صرف ایسے لوگ ہی کر سکتے ہیں جنھیں شعبہ تعلیم میں کام کرنے کا موقع ملا ہو اور جو اصول تعلیم اور مروجہ اردو قاعدوں سے بخوبی واقف ہوں۔

ایسی قابل قدر تالیف اور جدت پسندی کی داد دیتے ہوئے میں اپنا ضروری فریضہ سمجھتا ہوں کہ اس پر ایک سرسری تنقیدی نظر اس جدید و مفید راہ کی تلاش میں جس قدر کہ ہو سکے امداد پیش کروں۔

فاضل مولف نے ایک مختصر سے رسالہ الموسوم بہ "ضرورت تالیف" میں وضاحت فرمادی ہے کہ حروف کے نام جو آوازوں سے بالکل مختلف ہیں اُن کے سیکھنے میں کم سن طلبہ کو بیحد دقت واقع ہوتی ہے اس لئے صاحب موصوف نے بچوں کے طریقہ کو قطعاً بھول جانے کی ہدایت فرمائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زبان اردو میں حروف کے نام جو اُن کی آوازوں سے بالکل مختلف ہیں نہایت تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں مگر اُس کے ساتھ ہی بچوں کا اس قدر پیچھا کرنا

کہ طرز قدیم کا نام و نشان تک مٹا دیا جائے درست نہیں معلوم ہوتا فطرتاً جب ہم کسی چیز (کل) کا تصور اپنے ذہن نشین کرتے ہیں تو اُس چیز پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے اُس کے مختلف اجزا کو اُن کی خاص ترکیب و ترتیب کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے ذہن میں لاتے ہیں۔ اسی طرح طفل نو جب تعلیم کے میدان میں گامزن ہونے لگتا ہے تو اُسے سرسری طور پر کسی لفظ کا نام بتلا کر یا اُس سے کہلوا کر اُس کے مختلف اجزا یعنی حروف پڑھائے جانے چاہئیں جیسا کہ خود مولف نے بھی صراحت فرمادی ہے۔ ان حروف کے تجزیہ سے پھر جب کبھی وہ لفظ اُس کے سامنے آتا ہے تو اُسے فوراً پہچان لیتا ہے۔ اس عمل تجزیہ میں اس کو حروف کے نام اور اُن کی ترکیب و ترتیب کو اپنے تصور میں ضرور رکھنا پڑتا ہے اس لئے اگر وہ خود ہی چپ چاپ تن تنہا اس عمل تجزیہ سے دوچار ہو تو یقیناً اُسے سخت مشکل درپیش ہوگی اور اگر معلم اس منزل کے طے کرنے میں اُس کی رہنمائی کرتے ہوئے اُس کی زبان سے اس عمل تجزیہ کو ادا کرتے سنے اور بصورت غلطی اصلاح کرے تو کوئی ہرج کی بات نہیں بلکہ سراسر باعث سہولت ہے۔ مولف صاحب کا دعویٰ ہے کہ لفظ (گھوڑا) سکھلاتے وقت پہلے (گھو) پھر (ڑا) سکھلانا چاہیئے۔ یہ طریقہ عملی طور پر مفید ثابت نہ ہوگا کیونکہ کم سن ۵۔۶ سالہ طالب علم مرکب جزو لفظ "گھو" کی بھی تجزی کرے گا۔ پرانے طرز سے "گھے دو گھو۔ ڑے الف زبر ڑا" کہنے سے بے شک سخت مشکل کا سامنا ہوتا ہے مگر یہ جدید طرز بھی بالکل ناقابل عمل معلوم ہوتی ہے۔ میری رائے میں اگر وہ گھو (او) ڑا کہے تو طرز قدیم کی ثقالت دور ہو جاتی اور طرز جدید کی لطافت اور سہولت حاصل ہو جاتی ہے۔ برخلاف اس کے مولف صاحب کے ارشاد کے بموجب معلم اور طالب علم ہر دو اپنے اپنے ذہن میں تجزیہ تو کریں گے مگر زبان سے اس تجزیہ کو ادا کرنا ہر دو کے لئے جرم سنگین ہے۔ فرض کیا جائے کہ ایک معلم کسی طالب علم سے "گھوڑا" لکھوانا یا پڑھوانا چاہتا ہے اور وہ کسی قدرتی یا سست ہونے کی حیثیت سے اسکے کہنے یا پڑھنے سے قاصر رہتا ہے تو ایسی صورت میں معلم کو کیا کرنا چاہیئے؟ یقیناً مولف کے ارشاد کے بموجب یہی کہ وہ "گھوڑا" کو خود لکھدے یا پڑھ دے اور پھر آئندہ کیلئے طالب کو وہی یاد رکھنے کی توجہ دلائے

مگر اصول کفایت کے بہ سراسر منافی ہے تجزیہ کرنے سے دو چار مرتبہ ذہن نشین کرانے پر آئندہ بہت سہولت پیدا ہوگی مگر بغیر تجزیہ کئے ہجا کرنے کی بار بار معلم کو وقت کا سامنا کرنا پڑے گا جس سے غریب کم سن متعلم بھی بیحد پریشان ہوگا۔ اسی لئے حساب میں پہاڑوں اور گروں سے امداد لیجاتی ہے آئندہ کیلئے جملہ قواعد صلات سہل کئے جاتے ہیں۔ ہجا کرنے سے مراد ایک قسم کا سمجھنا ہے جو طالب علم اور معلم کے مابین ہوتا ہے کہ وقت ضرورت اُس پر استدلال ہو سکے اور کسی غلطی کو فوراً ہی ذہن نشین کرا دیا جائے اور اسی طرح طالب علم کو خود اپنے لئے بھی اسی سمجھوتے سے بہت بڑی امداد ملتی ہے۔ اوقات مدرسہ میں یا کھیل کے میدان اور گلی کوچہ میں چلتے پھرتے وہ نہایت دلچسپی کے ساتھ اپنے ذہن میں اپنے اسباق کو دہرا کر مستفید ہو سکتا ہے۔ اس لئے مجھے مسٹر زبلٹن سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ ہجے غیر ضروری ہیں البتہ طرز قدیم کے ساتھ ہجوں کا استعمال نہایت تکلیف دہ اور ایک حد تک مضر ہے۔ پس جہاں تک میں دیکھتا ہوں قابل مولف نے اس تالیف میں ایک بالغ و ذی شعور کو اس قاعدہ کو پڑھنے کیلئے منتخب فرمایا ہے جو ایک بار گھوڑا سیکھ لینے سے مو۔ کھو۔ ڈھو۔ سو۔ بو وغیرہ خود بخود جلد سیکھ لیگا۔ یقیناً یہ منطقی طرز طریقہ تعلیم کے لئے مفید نہیں ہو سکتی نفسیاتی طرز سے کام لینا چاہئے تھا یعنی طرز قدیم کے ثقیل ہجے سکھلانے کے بجائے طرز جدید کے لطیف ہجے سکھلائے جائیں ورنہ بغیر اس کے کبھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی نظیر کے لئے زبان تتلگی پر جو طرز جدید سے سکھلائی جاتی ہے اور جس میں ہجوں کا استعمال نہیں ہوتا غور کیا جائے بہت اچھے اور کارگزار مدرسین کو دیکھا ہے کہ باوصف مسلسل محنت شاق اٹھانے اور دلچسپی کے ساتھ تعلیم دینے کے بھی اپنے طلبہ کو سال ڈیڑھ سال میں تو شاذ و نادر ہی ورنہ اکثر و بیشتر دو تین برس میں ابتدائی قاعدہ یعنی بالسکشا ختم کروا سکتے ہیں۔ اگر یہ حضرات بھی اصول ہجا کو کام میں لائیں تو انشائی مدت (۲) ماہ میں بلا دقت قاعدہ تلنگی یا بالسکشا ختم ہو سکتا ہے اور اُردو قاعدہ کو تو کسی صورت میں بھی (۲) ماہ سے زیادہ مدت نہیں دینی چاہئے۔ اس امر کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اُردو و تلنگی ہجوں میں زیر زبر پیش یا دیر گھسم اور وغیرہ جیسے ثقیل الفاظ بلا کسی قدغنہ کے طلبہ کو کہنے دئے جائیں کیونکہ بغیر اس کے چارہ نہیں۔ اگر ہم انھیں کہنے سے روکیں گے تو یقیناً طالب علم اپنے ذہن میں انھیں ادا

کرے گا۔ ایسے نازک زمانہ کم سنی میں طالب علم کو بلا کسی تسلی و تشفی اور رہنمائی کے ابتدائی کٹھن منزل کے طے کرنے میں تنہا چھوڑنا اوصاف رہنمائی کے سراسر منافی ہے۔ اس کا نازک دماغ خود ہی اسے ادا کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا اور اسی وجہ سے اکثر طلبہ الجھنوں میں پڑ کر پریشان ہونے اور بھٹکتے رہتے ہیں۔ اسی کے ضمن میں مسٹر تولسٹن کے مشورہ کے متعلق قابل مولف نے اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ ایسے روشن زمانہ کا مشورہ ہے جب کہ وقت اور دماغ کو صرف بیجا سے بچانے کیلئے طرح طرح کی تدبیریں نکالی جارہی ہیں۔ بچوں کا حافظہ ضرور تیز ہوتا ہے مگر کیا اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس کی آزمائش مہملات سے کی جائے"۔ یہ اعتراض قابل نظر ثانی ہے۔ بچوں کے طریقہ کو خلاف فطرت خواہ مخواہ ہی مان لیا جائے تو اس کا کیا علاج۔ اوپر صراحت کی جا چکی ہے کہ یہ طریقہ بجا عین فطرت کے اصول کے مطابق ہے چہ جائیکہ اسے مہملات سے تعبیر کیا جائے۔ اوپر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بچے کو سوائے اس طریقہ کے چارہ نہیں (البتہ قدیم طرز کے ثقیل ہجے سکھانا تکلیف دہ خیال کیا جا سکتا ہے) پھر یہ کیسے مان لیا جائے کہ ہجے کرنا خلاف فطرت ہے اور ہجے بالکل مہملات ہیں۔ خواص طفلی سے واقفیت رکھنے والے حضرات اس نکتہ کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اس میں طلبہ کو ایسی سہولت اور آسانی ہے جیسا کہ اوپر ظاہر کیا گیا ہے اور مزید وضاحت کے لئے پہاڑوں کی رٹائی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

ہجے کروانے سے جو دوسرا ضمنی فائدہ پیش نظر ہے وہ یہ کہ ہجے سکھلانے سے حافظہ تیز ہوتا ہے ایام طفلی یعنی ۵۔۷ سال کی عمر میں قوائے نفسی میں سے صرف حافظہ ہی ایسی قوت ہے جس کی تربیت بخوبی ہو سکتی ہے اور ہونی چاہئے اور اگر حافظہ کی تربیت نظر انداز کر دیجائے تو متعاقب نقصان کا اندیشہ ہے۔ ہر قوت دماغی یا نفسی کو اپنے خاص اوقات پر بروقت کافی غذا کی صورت میں تربیت ہونی چاہئے۔ ورنہ یہ قوتے مردہ ہو کر بیکار ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے اس عمر میں مختلف پہاڑے وگرو غیرہ بھی سکھلائے جاتے ہیں۔ بچوں کو اگر فضول مہملات سے تعبیر کیا جائے تو معلوم نہیں کہ اور کونسے مفید معقولات اس زمانہ کمسنی ۵۔۶ سال کی عمر میں سکھلائے جا سکتے ہیں۔

اس کے بعد دوسرا زیر اصول جو وضع کیا گیا ہے کہ حروف کو ان کی آوازوں سے ہی موسوم کیا جائے

مثلاً ا کو ا ہی کہا جائے نہ کہ الف جو بالکل بے ربط اور ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔ یہ اصول بجائے خود بالکل صحیح اور درست ہے مگر جملہ حرکات بہ امتثال حروف ہندی یا تلنگی جن میں زیادہ حروف متحرک کا استعمال ہوتا ہے اور حروف ساکن کا بہت کم استعمال کیا جاتا ہے جملہ حروف کو متحرک قرار دینا باعث دقت ہوگا اس کے بجائے ہم بآسانی اس طرح کر سکتے ہیں کہ حروف کو ایسی آوازوں سے پکارا جائے جو متحرک ہوں نہ آوازوں سے مختلف مثلاً الف کو اَ ب کو بَ ت کو تَ اور آواز نکالنے میں اسقدر خفیف حرکت دیجائے کہ حروف متحرک سے بہ سہولت تمیز ہو سکے نہ کہ لازمی طور پر ہر حرف پر زبر دیا جائے جس سے حروف ساکن کے سکھلانے میں بیحد مشکل ہوگی۔ اس کے علاوہ قائد القواعد میں اس کا استعمال جس طرح سے کیا گیا ہے اُس کے متعلق بھی اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ ایک ہی حرف کی مختلف صورتیں وقت واحد میں طالب علم کو سکھلانا یقیناً اس کی دلچسپی کو کم کرنا پریشانی میں اضافہ کرنا اور اکتساب علم سے بیزاری پیدا کرنا ہے اس میں منطقی نقطہ نظر کو کام میں لایا گیا ہے اور نفسیاتی اصول کو قطعاً نظر انداز کیا گیا ہے مثلاً ا آ ب بہ ب ایکدم طالب علم کو الف اور ب کے حلقوں میں اتنے چکر دینے سے یقیناً وہ پریشان ہو جاتا ہے اور یہ طریقہ تدریج کے زرین اصول کے بھی سراسر منافی ہے۔ بچہ کبھی کسی شئے کو ایک منتہی کے نکتہ نگاہ سے نہیں دیکھتا اور نہیں دیکھ سکتا مگر قائد القواعد کے اسباق میں ہی حروف کی چار چار شکل جب تک نہ سیکھ لے وہ آگے قدم نہیں بڑھا سکتا۔ اس کے علاوہ زرین اور نفیس قدرتی اصول تقابل و توازن جیسے طرز قدیم میں بھی نہایت قدر کے ساتھ دیکھا جاتا تھا نظر انداز کیا گیا ہے۔ مثلاً ب پ ت ٹ ث الگ اور ج چ ح خ وغیرہ ہمشکل حروف کو باہمی مشابہت اور اختلاف ذہن نشین کرتے ہوئے ایک ساتھ سکھلایا جانا بیحد مفید ہے مگر قائد القواعد میں اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اگرچہ ثقیل حروف کو بالکل جدا کرنا ایک حد تک مناسب و صحیح ہے مگر اس کے ساتھ ہی تقابل و توازن کا بھی بخوبی لحاظ رکھا جا سکتا تھا اور اسی طرح حروف لکھاتے وقت ان کی اشکال نہایت آسانی و سہولت کے ساتھ باہمی مشابہت کی صراحت کر کے سکھلائی جا سکتی تھیں سبق (۱) میں الف سے ب کو کوئی ربط یا تعلق نہیں دلایا گیا۔ سبق (۲) میں (پ پاج جا) کو آپس میں

کسی قسم کا تعلق نہیں۔ تجربہ کرکے دیکھا جائے تو ان میں سے ایک بھی کسی نو آموز طالب علم کو (۴) روز میں بخوبی نہیں پڑھایا جا سکتا اور نہ اس سے اس کے زیادہ عرصہ تک یاد رکھنے کی توقع ہو سکتی ہے سابقہ معلومات سے کام لینا، بتدریج بڑھتے جانا اور تقابل و توازن سے مشابہت و اختلاف کو واضح کرنا وغیرہ جیسے نہایت اہم اصولوں کو نظر انداز کرنا کسی طرح بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتا البتہ کسی ایسے ذی شعور اور بالغ شخص کے لئے جس کو زبان اُردو میں بہ حیثیت زبان زائد یا زبان دوم امتحان پاس کرنا ہو یہ قاعدہ بلاشبہ مفید ثابت ہونے کی توقع رکھتا ہے کیونکہ اس کی ترتیب میں منطق کو زیادہ دخل ہے۔

قائد القواعد میں ابتدائی مشقیں اس قدر ثقیل ہیں کہ عام فہم اور روزمرہ کے استعمال کے الفاظ سننے کے بجائے طلبہ کو غیر مانوس جملوں سے دلچسپی ہونے کی توقع نہیں پائی جاتی مثال کے طور پر ایک دو مشقیں دی جاتی ہیں۔

(۱) آٹا۔ نالا۔ تانا۔ ٹالا۔ جانا۔ تنا۔ چلا۔ بچا۔ چنا چبا۔ آٹالا۔ پاپا چلا۔ چنا چبا۔ تانا تنا۔ آپا آٹا بچا۔

(۲) رٹا۔ دلا ..... رلا ..... ڈلا .....

(۳) بھرا۔ بھالا جھڑا۔ جھابا۔ بڑا۔ لڑا۔ جھلا۔ آڑا۔ جھاڑا وغیرہ۔ ان کے بجائے زیادہ مرغوب اور پسندیدہ مشقیں منتخب ہو سکتی تھیں معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر افعال اور اکثر افعال ماضی مطلق لئے گئے ہیں تاکہ با تا۔ ٹا۔ لا۔ ما۔ گا وغیرہ کی مثالیں دی جا سکیں۔ یعنے بچے کی نفس کو بالکل نظر انداز کرکے صرف مخصوص حروف کی وضاحت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور قابل مولف نے طرز منطقی کے لحاظ سے کمسنی کے زمانہ کے مانوس جملوں اور الفاظ کو ترک کرکے صرف گرامر یا منطق کے اصول پر اپنے مرتبہ نقشہ یا اسکیم کو پورا کرنے کی زیادہ کوشش کی ہے۔ افعال کی نسبت زیادہ تر اسما مثلاً گرد و پیش کی اشیاء اور گرد و پیش کی چیزوں، قدرتی نظاروں اور اعضائے جسمانی کے ناموں کا زیادہ استعمال ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح جا بجا بکثرت فارسی اور

غیر مانوس ہندی ارق الفاظ محض کمی کو پورا کرنے کیلئے استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً فسانہ۔ عباقبا حاشا۔ وفا۔ پاشاہ۔ ساٹھا۔ پاٹا۔ چھلاوا وغیرہ۔ ۵ سال ۳ ماہ کی عمر میں بچہ متذکرہ بالا الفاظ کو نہ تو سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کو ان الفاظ کے سکھلانے ہی کی ضرورت ہے۔ اس پر طرفہ یہ ہے کہ مشقوں میں جو جملے درج کئے گئے ہیں وہ بہت کم اور ناکافی ہیں۔

آسان و مشکل حروف ابجد کی تقسیم جو کیگئی ہے نہایت مفید اور قابل قدر جدت ہے کہ مشکل حروف مثلاً ٹ۔ ث۔ ز۔ ژ۔ ری۔ ض۔ ظ وغیرہ کو علیحدہ کر دیا ہے اور اس سے حروف ابجد سکھلانے میں جو دقتیں رونما ہوتی تھیں ایک حد تک رفع ہو گئی ہیں مگر ترکیب و ترتیب سے مجھے اتفاق نہیں۔ بقول فاضل مولف جبکہ ایک سبق ایک ہفتہ میں سکھلایا جائے گا تو پہلے آسان حروف ابجد ہی تقریباً دو ڈھائی ماہ میں ختم ہو سکیں گے اور پھر مشکل حروف تقریباً چھ ماہ سے بھی زائد عرصہ کے بعد شروع کئے جائیں گے۔ یعنی ۲۴ ہفتوں کے بعد سینتیسویں ہفتہ میں اس کی باری آئیگی اور اس وقت تک بچہ ایسے آسان الفاظ مثلاً مزا۔ ذرا۔ کاغذ۔ نظر وغیرہ کے استعمال سے محروم اور اپنے کو ان الفاظ پر حاوی ہونے میں قاصر خیال کرے گا جس سے ظاہر ہے کہ ایسی ترتیب قدرتی طریقہ کے خلاف اور اصول زباندانی کے منافی ہے۔ میری رائے میں یہ بسہولت ہو سکتا تھا کہ صرف مختلف حروف کی آسان طرز کی آوازوں کو لے کر اُن کے مطابق حروف و الفاظ و جملے سکھلائے جاتے اور منطقی اصول کو نظر انداز کر کے اس کی چنداں پروا نہ کی جاتی کہ ہر ایک حرف کی مختلف آوازیں اور بندشیں وغیرہ تمام کی جائیں۔ پس اس طرح سے قابل مولف کے منتخب کردہ آسان حروف پہلے ابتدائی چار سبقوں میں ختم کئے جا کر ان سب حروف کو ایک جگہ لکھدیا جاتا۔ اور پھر ایک جگہ ان سب کو حروف شناسی کی مشق کے لئے بلا لحاظ ترتیب لکھا جاتا اور اس کے بعد مشکل حروف کو بھی صرف تین اسباق میں تبلایا جاتا کیونکہ نفسیاتی اصول کے مدنظر کسی شے یا چیز کے متعلق بچے کو واقفیت بہم پہونچاتے وقت پہلے ہم نہایت ضروری اور اہم جیلوں کو لیکر ذہن نشین کراتے ہیں اور پھر اس کے بعد بہت سے کسیقدر مشکل اُمور لیکر اُس سابقہ واقفیت

سے تعلق دلاتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور آخر میں نہایت باریک اور گہرے پہلوؤں کو لیا جاتا ہے۔ اسی طرح حروف ابجد میں بھی پہلے تمام حروف کی آسان، اور اہم آوازیں جو زیادہ تر مستعمل ہیں مندرجہ بالا ترتیب سے لیجانی چاہئیں اس کے بعد بتدریج کسیقدر مشکل طرز کی آوازیں مثلاً زیر پیش وغیرہ اور اس کے بعد مجہول و۔ ی وغیرہ اور آخر میں نون غنہ یا حروف ساکن یا حروف خاموش وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے بھی آسان الفاظ پہلے ابتدائی حصہ میں اور مشکل و ثقیل الفاظ آخری حصہ میں رہنے چاہئیں تاکہ جوں جوں بچے میں بہ لحاظ سن و شعور مختلف آوازوں کی تمیز اور اُن کے تلفظ ادا کرنے کی صلاحیت ہوتی جائے ویسے ہی وہ قدرتی طریقہ پر آگے بڑھتا جائے۔

اکثر مشقوں میں ہموزن الفاظ کو متروک کرکے صرف حرکات و سکنات کی صلاحیت کیلئے مختلف ٹون اور وزن کے الفاظ تراش کر رکھے گئے ہیں جو حافظہ میں سما ہی نہ سکیں۔ واضح رہے کہ اس سن میں زیادہ تر قوت حافظہ سے ہی کام لیا جاتا ہے اور حافظہ کی تربیت کا یہی زمانہ ہے اور اسی کی تربیت کی جانب زیادہ توجہ ہونی چاہئے کہ ایسے مختلف اوزان کے الفاظ سے ایک بالغ و ذی شعور ہی بخوبی استفادہ کر سکتا ہے۔ بچہ کے لئے جو انھیں کھیل کے میدان میں یا گلی کوچے میں چلتے پھرتے دہراتا رہتا ہے دلچسپ قافیہ دار الفاظ ہونے چاہئیں۔ قاعدۃ القواعد میں سے ایک دو مشقیں صراحت کیلئے لیجاتی ہیں

سبق (۳۹) کارڈ۔ دوست۔ ڈیسک۔ دھیان۔ شہر۔ گھن۔ رحم۔ شہد۔ مہربانی۔ چہرہ۔ مہر گہرا۔

سبق (۴۰) ابا۔ بچہ۔ ہڈی۔ لٹو۔ کمل۔ ٹڈا۔ ڈبہ۔ منڈی۔ بچھو۔ عزت۔ کتا۔ حقہ۔ الو۔ چھٹی۔ انیس

اکتالیسویں سبق میں تمام ایسے الفاظ درج کئے گئے ہیں جن میں ساکت حروف آتے ہیں۔ گویا چالیس اسباق پڑھنے تک بچہ "خود۔ خوش" جیسے آسان اور معمولی الفاظ (جن کی بچے کو اکثر ضرورت ہوگی) کے استعمال سے عرصہ دراز تک محروم رکھا گیا ہے اور حرف ساکت کے نیچے نفی کی علامت جو ظاہر کی گئی ہے وہ بھی بے ضرورت ہے۔ املا و خطاطی میں اس سے بیحد مشکلات واقع ہوں گی۔

کثرت استعمال سے بچہ خود بخود حروف خاموش کی حقیقت سے واقف ہو سکتا ہے۔ اسی طرح واؤ و یائے مجہول و واؤ صحیح و علت و نون غنہ وغیرہ کے لئے جو جدید علامتیں مقرر کی گئی ہیں ابتدی بچوں کی مشکلات میں اضافہ کریں گی غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یائے مجہول کی علامت لکھنے یا سمجھنے میں بچے کو کس قدر مشکل درپیش ہوگی۔ کثرت الفاظ اور ہموزن الفاظ کی مشقوں سے ان علامتوں کی بخوبی صراحت کی جاسکتی اور بہ سہولت طلبہ کے ذہن نشین ہو سکتی ہیں مثلاً یائے مجہول کو لکھنے یا سمجھنے کیلئے دیر۔ سیر۔ بیر کے سبق سے بچہ بخوبی استفادہ کر سکتا ہے۔ چھوٹی علامتوں کا پتہ کیلئے لکھنا اور بھی مشکل اور اصول تعلیم کے خلاف ہے اور پھر ایسی صورت میں جبکہ ان کی چنداں ضرورت نہ ہو خواہ مخواہ ان پر بار ڈالنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ذی شعور طبائع کیلئے یہ اصول مفید ثابت ہو سکتے ہیں نہ کہ کمسن بچوں کے واسطے۔

خود قابل مولف کا دعوے ہے کہ ایک سال میں بخوبی یہ قاعدہ ختم کروایا جاسکتا ہے اور کمسن یا غبی یا بدشوق طلبہ ایک سال سے زائد یعنی دو سال میں ختم کریں گے۔ اگر ایسا ہی ہے تو طرز جدید سے جو توقعات تھیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ فی زمانہ تعلیم کا مطمح نظر یہ ہے کہ اکثر و بیشتر طلبہ ۶ ماہ میں ہی قاعدہ ختم کرلیں۔

آخر میں اس امر کا اظہار کرتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ قابل و فاضل مولف نے ملک و قوم و زبان کی بہتری و بہبودی کے لئے جو قابل قدر سعی فرمائی ہے ملک اُس کی نہایت تپاک کے ساتھ قدر کرکے قابل مولف کی حوصلہ افزائی کرنے میں کسی قسم کا دریغ نہیں کرے گا۔

رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

شمالی ہند کا نامی گرامی تعلیمی رسالہ بیس سال سے پوری شان و شوکت کیساتھ شہر لاہور سے شائع ہو رہا ہے اسکی خوبیاں اسکے مطالعہ سے ظاہر ہو سکتی ہیں قیمت سالانہ صرف روپیہ سکہ رائج الوقت پیشگی مجموعہ ماہانہ (۲۰) صفحہ۔

ماسٹر جگت سنگھ پریذیڈر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور سے طلب فرمائیے

شذرات

دفتر نظامت تعلیمات سرکار عالی سے ذریعہ مراسلہ نشان ۶۵۷ مورخہ ۱۴ فروردی ۱۳۳۵ف یہ احکام جاری ہوئے ہیں کہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کامیاب طلبہ کو اب تک بمبی یونیورسٹی کالجوں میں شریک نہیں کیا جاتا تھا لیکن سررشتہ تعلیمات کی تحریک پر اب بمبئی یونیورسٹی کی سنڈی کیٹ نے یہ طے کیا ہے کہ آئندہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کامیاب طلبہ کو بمبئی یونیورسٹی کے کالجوں میں شریک کیا جائے گا۔ بشرطیکہ انھوں نے اس امتحان میں زبان انگریزی میں (۴۰) فی صدی اور دیگر مضامین میں (۳۵) فی صدی نمبر حاصل کئے ہوں۔ چنانچہ اس بارے میں یونیورسٹی مذکور سے جملہ کالجوں کے نام ذریعہ گشتی نشان ۱۱۵ بابتہ سنہ ۱۳۳۶ فصلی اطلاع بھی دی جاچکی ہے۔

مولوی محمد واحد علی صاحب معتمد ڈبے ٹنگ سوسائٹی مدرسہ وسطانیہ سنگاریڈی اطلاع دیتے ہیں کہ مسٹر گردت سنگھ صاحب منیجر الکٹرک ہوز ساکن چین گولی گوڑہ حیدرآباد دکن جو بعض فنون میں اچھی شناسائی رکھتے ہیں اور اپنی جدت طرازیوں کے سبب اپنی آپ نظیر ہیں جناب مہتمم صاحب تعلیمات ضلع میدک کی دعوت اور مدرسین مدرسہ مذکور کی درخواست پر پانچ روز تک مدرسہ وسطانیہ سنگاریڈی میں ملمع اور قلعی کرنے صابن بنانے شیشہ کاٹنے بیاٹری تیار کرنے وغیرہ پر لکچر دیتے رہے جس سے اساتذہ اور تلامذہ محظوظ ہوئے۔

مسٹر ایس ایم نائڈو سیول سرجن ضلع میدک ہفتہ میں دو مرتبہ 'امبولنس' کا لکچر دیتے اور بچوں کو اس کے ذہن نشین کراتے ہیں۔

امید ہے کہ دیگر مدارس ملک سرکار عالی بھی اس کی تقلید کریں گے۔

مدرسہ عالیہ احمد پور ضلع بیدر میں بصدارت نواب میر لیاقت علی خاں صاحب بہادر تعلقہ دار مدرسہ مذکور کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ جلسہ کا آغاز قرأت سے کیا گیا۔ ازاں بعد نعت اور اقبال کا ترانہ نہایت عمدگی سے طلبہ نے پڑھا اور چند طلبہ نے مختلف زبانوں میں تقریریں کیں اس کے بعد مدرسہ کی سالانہ رپورٹ پڑھی گئی اور بتحریک صدر مدرس صاحب مدرسہ صدر جلسہ نے پورفنڈ کے متعلق تقریر کی جسکی وجہ بانہ چودہ روپیہ کا چندہ ہوا۔ تمام رعایا سا ہوکار معززین کی پان سگریٹ سے خاطر تواضع کی گئی۔ پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور رات کے آٹھ بجے جلسہ برخاست ہوا۔ دوسرے روز اسپورٹس گیمس وغیرہ میں طلبہ کو انعامات تقسیم کئے گئے

مدرسہ وسطانیہ گرگ تعلقہ شاہ پور ضلع گلبرگہ میں مولوی عبد الجبار صاحب سبحانی ناظر تعلیمات گلبرگہ کے زیر صدارت مدرسہ مذکور میں جلسہ تقسیم انعام منعقد ہوا۔ صدر صاحب نے قصبہ مذکور کی گزشتہ غفلت کو ظاہر کرتے ہوئے موجودہ حالت اور تعلیمی امور میں دلچسپی لینے کی طرف توجہ دلائی اور سفری کتب خانہ کے قیام کے متعلق چندہ کی فہرست کھولی گئی۔ ترآسی روپیہ کا چندہ ہوا۔ اس کے بعد مسٹر دیوراؤ پٹواری اور مسٹر نگپا نے تقریریں کیں جن میں مدرسین مدرسہ مذکور کے خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ مولوی سید محمد اسمٰعیل صاحب منتظم پولس نے طلبہ مدرسہ کو مٹھائی دینے کیلئے دس روپیہ انعام دئے۔ اس کے بعد مدرسہ کے بچوں کو ٹوسلیٹیں اور سترہ کتابیں منجانب مدرسہ تقسیم کی گئیں اور گیارہ بجے شب کو جلسہ برخاست ہوا۔

مہاراجہ بڑودہ و علیگڈھ کالج کی جوبلی نے لفظ جوبلی ہر خاص و عام کی زبان پر چڑھا دیا ہے لیکن اس کے اصلی مفہوم سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ یہ تو خیر اکثر کو معلوم ہے کہ جوبلی منانے کیلئے پچاس برس کی مدت لازمی ہے لیکن یہ بہت کم جانتے ہوں گے کہ لفظ جوبلی جوبل سے نکلا ہے جو ایک عبرانی لفظ ہے اور جس کے معنے ہیں مینڈھے کا سینگ۔ یہودیوں

کا قاعدہ تھا کہ ہر پچاسویں سال قیدی چھوڑ دیتے تھے۔ قرضہ معاف کر دیتے تھے اور اراضیات جو قبضہ میں آجاتی تھیں وہ اصلی مالکوں کو واپس کر دیتے تھے۔ اس موقع پر منڈھے کا سینگ یعنی جوبل بجا کر پچاسویں سال کا اعلان کرتے تھے۔ چنانچہ یہ رسم جوبلی کے نام سے موسوم ہوگئی

اس سال ہماری ریاست میں سورج گرہن تقریباً پونے گیارہ بجے کے بعد شروع ہو کر ساڑھے گیارہ بجے کمال پر پہونچا اور اس کے بعد چھوٹنا شروع ہو کر ساڑھے بارہ بجے کے بعد ختم ہوگیا۔ جزیرہ سماترا میں اس مرتبہ اکثر جغرافیہ و سائنس داں سورج گرہن دیکھنے کیلئے جمع ہوئے تھے کیونکہ یہاں سے سورج بالکل چھپا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ مدرسین اس کے وجوہ پر غور کریں اور طلبہ کو بھی توجہ دلائیں

مددگار مدرس مدرسہ نگانیہ پٹن اطلاع دیتے ہیں کہ مدرسہ میں ایک عام جلسہ بصدارت مولوی عبدالسلام صاحب ناظر منعقد ہوا جس میں تقریباً ہر طبقہ کے اشخاص شریک ہوئے عوام کو تعلیم کے مقاصد و فوائد بتلائے گئے اور نقصان دہ عادات ترک کرنے کی ہدایت دی گئی۔ یہ بھی خواہش ظاہر کی گئی کہ طلبہ بجائے مرہٹی بطور زبان اول پڑھنے کے اپنی مادری زبان کنڑی بطور زبان اول اور اردو بطور زبان دوم پڑھیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ کارپردازان مدرسہ رعایا کی خواہش کو جلد پورا کریں گے۔

صدر مدرس صاحب چاایدلائی ضلع گلبرگہ کی اطلاع منظر ہے کہ ناظر صاحب کی مدد سے سفری کتب خانہ کے لئے ایک جلسہ میں پچیس روپیہ جمع کئے گئے اور فرنیچر کے واسطے تقریباً پچھتر۔ صدر مدرس صاحبان یہ خبر غور سے ملاحظہ فرمائیں

صدر مدرس صاحب مدرسہ تحتانیہ سلگرہ ضلع گلبرگہ نے اپنے مدرسہ کی وہ رپورٹ لکھکر روانہ کی ہے جو انھوں نے اس سال کے سالانہ جلسہ میں پیش کی۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ موجودہ صدر مدرس صاحب کے زمانہ میں مدرسہ کی تعدادی و تعلیمی ترقی ہوئی ہے۔ مالی پیٹیل و دیگر معزز اشخاص قصبہ مدرسہ کی فلاح و بہبود میں کوشاں ہیں۔ غریب طلبہ کے کھانے اور رہنے کا انتظام اور مدرسہ میں کتب خانہ قائم کرنے کی تحریک قابل تعریف ہے

قلمی معاونین سے دو دو باتیں

المعلم اس بارے میں اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کرتا ہے کہ اس کے قلمی معاونین کا دائرہ نہ صرف وسیع ہے بلکہ اس ابھی نوعمر رسالہ کی خدمت گزاری کو محسوس فرما کر بہت سے کرم فرما اس کی قلمی اعانت کر رہے ہیں اور کرنے پر آمادہ ہیں۔

ہر رسالہ کو اپنے خاص شعبہ اور حلقہ میں اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اس حلقہ کی زبان بن جائے ورنہ مدیرانہ ہم نوائی ہمنوائی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ایک اخبار یا رسالہ اسی صورت میں پبلک کی زبان یا جیسا کہ انگریزی اصطلاح ہے اور خوب اصطلاح ہے "آرگن" بن سکتا ہے کہ اس اخبار یا رسالہ میں محض مدیر صاحبان خامہ فرسائی نہ فرمائیں بلکہ

عام طور پر وہ حضرات جو اہل قلم ہیں اور جو ان معاملات سے عملی دلچسپی رکھتے ہیں ان کو اخبار یا رسالہ نے اپنا مطمح نظر قرار دیا ہے خود اپنے خیالات کو ان سے دیدہ یا رسالہ کے ذریعہ ظاہر کریں۔ المعلم ایک تعلیمی رسالہ ہے اور سررشتہ تعلیمات اور سررشتہ کے علاوہ ملک کے ہر گوشہ اور طبقہ میں جو جو اصحاب اٹھتی پود کی تعلیم اور تربیت میں عملی حصہ لے رہے ہیں وہ اگر اپنے خیالات، تجربات اور احساسات کو المعلم کے ذریعہ عامۃ الناس تک پہونچائیں تو اس وقت یہ رسالہ ابنائے وطن کے لئے تعلیمی پہلو سے ایک ایسی زبان بن جائے گا جسکی آواز ملک بھر میں پہونچے گی اور چونکہ ایک وسیع دائرہ کے اصلی تعلیمی تجربہ پر مبنی ہوگی اس آواز میں اثر اور اس آواز کے خیالات بہبود عامہ کا ایک انمول خزانہ ثابت ہونگے المعلم ان استادوں سے جو اس ملک میں تدریس کا کام کر رہے ہیں اس بات کا متمنی ہے کہ وہ اپنے تجربوں اور احساسات تعلیمی کو قلمبند کرکے المعلم کے ذریعہ اپنے اور بھائیوں تک پہونچائیں گے۔ اس طرح ملک کے تعلیمی کام میں ایک ہم ہمیشہ کو دوسرے کے مشاہدات اور تجربات سے فیض اور مدد پانے کا موقع ملے گا۔

ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ تمنا ایسے کانوں تک نہیں جائے گی جو اس کان سنتے اور اس کان اڑا دیتے ہیں۔ ہمارے اساتذہ کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ان کو مضمون نگاری اور اظہار خیال کی مشق سے نہ صرف ذاتی شہرت کا موقع ملے گا بلکہ اس ادبی کوشش سے خود ان کے خیالات کو جلا اور ان کی قوت تفہیم میں زیادتی ہوگی اور یہ چیزیں استاد کے لئے نہایت قیمتی ہیں۔

اب صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مضمون ہمیشہ فلس کیپ سائز پر ہو اور ہر صفحہ کے نصف کالم پر ہو اور ساتھ ہی واضح اور کھلا کھلا لکھا ہوا ہو۔

*

شمع

جنوری ۱۹۱۳ء سے شمع نہایت آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ غرض ہر لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے۔ ہر مضمون مہذب محرک خیال اور معلومات جدیدہ کا بہترین نمونہ ہوتا ہے اور تاریخی سیاسی اقتصادی و ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کے مقاصد علمی و ادبی ہیں۔ لائق مدیران شمع مسٹر محمد حبیب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ و مسٹر حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹرایٹ لا اگرہ ہیں یہ حضرات بہترین تعلیم یافتہ ہونیکے علاوہ اعلیٰ درجہ کے نقاد اور ادیب ہیں اور من اخبار نویسی سے واقف ہیں اور ادبی و علمی خدمت کی آرزو میں رسالہ کی ترتیب پر مصروف ہیں اور اس میں کوئی ذاتی فائدہ شامل نہیں اور نہ کسی تجارتی اصول پر اس کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ شمع ہر ماہ میں پابندی وقت سے شائع ہوتا ہے۔ تصاویر بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حجم (۱۱۲) صفحہ قیمت سالانہ ۴ نمونہ کا پرچہ ۱۰ ار

منیجر صاحب رسالہ شمع حسن منزل شاہ گنج اگرہ سے طلب فرمائیے

اخبار تعلیم لاہور

ہر قسم کے تعلیمی معاملات پر آزادانہ بحث کرنے والا مدرسین کا وکیل اور ترجمان طلبہ کا ہمدرد و غمگسار انسپکٹران محکمہ تعلیم کا خیر خواہ سررشتہ تعلیم کا مشیر ہر قسم کے علمی اخلاقی طبی وغیرہ مضامین کا مخزن ہفتہ وار اخبار تعلیم لاہور سے شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ چار روپیہ شاہی دو روپیہ آٹھ آنہ سہ ماہی ڈیڑھ روپیہ

منشی طالب علی صاحب بانی و قریشی ایڈیٹر اخبار تعلیم لاہور سے طلب کیجئے

دی حیدرآباد بک ڈپو

توپ کا سانچہ حیدرآباد دکن

ہمارے پاس ہر قسم کی جدید و قدیم انگریزی و اردو کتب کا بہترین ذخیرہ ہے۔ ہم نے ایسا انتظام کیا ہے کہ تازہ ترین کتب شائع ہوتے ہی ہمارے پاس سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ہماری قیمتیں بہت کم ہیں۔ جو کتاب بمبئی یا مدراس وغیرہ میں ۴ اکلدار کو ملتی ہے وہ ہم بلالحاظ نرخ کلدار ـــــ عہ سکہ عثمانیہ میں فروخت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس صادر کا بہترین سامان ہے۔ قسم قسم کے پنسل، کاغذ داب، لفافہ کاغذ، ربر، چاک، سامان ڈرائینگ، نقشہ جات وغیرہ وغیرہ ہیں۔

مدارس کے ساتھ خاص رعایت کی جاتی ہے۔ براہ کرم اپنی ضروریات سے مطلع فرمائیے اور استفسار کرنے میں تامل نہ فرمائیے۔ ہماری دوکان پر ایک دفعہ تو ضرور تشریف لائیے۔

رفاہ عام کی غرض سے ہم نے نشست و برخاست کا بھی معقول انتظام کیا ہے شائقین علم و ادب ہماری دکان پر تشریف لاکر ہر قسم کی کتابوں کا بلا معاوضہ مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

دی حیدرآباد بک ڈپو۔ توپ کا سانچہ حیدرآباد دکن

جریدۂ سررشتۂ علوم آصفیہ سنہ ۱۳۳۵ف

اجرائے انگریزی ایم نشان ۱۹۲۵ء

جلد دوم

نمبر ۱۱

المعلم

ع ا

ماہ تیر سنہ ۱۳۳۵ف

مدیر..... محمد سجاد مرزا بی اے (کنٹب)۔

شریکِ مدیر..... محمد عطاء اللہ خاں بی اے

اعظم اسٹیم پریس چراغ کالونی

حیدرآباد دکن

*

قواعد

(۱) یہ محض تعلیمی رسالہ ہے جس میں تعلیم کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے سیاسی یا مذہبی مضامین شریک نہ کئے جائیں گے۔

(۲) یہ رسالہ ہر ماہ فصلی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۳) پرچہ وصول نہ ہو تو ہر ماہ فصلی کی ۲۵ تاریخ تک خریدار صاحبان بحوالہ نمبر خریداری مطلع فرمائیں

(۴) جو مضامین ناقابل طبع متصور ہوں گے ان کی واپسی خرچۂ ڈاک کی روانگی پر منحصر ہوگی۔

(۵) اس رسالہ کی قیمت سالانہ (۲) مع محصول ڈاک ہے جو پیشگی لی جائے گی۔

(۶) نمونہ کا پرچہ پانچ آنہ کے ٹکٹ وصول ہونے پر ارسال کیا جائے گا

(۷) جوابطلب امور کے لئے جوابی کارڈ وصول ہونا چاہئے ورنہ ادائی جواب ضروری رہے گی

(۸) اجرت طبع اشتہارات درج ذیل ہے۔ رقم وصول ہونے پر اشتہارات بیع کئے جائیں گے۔

تعداد مدت	صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
ایک بار	۵	۳	۲
سہ ماہ	۱۲	۷	۴
ششماہ	۲۰	۱۲	۷
سالانہ	۳۶	۲۰	۱۲

(۹) جملہ مراسلت و ترسیل رقوم منی آرڈر وغیرہ موسومہ شریک مدیر پتہ ذیل پر ہونی چاہئے

محمد عظمت اللہ خان بی اے شریک مدیر

دفتر رسالہ المعلم بلگرامی ہوز سانچہ توپ

حیدرآباد (دکن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مندرجات

المعلم

(۱) السید جمال الدین و تعلیم — از مولوی سید محمد حسین صاحب بی اے ڈاکٹر انسپکٹر تعلیمات مالک مقبوضہ (۱ تا ۱۶)

(۲) بات کا بتنگڑ — از شریک مدیر (۱۷ تا ۲۷)

(۳) تبصرہ — از شریک مدیر (۲۸ تا ۳۹)

(۴) شذرات — از شریک مدیر (۳۹ تا ۳۲)

جلد ۲ | بابتہ ماہ تیر سنہ ۱۳۳۵ ف | نمبر ۱۱

السید جمال الدین

اور

تعلیم

موجودہ واقعات عالم پر نظر دوڑانے سے جو چیز سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے وہ خطے جہاں اسلامی قومیں ایک مدت مدید سے

خواب غفلت سے اور تعطل ہستی میں ڈالی ہوئی تھیں ان میں بھی کچھ
بیداری اور ہل چل سی پیدا ہو گئی ہے ان قوموں کو سوچ نے
اپنی جگہ قائم رکھنے اور اپنے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے فطری
حق کا احساس اس علمی حد تک ہو گیا ہے کہ وہ اپنے اس حق کے
محفوظ رکھنے کے لئے تیار ہو گئی ہیں اور جان جیسی چیز کو جیسے بزدل
قومیں پستی کی حالت میں بہت عزیز رکھتی ہیں مردانہ وار اپنے
مذہب اپنے وطن اور اپنی قوم پر نثار کرنے کو آمادہ ہیں۔ جن متبرک
ہستیوں نے دور حاضر کی اقوام اسلامی میں اس حقوق شناسی
اور اس سرفروشی کے بیج بوئے ان میں سے ایک بڑی ہستی
سید جمال الدین افغانی کی ہے۔

چونکہ کسی قوم کی بیداری معارف کی ترویج اور علم کے
رواج کے بغیر نہیں ہو سکتی اس لئے یہ لازمی ہے کہ جو لوگ
سوتی قوموں کو جگاتے ہیں وہ بہت بڑی حد تک تعلیم کے حامی ہوتے ہیں
اور ان کے تعلیم کے متعلق خیالات اس سے قیمتی ہوتے ہیں کہ
ان کی نظر تعلیم کی اصلی غرض و غایت پر بالکل علمی پہلو سے پڑتی ہے
یہاں ہمیں سید جمال الدین افغانی کے صرف تعلیمی پہلو سے سروکار ہے۔
سید جمال الدین افغانی کے ایک تعلیمی لیکچر کا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے
یہ لیکچر کلکتہ کے ایک بڑے ہال میں ۱۸۸۲ء میں دیا گیا تھا۔ اس لیکچر میں
جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں وہ آج کل ماہرین تعلیم کے نزدیک
مسلمات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ایسے بڑے لوگ
کس قدر پیش بین دماغ رکھتے ہیں کہ سالہا سال قبل ان کے دماغ آنے والے

سیاسی رجحانات اور منصوبوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اس پہلو سے یہ لیکچر العلم کے ناظرین کے لئے ایک دلچسپ چیز ہوگا۔ اس کے پڑھنے سے ان کے کانوں میں پچاس برس قبل کی ایک آواز گونجنے لگے گی جس کی لطیف خصوصیت یہ ہے کہ ایک پرانی آواز کے باوجود اس کی باتیں آج کل کی سی ہیں۔

اس لیکچر کا ترجمہ فارسی سے مولوی سید محمد حسین صاحب بی اے (آکسن) نے کیا ہے۔ ترجمہ نہایت رواں اور بے ساختہ ہے اور ترجمہ نہیں معلوم ہوتا اور کسی ترجمہ کی بابت اتنا کہنا بہت کچھ کہنے کا حکم رکھتا ہے ہم مترجم صاحب موصوف کو اس ترجمہ کے ساتھ سید جمال الدین افغانی کی سوانح عمری بھی شریک کر دینے پر فرمادی ہے تاکہ ناظرین لیکچر پڑھنے سے پہلے صاحب لیکچر کی زندگی کے نمایاں خد و خال سے بھی روشناس ہو جائیں۔ اس بات سے سید جمال الدین افغانی حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں بھی تشریف لا چکے ہیں اس لئے ان کی سوانح عمری اور لیکچر والی شخصیت سے ہمارے قارئین کیلئے ایک اور دلچسپی کا پہلو نکل آتا ہے۔

شرکت مدیر

سید جمال الدین افغانی کا نام صرف اسلامی دنیا ہی میں مشہور و معروف نہیں بلکہ یورپ کے تمام مستشرقین اور مدبرین سید کے لئے رطب اللسان رہے ہیں مسٹر گیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر برون نے اپنی کتاب انقلاب ایران میں شرح و بسط کیساتھ سید کے حالات لکھے ہیں چنانچہ زیل کے حالات کا ماخذ انہیں کی کتاب ہے۔

سید کی وہ پاک ہستی تھی کہ جس نے دنیا میں اتحاد اسلام (پین اسلامزم) کا تخم بویا اور یہ درخت ہوا اور پھولا پھلا۔ افسوس کہ سید نے اس درخت کو بار آور ہوتے نہ دیکھا

لیکن ان کے بعد کی نسلوں نے اس سے تنزع حاصل کیا اور آج کل اتحاد اسلام (پین اسلامزم) کا جو کچھ بھی چرچا سننے میں آتا ہے وہ سید ہی کی ان تھک زندگی بھر کی کوشش کا نتیجہ ہے

السید جمال الدین افغانی کی حالات زندگی مختلف طور پر مختلف لوگوں نے لکھے ہیں لیکن زیادہ تر مواد عربی میں لکھا گیا ہے مثلاً خود سید مرحوم نے اپنی زندگی کے مختصر حالات اپنی کتاب تردید دہریین کے دیباچہ میں درج کئے ہیں۔ جرجی زیدان کی تالیف مشاہیر الشرق میں بھی ان کی سوانح عمری پائی جاتی ہے۔ ۱۹۱۰ء کے مصری ماہوار رسالہ المنار میں بھی ان کے زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

سید کی ولادت قصبہ اسدآباد[1] حوالی کابل میں ۱۸۳۸ء میں واقع ہوئی یہ حسینی سید تھے اور ان کے اجداد میں مشہور محدث سید علی الترمذی گزرے ہیں۔ سید کہتے تھے کہ ان کے والد نے کابل کی بود و باش اختیار کی ۸ سال کی عمر سے سب سے پہلے کا سلسلہ جاری ہوا اور ان کے والد نے فقہ شرح اور ادب عربی کی تعلیم شروع کی اور اٹھارہ سال تک سید نے ان علوم کے علاوہ دینیات۔ علم کلام۔ بیان۔ منطق۔ فلسفہ حکمت وغیرہ میں کافی تبحر حاصل کر لیا۔ بچپن ہی سے سید بڑے ذہین۔ فہیم اور ذکی واقع ہوئے تھے اور جوں جوں سن بڑھتا گیا یہ پیریں ترقی پاتی گئیں یہاں تک کہ ۱۸ سال کی عمر میں سید نے اپنی تعلیم ختم کر لی۔

---

[1] بعض محققین اور مورخین کے خیال میں سید افغانی نہ تھے بلکہ ایرانی النسل اور ایرانی تھے مثلاً جنرل اوگرسٹن ڈی لیبر جو حالات ایران زمانے جاتے ہیں لکھتے ہیں کہ سید جمال الدین کی پیدائش اسدآباد ضلع کابل میں واقع ہمدان ہوئی بلکہ اسدآباد ضلع ہ ان ایران میں سید پیدا ہوئے اکثر ایرانی بھی یہی رائے رکھتے ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ سید نے خود کو افغانی اس لئے مشہور کیا کہ لوگ ان کو سنی سمجھیں اور سنی ممالک میں انکے کام کی مزاحمت نہ کی جائے اور ایران میں یہی افغانی کہے جانے کی وجہ آزادی نصیب ہی اور ایرانی حکومت کسی وقت بھی ان پر حملہ نہ کر سکی

۱۸ سال کی عمر میں سید ہندوستان آئے [illegible] ایک سال قیام کر کے بعض علوم مغربیہ مثلاً سائنس وغیرہ کا مطالعہ فرمایا۔ اور یہاں سے کہ معظمہ تشریف لے گئے۔ حج سے فارغ ہو کر آپ پھر افغانستان واپس ہوئے اور دوست محمد خاں والی افغانستان کے پاس ملازمت اختیار کی دوست محمد خاں کے انتقال کے بعد افغانستان میں خانہ جنگیاں شروع ہوئیں اور امن و امان اٹھ گیا اس لئے اس ملک سے نکل جانا سید نے مناسب سمجھا اور ۱۸۶۹ء میں مکہ کے سفر کے قصد سے نکلے اور افغانستان کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا۔ یہ سفر سید نے براہ ہندوستان کیا۔ ہندوستان میں گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی لیکن ساتھ ہی مشاہیر ہند سے ان کو ملنے جلنے نہ دیا اور ایک مہینہ کے قیام کے بعد سرکاری طور پر ان کو سوئز بھیج دیا۔

سوئز سے سید قاہرہ پہونچے اور یہاں چالیس دن قیام فرمایا۔ قاہرہ میں سید نچلے نہ بیٹھ سکے بلکہ جامع ازہر میں اکثر جایا کرتے اور (اتحاد اسلام) اور سیاسیات اسلامی پر مخصوص طلباء کو لیکچر دیا کرتے تھے جو برٹش گورنمنٹ کی ناراضی کا باعث ہوا اور سید کو قاہرہ سے نکلنا پڑا

قاہرہ سے نکلکر سید سیدھے قسطنطنیہ پہونچے جہاں علی پاشا وزیر اعظم اور دیگر رؤسا نے ان کا خیر مقدم کیا۔ یہاں چھ مہینے قیام رہا اور اس مدت میں سید نے اپنے تحریروں اور تقریروں سے ترک نوجوانوں کے قلب پر ایسا سکہ جمایا کہ انہوں نے سید کو انجمن دانش کا رکن بنا لیا۔ سید کی روز افزوں عزت ان کا علم و فضل اور ان کے سیاسی خیالات کی وجہ سے جو لوگ ہمیشہ کے لئے ان کے دشمن جان بن گئے تھے انہوں نے سید کو یہاں بھی رہنے نہ دیا۔ حکومت نے حدود ترکی سے نکل جانے کا حکم دیا اور سید ترکی سے روانہ ہو کر پھر مصر پہونچے۔

سید کا ارادہ [illegible] روز آرام لے کر کہیں اور چلے جائیں لیکن ریاض پاشا کے اصرار نے ایک طویل مدت تک قیام کرنے پر ان کو مجبور کیا اور ریاض پاشا کی کوشش سے حکومت مصر نے ماہانہ ایک ہزار پیاستران کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ سید کی علمی قابلیت۔ ریاضت نفس چند ہی روز میں مثل آفتاب کے مصر میں شعاعیں ڈالنے لگیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں علما اور طلبا، کے ان کے مکان پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ گھر دار العلوم بن گیا اور سید نوجوانان مصر کو ادب فلسفہ۔ سیاسیات وغیرہ پر لیکچر دینے لگے۔ اس وقت تک مصر میں ادیب انشا کرتے کہ ان کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا تھا۔ لیکن سید کی تعلیم و تلقین نے وہ شوق پیدا کیا کہ مصر میں متعدد مضمون نگار اور اہل قلم نظر آنے لگے چنانچہ مصر کے مشہور روزنامہ ادیب اور فاضل مفتی شیخ محمد عبدہ سید کے ہی شاگرد رشید تھے سید کی مذہبی اور سیاسی آزاد خیالی نے پھر یہاں کہنہ روشن پیدا کر دئے۔ قدیم خیالات کے ملا ان کے مذہبی خیالات کی وجہ سے مخالف بن بیٹھے اور ان کے سیاسی خیالات نے حکومت کو بدظن کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر سید کو مصر سے کوچ کرنا پڑا۔

۱۸۷۹ء میں سید مصر سے نکلے اور دوسری دفعہ ہندوستان وارد ہوئے اور حیدر آباد دکن بھی آئے اور چند روز قیام فرمایا اس وقت نواب سر سالار جنگ مختار الملک بہادر عموم دکن کے مدار المہام تھے اور انھوں نے سید کی بڑی عزت و قدر افزائی فرمائی اسی زمانہ قیام حیدر آباد میں نواب صاحب مرحوم کی تحریک پر سید نے رسالہ تردید مادیین تحریر فرمایا۔

حیدر آباد سے سید کلکتہ روانہ ہوئے اور چند روز قیام فرمایا چنانچہ اسی زمانہ میں وہ لیکچر تعلیم پر دیا جس کا ہم نے ترجمہ کیا ہے۔

کلکتہ سے سید راہی لندن ہوتے اور وہاں چند روز رہ کر پیرس چلے
پیرس میں ان کا قیام مسلسل تین سال تک رہا۔ پیرس میں ہی ان کی اور شیخ محمد عبدہ
ملاقات ہوئی اور ان دونوں نے متفقہ طور پر ایک ہفت روزہ عربی سیاسی اخبار عروۃ الوثقیٰ
شایع کرنا شروع کیا۔ چونکہ اس اخبار میں انگریزوں کے خلاف مضامین شایع ہوتے تھے
اس لئے انگریزی حکومت کی کوشش سے یہ پرچہ ایک سال کے اندر ہی بند کر دیا گیا۔
پرچہ کے بند ہو جانے سے سید کا جوش مطلق ٹھنڈا نہ ہوا بلکہ تقریر کے ذریعہ سے
فرانس میں اپنے سیاسی خیالات کو پھیلانا شروع کیا اور وہ شہرت حاصل کی کہ سیاسیات
انگلستان۔ ترکی۔ مصر اور ایران کے متعلق سید کے خیالات بطور سند انگریزی اخبارات
پیش کئے جانے لگے۔ اور انگریزی مدبرین وقت کو سید کی زبردست ہستی اور
شخصیت کو ماننا پڑا۔

پیرس سے سید ماسکو اور پیٹروگراڈ پہونچے جہاں نہایت گرم جوشی سے ان کا
استقبال کیا گیا۔ روس میں چار سال رہے۔ سید کا قیام روس میں بیکار ثابت نہیں ہوا
اس وقت تک روس کی مسلمان رعایا کو قرآن طبع کرنے یا مساجد بنانے کی اجازت نہ تھی
سید نے اپنی ذہانت اور سیاست سے کچھ ایسا منتر پڑھا کہ مسلمانان روس کو قرآن
طبع کرانے اور مساجد تعمیر کرکے آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی امور بجالانے کی اجازت
زار روس سے دلادی۔ یہ ایک ایسی اسلامی خدمت سید نے انجام دی ہے کہ دنیا بھر کے
مسلمان اسے احسانمندی سے یاد رکھیں اور ہمیشہ سید کے لئے دعاء مغفرت کریں

ناصرالدین شاہ قاچار شاہ ایران کے اصرار پر سید ایران گئے اور وہاں پھر سیاسی
اور ادبی مشغلہ شروع کیا اور چند ہی روز میں نوجوانوں کا حلقہ بنا لیا جس میں
چند قابل ذکر ہیں۔ شیخ علی قزوینی قاضی عدیل۔ میرزا آقا خان مدیر اختر۔

مرزا رضا خاں قاتل ناصر الدین شاہ۔ شاہ ایران کو سید سے خوف پیدا ہوا اور شاہ نے نہایت ذلت اور دشمنی کے ساتھ سید کو ایران سے بصرہ روانہ کر دیا۔ سید کا اس طرح ایران سے اخراج ان کے ثانیین کی برہمی کا باعث ہوا اور یہ بات بھی بجملہ اور اسباب کے ناصر الدین شاہ کے قتل کا ایک سبب خیال کی جاتی ہے۔

ایران سے نکلکر مختلف ممالک میں گھومتے ہوئے ۱۸۹۱ء میں سید پھر لندن پہونچے اور یہاں ان کا وقت ایران کے سیاسی حالت پر لیکچر دینے اور مضامین لکھنے میں صرف ہوا۔

۱۸۹۲ء میں سید لندن سے قسطنطنیہ روانہ ہوئے اور اس دفعہ قسطنطنیہ پہنچکر دسمبر قیام فرمایا۔ سلطان عبد الحمید نے ان کی بڑی عزت کی معقول وظیفہ مقرر کیا اور مکان اور سواری عنایت کی گئی۔ سید سلطان کو ہمیشہ مشورہ دیا کرتے اور سلطان بھی سید کے مشورہ پر عمل کیا کرتے تھے۔ ۱۸۹۳ء سید کو سرطان ہوا عمل جراحی کیا گیا جو ناکامیاب ہوا اور ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو سید کی تمام دنیوی تکالیف کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تجہیز و تکفین بڑے تزک و احتشام سے عمل میں آئی اور مقبرہ شیوخ واقع قسطنطنیہ میں سپرد خاک کئے گئے ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھی مرنے والے میں

سید کی مختصر سوانح عمری کے بعد اب ہم ان کی تقریر کا ترجمہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

لہ مرزا رضا خاں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ شخص بابی تھا اور مذہبی اختلاف کے وجہ ناصر الدین شاہ کو قتل کیا۔ یہ خیال بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ مرزا رضا خاں کا وہی مذہب تھا جو شاہ کا ہو سکتا تھا جو صاحب اس شخص کے مفصل حالات دیکھنے کے شائق ہوں انہیں پروفیسر براون کی کتاب انقلاب ایران میں اس کا اظہار دیکھنا چاہیے۔ یہ جواب عدالت کے سامنے دیا ہے۔

تقریر

اے جامعہ ملیہ کے نوجوانو! تمہاری کثیر تعداد کو اس وقت یہاں دیکھ کر مجھے اس قدر مسرت ہو رہی ہے کہ بیان سے باہر۔ تم فضل و کمال سے آراستہ اور تحصیل علم کی جد و جہد میں لگے ہوئے ہو۔ تم نونہالوں کو دیکھکر میں کیسے خوش نہ ہوں۔ تم اس سرزمین ہند کے سپوت ہو جو مہد انسانیت اور گہوارہ آدمیت ہے۔ انسانیت اس خطہ ارض سے تمام عالم میں پھیلی۔ تمہارا ہی وہ وطن ہے جہاں دائرہ معدل النہار معین ہوا۔ تمہارا ہی وہ وطن ہے جہاں معدل النہار سے منطقۃ البروج کا تعین کیا گیا اور یہ امر بدیہی ہے کہ جب تک تمہارے اسلاف علم ہندسہ میں کامل نہ ہوتے ان دو دائروں کا تعین نہ کر سکتے۔ پس معلوم ہوا کہ علم حساب اور ہندسہ کے موجد ہندی ہی تھے۔ دیکھو یہ علم کس طرح ہند سے عرب اور عرب سے یورپ میں منتقل ہو گیا۔ تم اس سرزمین کے ہونہار ہو جو ایک زمانہ میں قوانین اور آداب عالم کے لئے شہرہ آفاق تھی اور دنیا ان امور میں اس کی خوشہ چینی کرتی تھی مثلاً مجموعۂ قوانین ملت روما (کوڈ رومایا) کو دیکھو جو تمام فرنگی کوڈوں کی ماں کہلاتی ہے اس کے اکثر اصول تمہارے چاروں ویدا اور شاستر سے لئے گئے ہیں۔ اسی طرح شعر و سخن فلسفہ میں تمہارے اسلاف کا وہ درجہ تھا کہ یونانیوں نے ان کی شاگردی کی۔ مثلاً ایک نامی گرامی شاگرد فیثاغورس گزرا ہے کہ جس نے یونان میں علوم و معارف کے وہ سب پھول بکھیرے جو اس نے ہند کے گلشن علوم سے چنے تھے۔

خاک ہند وہی ہے اور ہوا وہی اور تم نوجوان جو اب موجود ہو اسی مٹی اور اور پانی کے بنے ہوئے ہو۔ میرے لئے یہ بات باعث مسرت ہے کہ تم خواب گراں سے بیدار ہو کر اپنے آباؤ اجداد کے ورثہ کے جانب رجوع اور ان کے بوئے ہوئے درختوں کے پھل چننے کے لئے کمربستہ ہو گئے ہو۔

نوجوانو۔ اب میں چاہتا ہوں کہ علم و تعلیم کے متعلق تم سے کچھ کہوں۔ علم کے متعلق گفتگو کرنا آسان کام نہیں۔ علم کے لئے کوئی حد و پایاں نہیں۔ علم کی خوبیاں لامتناہی ہیں۔ انسانی افکار جو متناہی ہیں لامتناہی پر احاطہ نہیں کر سکتے۔ علاوہ اس کے حکماء اور علماء علم کی تعریف اور فضائل علم پر دفتر کے دفتر لکھ چکے ہیں۔ پس میرے لئے کس قدر مشکل ہے کہ اس بحث پر زبان کھولوں لیکن بغیر کچھ کہے رہا نہیں جاتا۔ آگاہ ہو سلطان عالم علم ہے۔ بغیر علم کے سلطنت اور حکومت کسی کو ملی ہے نہ اب ملسکتی ہے اور نہ آیندہ ملے گی۔

قاتحین کلدانیاں پر نظر ڈالو یہ وہ لوگ تھے کہ جو حدود تاتار و ہند کے قریب پہونچ گئے تھے یہ فتوحات کلدانیوں کی وجہ سے نہ ہوئیں بلکہ فی الحقیقت علم و دانش کی فتح تھی۔

مصریوں کو دیکھو جنہوں نے اپنے ملک کو اس قدر وسعت دی تھی کہ بین النہرین (میسوپوتامیا) اور ایک روایت سے ہندوستان تک ان کے حکومت کے ڈنکے بج چکے تھے۔ یہ مصری نہ تھے جنہوں نے حکومت کی بلکہ ان کا علم تھا۔

فینیقیان کی حالت پر غور کرو کہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ذریعہ کس طرح انگریزی جزائر اور بلاد ہسپانیہ اور پرتگال اور یونان پر اپنا سکہ بٹھایا۔ حقیقت میں قوت فینیقیوں کی نہ تھی بلکہ وہ ان کا علم تھا جس نے ان کی قوت اور طاقت کو اس قدر بڑھا دیا تھا۔

وہ اسکندر نہ تھا جو کہ یونان سے ہندوستان آیا اور ہندیوں پر غلبہ پایا بلکہ جس چیز نے ہندیوں کو شکست دی وہ یونانیوں کا علم تھا۔

یہ فرنگی جو اب ہر جگہ عمل دخل رکھتے ہیں اور حکمرانی کر رہے ہیں مثلاً انگریز ہند میں فرانسیسی مراکش میں تو یہ دراصل انگریزوں یا فرانسیسیوں کی حکومت نہیں ہے بلکہ علم ہے جو ہر جگہ ان کی عظمت و شوکت ظاہر کر رہا ہے اور جس کے ذریعہ یہ آئے دن دراز دستی

اور ملک گیری کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس جہل کو علم کے مقابلہ میں ہمیشہ ذلت و خواری نصیب ہوئی ہے۔ جہلا ہمیشہ علماء کے دست نگر۔ محتاج اور محکوم رہے ہیں۔ پس حقیقتاً علم کی حکمرانی دنیا میں رہی اور رہے گی۔ علم وہ بادشاہ ہے کہ جس کی بادشاہی کو کبھی زوال نہیں ہوا البتہ یہ بادشاہ اپنے پائے تخت کو بدلتا رہا ہے۔ اس نے کبھی مشرق کو دار الخلافہ بنایا تو کبھی مغرب کو۔

حکومت کو چھوڑ کر اگر ثروت و دولت پر ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی ملک کی دولت و ثروت نتیجہ ہوتی ہے تجارت صناعت اور زراعت کا فن زراعت بغیر علم فلاحت و علم کیمیا و نباتات و ہندسہ حاصل نہیں ہوتا صناعت حاصل نہیں ہوتی جب تک طبعیات۔ کیمیا جر اثقال ہندسہ اور حساب پر دسترس نہ ہو۔ تجارت مبنی ہے صناعت و زراعت پر پس معلوم ہوا کہ تمام ثروت اور دولت نتیجہ ہے علم کا۔

انسان کی برتری دوسرے مخلوقات پر اس کے علم کی وجہ سے ہے اگر انسان سے علم کا جوہر مفقود ہو جائے تو پھر انسان اور حیوان میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ علم کی یہ قوت ہے کہ ایک کو دس کی اور ہزار کو دس ہزار کی قوت عطا کرتا ہے یعنی ایک عالم دس جہلا اور ہزار علما دس ہزار جہلا پر بھاری ہوتے ہیں۔ پس ہر حکومت کے لئے لازم ہے اپنی بقا فلاح اور بہبود کے لئے تاسیس علوم اور نشر معارف میں کوشاں رہے۔ جس طرح ایک باغبان کے لئے لازمی ہے کہ اپنے فائدہ کے لئے ہمیشہ درختوں کی رکھوالی کرے اور بموجب قانون فلاحت زمین کی تسطیح اور نباتات اور اشجار کی دیکھ بھال کرتا رہے اسی طرح حکام کو لازم ہے کہ رعایا کی تعلیم میں کوتاہی نہ کریں اور بخل سے کام نہ لیں اگر کوئی بادشاہ جہلا اور حفاۃ کا حکمراں ہو تو اس کے لئے کون فخر کا مقام ہے اور اس حکومت کو حکومت کیونکر کہا جا سکتا ہے!!

اب میں چاہتا ہوں کہ علم کے مراتب تم سے بیان کروں۔

ہر علم کا ایک خاص موضوع ہوتا ہے اور ہر علم اپنے موضوع کے لوازم اور عوارض ذاتیہ
اور دوسرے امور سے بحث نہیں کرتا مثلاً علم فزیک طبعیات بحث کرتا ہے ان اجسام اور
ان کے کیفیات اور خواص سے جو عالم خارج میں موجود ہیں اور دوسرے امور سے جو عالم
انسانی میں موجود ہیں اس کو کوئی مطلب نہیں علم کیمیا اجسام کے ان خواص کے متعلق ہے
جس سے ان میں تحلیل و ترکیب واقع ہوتی رہتی ہے۔ علم نباتات میں صرف نباتات سے
بحث ہوتی ہے اور اسی طرح دوسرے علوم کا حال ہے۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ
علوم مختلفہ کا تعلق ایک دوسرے سے ہے یعنی کسی ایک علم کے حاصل کرنے کے لئے اور علوم کے
بعض امور سے واقف ہونا ضروری ہے کوئی علم ایسا نہیں جو تنہا اپنی حفاظت کرے اور
عالم انسانی کو نفع بخش سکے۔ مثلاً حساب اور ہندسہ اور جغرافیہ اور تاریخ کا ارتباط
دیکھو کہ حساب کے بغیر ہندسہ اور جغرافیہ کے بغیر تاریخ کی تعلیم ممکن نہیں اس سے یہ
نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسا بھی کوئی علم چاہیئے جو سب علوم کے لئے بمنزلہ روح رواں ہو اور
ان کی صیانت کرے اور ان کی ترقی کا سبب ہو سکے۔ میرے خیال میں جو علم بمنزل روح
جامع ہو سکتا ہے وہ فلسفہ یعنی حکمت ہے کیونکہ فلسفہ ہی وہ چیز ہے جس کا موضوع عام ہے
جو انسان کو لوازم انسانی سے باخبر کرتا اور دوسرے علوم کے حاصل کرنے کی ضرورت کو ظاہر
کرتا ہے۔ اگر کسی قوم میں فلسفہ کا وجود نہ ہو اور دوسرے ایسے علوم موجود ہوں جن کے
موضوع خاص ہیں تو یہ علوم ایک قرن بھی زندہ نہ رہیں گے اور وہ قوم بغیر روح فلسفہ کے
دوسرے علوم سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گی۔ مصر اور روم میں مدارس کو قائم ہوئے
ساڑھے سات سال گزر چکے لیکن تعلیم میں خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی اور اس کا سبب کیا ہے۔
یہی کہ نصاب میں فلسفہ کی تعلیم شریک نہیں کی گئی۔ اگر جسم تعلیم میں فلسفہ کی روح پھونک
دی جاتی تو اس وقت تک بلاد فرنگ کے یہ لوگ محتاج نہ رہتے اور اپنے ممالک کی
اصلاح کی جانب گام زن ہو جاتے اپنی اولاد کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے بلاد فرنگ بھیجتے

اور دارالعلوم اور مدارس کے لئے فرنگی مدرسین بلانے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔

جب کسی قوم میں فلسفہ کی روح آجاتی ہے تو اس کو دوسرے علوم حاصل کرنے کی جانب مائل اور راغب کر دیتی ہے۔ صدر اول کے مسلمان موجودہ علوم کے لحاظ کرتے تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن اسلام نے کچھ ایسی فلسفہ کی روح ان میں پھونک دی تھی کہ اس کے واسطے سے مسلمان خاص علوم کے حاصل کرنے پر مجبور ہو گئے اور بتدریج مختلف علوم پر وہ عبور حاصل کر لیا جو یادگار روزگار ہو گیا۔

فلسفہ ہی وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتا اور انسان کا شرف دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں ظاہر کرتا ہے۔ جب کسی قوم سے فلسفہ کی روح پرواز کر جاتی ہے تو پھر اس میں ادبار و انحطاط کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں اور اس قوم سے بتدریج مختلف علوم و فنون مفقود ہونے لگتے ہیں۔ معاشرت بگڑ جاتی ہے یہاں تک کہ وہ قعر مذلت میں جا پڑتی ہے

یہاں تک تو میں نے علوم کے مراتب اور فلسفہ کے فوائد بیان کئے اب چاہتا ہوں کہ اس دور کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر نظر ڈالوں۔

صاحبو! فی زمانہ مسلمانوں کی تعلیم کا طریقہ شروع سے آخر تک بگڑا ہوا ہے مثلاً عربی کو لیجئے عربی تعلیم کا مفہوم علم نحو کا حاصل کرنا سمجھا جاتا ہے۔ علم نحو کے حاصل کرنے کا اصلی منشا اور مقصد یہ ہے کہ صحیح طور پر زبان کا بولنا اور لکھنا پڑھنا آجائے اور بس لیکن مسلمان طلباء کا تمام وقت اس کی لایعنی بحثوں اور فیلسوفانہ افکار میں صرف ہو جاتا ہے اور عمر بھر عربی پڑھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو عربی میں دو جملے صحیح بول سکتے اور نہ لکھ سکتے ہیں حتیٰ اینکہ دو سطر بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے۔

علم معانی و بیان جس کو ادبیات کہتے ہیں اور جس کی تحصیل سے انسان منشی خطیب اور شاعر ہو سکتا ہے اس کا یہ حال ہے کہ عمر تمام پڑھنے کے بعد روزمرہ کی گفتگو پر بھی طالب علم قادر نہیں ہوتا۔

علم منطق جو میزان افکار کہا جاسکتا ہے اور انسان کو حق اور باطل صحیح اور فاسد کا امتیاز کرنے پر قادر کرتا ہے اس کا اثر مسلمان منطقیوں پر یہ ہوا کہ ان کے دماغ طفلانہ خرافات اور واہیات سے مملو پائے جاتے ہیں اور ان کے اور بازاریوں کے افکار میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔

علم حکمت جس کا تعلق موجودات خارجیہ کے اصول کی بحث سے ہے اور جو ان کے علل و اسباب۔ لوازم و ملزوم کو بیان کرتا ہے اس میں مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے کہ صدرا اور شمس البازغہ پڑھ لیا اور خود کو حکما سمجھنے لگے حالانکہ دائیں بائیں کا فرق نہ معلوم ہوا اور نہ اتنی بھی صلاحیت پیدا نہ ہوئی کہ معلوم کرسکیں کہ خود کیا ہیں کون ہیں اور ان کو دنیا میں کیا کرنا چاہیے۔ کبھی بھولے بھی نہ پوچھا کہ آخر یہ تار برقی کیا ہے۔ کشتی بخاری کیا چیز ہے ریل کیسے بنتی اور چلتی ہے۔

صاحبو! میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب میں ان لوگوں کا خیال کرتا ہوں جو چراغ لئے شام سے صبح تک شمس البازغہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور کبھی اس بات پر غور نہیں کرتے کہ اگر چراغ کی چمنی نکال دیجائے تو کیوں چراغ دھواں دینے لگتا ہے اور چمنی لگادینے سے دھواں موقوف ہوجاتا ہے۔ تف ہے ایسے حکما پر اور تف ہے ایسی حکمت پر کہ یہ حکیم وہ ہے جو حوادث اور اجزائے عالم پر غور کرسکے نہ کہ اندھوں کی طرح راستہ چلے جن کو منزل مقصود سمجھائی نہیں دیتی۔

مسلمانوں کا علم فقہ حاوی ہے تمام حقوق بلدیہ اور دولیہ پر پس چاہیے تھا کہ مرد فقیہہ صدر اعظم یا سفیر کبیر ہوسکتا حالانکہ ہم اپنے فقہا کو دیکھتے کہ اپنے گھروں کا انتظام کرنے سے قاصر ہیں اور اپنی بلاہت کو باعث فخر سمجھتے ہیں۔

علم شریعت درحقیقت حکمت قوانین سے واقف کرتا ہے اور مختلف احکام کے علل منفعت اور مضرت کو ظاہر کرتا ہے لیکن حالت یہ ہے کہ ہمارے شارحین

قرآن و قرآنی [illegible] سے محض عاری ہیں۔

سرحد ہمارے علمائی حالت ایک باریک فتیلہ کی ہے کہ اس پر ایک کمزور شعلہ ٹمٹما رہا ہے جو نہ تو اپنے اطراف روشنی پہونچا سکتا ہے اور نہ دو میلوں تک اس کی روشنی پہونچ سکتی ہے۔ عالم اگر حقیقی عالم ہو تو اس کی مثال ایک نور کی ہو سکتی ہے کہ جس کی روشنی تمام عالم پر پھیلتی ہے اگر تمام عالم کو منور نہ کرے تو اقلاً اپنے گھر یا اپنے قریہ یا اپنے شہر کو وہ روشن کر سکتا ہے۔ یہ ہمارے علمائیسے ہیں کہ چراغ تلے اندھیرے کی مثال ان پر صادق آتی ہے!!

افسوس اور عجب تو یہ ہے کہ ہمارے علمانے علم کی دو قسمیں قرار دے رکھی ہیں ایک کو علم مسلمانان اور دوسرے کو علم فرنگ کہتے ہیں اور اس طرح بعض مفید علوم کے حاصل کرنے سے لوگوں کو منع کرتے ہیں۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ علم وہ شریف چیز ہے جو کسی طائفہ سے مخصوص نہیں اگر کوئی طائفہ یا قوم مشہور اور معروف ہوتی ہے تو علم کے ہی سبب سے اور انسان اگر پہچانے جاتے ہیں تو علم و فضل کی وجہ سے نہ کہ علوم و فنون انسانوں کی وجہ سے۔ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ مسلمان ان علوم کو جو ارسطو اور افلاطون سے منسوب ہیں غایت رغبت کے ساتھ سیکھتے ہیں لیکن اگر عالیلہ (گیلیلو) قوتوں۔ اور کیپلر کے علوم کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی جائے تو اسس کو کفر سمجھتے ہیں۔

حق وہ ہے جو دلیل و برہان رکھے۔ جو علما علوم و معارف کے حاصل کرنے سے منع کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ حفاظت اسلام کر رہے ہیں حالانکہ فی الحقیقت وہ اسلام کے دشمن ہیں۔ وہی مسلمان اسلام کے محافظ ہو سکتے ہیں جو علوم و معارف مختلفہ سے آشنا اور واقف ہوں۔

امام غزالی اپنی کتاب منقذ من الضلال میں لکھتے ہیں کہ

"آن شخصیکہ میگوید کہ دیانت اسلامیہ ... ادلہ ہندسیہ ... فلسفیہ وقواعد طبیعیہ است آن شخص دوست جاہل اسلام است ... ضرر این دوست جاہل بر اسلام زیادہ است از ضرر زندیق ... ودشمن ہائے اسلام۔ چونکہ قواعد طبیعیہ وبراہین ہندسیہ وادلہ فلسفیہ از جملہ بدیہیات است پس کسے کہ گوید کہ دین منافی بدیہیات است پس لامحالہ حکم بر بطلان دین خود کردہ است"

الحاصل مسلمانوں کی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہمارے روسا دین خود اپنی اصلاح نہ کریں اور علوم ومعارف سے خود بہرہ ور نہ ہوں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلے خرابی وتباہی ہمارے علما اور روسا دین میں واقع ہوئی اور ان سے یہ عام مسلمانوں میں سرایت کرتی گئی۔

التماس | بعض خریدار صاحبان سے چندہ من ابتدائے ۱۳۳۳ف ابتک وصول نہیں ہوا ہے جس کے بلذریعہ علیحدہ ارسال خدمت ہو چکے ہیں۔ امید ہے ہمارے کرم فرماؤں سے امید ہے کہ بہت جلد ارسال چندہ سے ممنون فرمایا جائے گا خصوصاً ایسے وقت جب کہ حسابات سال دوم ماہ امرداد ۱۳۳۵ف میں بند کردے جائینگے اور شہریور ۱۳۳۵ف سے العلم کا تیسرا سال شروع ہوگا ۱۲

شریک مدیر

بات کا بتنگڑ

ممالک محروسہ سرکار عالی میں حسب ذیل نوعیتوں کے مدارس ہیں:۔

(۱) مدارس شاہی۔

(۲) مدارس مسلمہ امدادی۔

(۳) مدارس مسلمہ غیر امدادی۔

(۴) مدارس خانگی۔

پہلی تین قسموں کے مدارس نصاب سرکاری کے مطابق تعلیم دیتے ہیں اور افسران تعلیمات ان کا معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن چوتھی قسم کی درس گاہوں میں اگر ان کو درسگاہ کہا جائے۔ نہ تو کوئی اصولی نصاب ہی ہے نہ ان کا معائنہ ہو سکتا ہے اور نہ ان کے متعلق اعداد و شمار فراہم ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ مدارس مکتب اور پاٹ شالے ہیں جن کو ملا نے مفتی یا پنڈت نے اوقات کے لئے قائم کر لیتے ہیں۔ ان مدارس کے متعلق نصاب اور اعداد سے باخبر ہونے اور ان میں جہاں تک ممکن ہو اصول تعلیم اور حفظان صحت کے مطابق اصلاح کرنے کی غرض سے سرکار عالی نے قواعد و ضوابط منظور فرمائے ہیں۔ ان قواعد و ضوابط کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے اور قارئین کرام سے استدعا کی جاتی ہے کہ کسی قسم کی رائے قائم کرنے سے پہلے وہ ان قواعد اور ضوابط کو غور سے پڑھ لیں۔ ان قواعد کے متعلق بعض حلقوں میں غیر معمولی شور مچایا جا رہا ہے اور ان قواعد کے متعلق یہ غلط فہمی پھیلائی گئی ہے کہ ان کا منشاء یہ ہے کہ مدارس کو مسدود کیا جائے اور یہ کہ سررشتہ تعلیمات ایک تحقیری پالیسی اختیار کر رہا ہے غرض یہ قواعد اسی قسم کے اندھے اور غیر ذمہ دارانہ اعتراضات کے ہدف بن گئے ہیں

جیسے کہ آج کل کی صحافت اور پبلک تحریکات ان میں بہ واعد
پڑھنے میں آتے ہیں۔ ان قواعد کی زبان اور مطالب اس قدر واضح ب
خواہ مخواہ غل مچانے اور نکتہ چینی کو جی نہ چاہئے ان قواعد کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی پیدا
نہیں ہو سکتی۔ یہ بات خوب ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ یہ قواعد ان مدارس کے
متعلق ہیں جن کو پرانے خیالات کے مطابق مکتب اور پاٹ شالے کہنا چاہئے جہاں
کٹ ملا اور دقیانوسی پنتلو باقاعدہ راگ کے ساتھ پہاڑے یاد کراتے ہیں اور جہاں
عموماً لڑکے ملا یا پنتلو کی جانگی غلامی کے سوا اور کوئی دماغی یا جسمانی فائدہ حاصل کر کے
نہیں نکلتے۔ سرکار عالی ان مکتبوں اور پاٹ شالوں کو بھی بند کرنا نہیں چاہتی
بلکہ ان قواعد کے تحت صرف یہ چاہتی ہے کہ ان مکتبوں اور پاٹ شالوں میں
جہاں تک ممکن ہو اصول تعلیم اور حفظان صحت کا لحاظ رکھا جائے تاکہ ملک کے
نونہالوں کے دماغ پہاڑوں کی رٹن اور پرانی الف بے کی جہت سے محفوظ ہو جائیں
اور ان کے اچھوتے جسم تنگ و تاریک بدبودار اور سڑاند بھری کٹھڑیوں میں کی
زہر آلود ہوا سے بچ جائیں اور ان مکتبوں اور پاٹ شالوں کی بلا روک ٹوک
بری صحبت سے ان نونہالوں کی روحیں غیر فطری منافی اخلاق اوضاع
واطوار اور آوارگی کے بیج قبول نہ کریں۔

ممالک محروسہ سرکار عالی میں جو مدارس خانگی اس زمانہ کے نصاب کی
تعلیم دیتے ہیں وہ یا تو امدادی ہیں یا مسلمہ ہیں یعنے ان کے طلبا بہ حیثیت سرکاری
طلبا کے سرکاری امتحانات میں شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایسی درسگاہیں
بھی ہیں جہاں خالص مذہبی تعلیم ہوتی ہے اور ان کے منتظمین اعداد و شمار
ہر سال سررشتہ تعلیمات کو فراہم کر دیتے ہیں۔ زیر بحث قواعد و ضوابط کو ان
مدارس سے بھی سروکار نہیں۔ بلکہ سرکار عالی کا منشا ان قواعد سے صرف یہ

ان مدارس کے علاوہ اور جو مکتب یا پاٹ شالے ہیں ان کے متعلق بھی
معلومات بہم ہو جائے اور ان پر بھی سررشتہ تعلیمات کی نگرانی کی ایک صورت
پیدا ہو جائے جس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ تعلیم میں حفظان صحت کی بابت کچھ نہ کچھ اصلاح
ضروری ہو جائے گی۔ اس گشتی پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں ان میں سے دو اہم اعتراض
جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے یہ ہیں کہ ان قواعد سے منشا یہ ہے کہ مدارس مسدود
کئے جائیں اور یہ کہ سررشتہ تعلیمات کی یہ پالیسی گویا الٹی گنگا بہانا ہے یعنی پاسی
بنا جانے کا ثبوت ہے۔ جہاں تک تعلیم کے نقطہ نظر سے تعلق ہے یہ دو اعتراض
اگر واقعی ثابت ہوں تو اس گشتی کے خلاف نہایت زبردست اعتراض بن جاتے ہیں
لیکن اس گشتی کے خلاف غل پکار میں ایک بڑے لطف کی بات یہی ہے کہ تعلیمی اصول کے
پہلو سے ان قواعد و ضوابط پر نہ صرف کوئی اعتراض ہی وارد نہیں ہوتا بلکہ اس گشتی کے
ایک ایک لفظ کی تائید ہوتی ہے۔ یہ بات اوپر واضح کر دی گئی ہے کہ مدارس خانگی کی
مراد ان مکتبوں اور پاٹ شالوں سے ہے جو دقیانوسی طریقہ پر چند پیٹ کے ملے
ملا اور پنتلو قائم کر لیتے ہیں۔ ان نام نہاد مدارس کی حالت سے اب بھی قارئین میں سے
اکثر لوگ بخوبی واقف ہیں۔ ان میں ملا یا پنتلو بوجھ سمجھکر بن کر ہاتھ میں تسمہ یا کوئی
چھڑی لئے اس تمکنت اور وقار سے شاگردوں کے بیچ میں موسم گرما میں ننگ
دھڑنگ توند نکالے بیٹھے ہوئے ہیں کہ گویا ان پر علمی تبحر اور دانشمندی ختم ہو گئی ہے
ملا اور پنتلو کی اس بھاری بھرکم شان کا گاؤں یا محلہ کی مستورات اور ناخواندہ مردوں پر
ایسا اثر پڑتا ہے کہ وہ ان کو فاضل پور بھے سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر ان گنوار اور علم سے
معصوم ماں باپ کے بچے اس شان و تمکنت کے ملا یا پنتلو کی تعلیم تربیت کے
بعد بھی کورے کے کورے رہیں تو یہ بھولے ماں باپ یہی سمجھتے ہیں کہ اس میں
ملا جی یا پنتلو کی تعلیم کا قصور نہیں بچوں کے ہی پھوٹے کرم ہیں کہ ایسے استاد سے بھی

کچھ سیکھ نہیں سکے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس زمانہ کی ترقی کی تیز دوڑ
ملک کے بچوں کی ایک بڑی تعداد کو ایسے ملانوں اور پنتلوں کی جہالت
چھوڑ دیا جائے۔ اس عہد میں سخت ضرورت ہے کہ ملک کا ہر فرد کار آمد اور کارگزار
بن جائے تاکہ ملک کی قوت اور پیداوار میں راست یا بالواسطہ اضافہ ہو۔ ممالک محروسہ
سرکار عالی میں بفضلہ تعالی دور عثمانی کی برکتوں نے جدید نظام تعلیم کا جال سارے
ملک میں ڈال دیا ہے لیکن پھر بھی ملک کے نونہالوں کی معقول تعداد اس جال کے
پھندوں میں سے نکل جاتی ہے اور کندۂ ناتراشیدہ رہتی ہے۔ اب وقت
آگیا ہے کہ اس جال کے پھندے اس قدر تنگ کئے جائیں کہ مدرسہ کے قابل
سن کے بچے نظام تعلیمی سے بچ نہ سکیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ علاوہ ان بچوں کے
جو مدارس شاہی امدادی یا مسلمہ میں باقاعدہ تعلیم پاتے ہیں ایسے کم سن اطفال بھی
اصول تعلیم کے مطابق صحت بخش ماحول میں علمی شد بد حاصل کر سکیں جو ملانوں اور
پنتلوں کے بے کمال ہاتھوں میں خراب ہو رہے ہیں چنانچہ سرکار عالی نے بجا طور پر
ان قواعد و ضوابط کو ضروری سمجھا اور یہ جانتے ہوئے کہ ابھی ہمارے ملک میں نئے
تعلیمی رجحانات اور ان کے دور رس تعلیمی نتائج کو عام طور پر کما حقہ سمجھا نہیں جاتا
سرکار عالی نے اس تدبر سے کام لیا کہ ان خانگی مدارس کو دفعتہً مسدود نہ کیا حالانکہ
یہ بے اصول مکتب اور پاٹ شالے تعلیمی اور صحتی پہلو سے سخت مضر ہیں اور ان کو
کبھی کا بند ہو جانا چاہئے تھا۔ بلکہ پہلا قدم یہ قرار دیا کہ ان پر ایک طرح کی نگرانی قائم ہو جائے
ان کے متعلق اعداد اور حالات معلوم ہو جائیں اور پھر آئندہ رفتہ رفتہ ان کی اصلاح
کی جائے۔ جیسا کہ کہیں عرض کیا گیا ہے مطمئن ہے کہ سرکار عالی کے اس تدبر اور
حالات کو ملحوظ رکھنے کے باوجود اعتراض یہ پیش کیا جاتا ہے کہ سرکار عالی ان مدارس کو
مسدود کرنا چاہتی ہے اور چونکہ مدارس کو مسدود کرنا چاہتی ہے لہذا سررشتہ تعلیمات کی

ی ہوتی ہے۔ اس منطق کا لطف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو نفسیات سے
واقف ہیں۔ وہی ان طریقوں کو سمجھتے ہیں جن سے عامۃ الناس میں تحریک
پیدا کی جا سکتی ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان مدارس خانگی یعنی بے اصول
مکتبوں اور پاٹ شالوں کو سرکار عالی برخاست بھی کرنا چاہے تو بھی یہ نتیجہ کبھی نکل سکتا کہ
محکمہ یا حکومت کی پالیسی الٹ گئی ہے کیونکہ جدید اصول تعلیمی کے لحاظ ان سب برائے نام
مدارس کا وجود زیادہ نقصان رساں ہے۔ اور اس قسم کے مکتبوں اور پاٹ شالوں کا
ہر نرب اور شایستہ ملک کے تعلیمی اصول کے مطابق بند ہونا ہی مستحسن ہوگا
جو لوگ اس قسم کے مکتبوں اور پاٹ شالوں کو قائم رکھنا چاہتے ہیں در اصل ان کا
اصول قہقری ہے وہ خود گھنٹے کی سوئیاں پیچھے کو لے جانی چاہتے ہیں۔ کس قدر
مزے کی بات ہے کہ محض بحث کی گرما گرمی میں ایسے اصحاب بھی جن کی کل تعلیمی پونجی
جدید طرز کے نظام تعلیمی کی بدولت حاصل ہوئی ہے جن کا رہنے سہنے اٹھنے بیٹھنے
کھانے پینے کا طریقہ بھی یورپی ہو گیا ہے وہ لوگ یورپی لباس میں کھڑے ہو کر
ڈنکے کی چوٹ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ان مکتبوں اور پاٹ شالوں کو
بند نہ کیا جائے (حالانکہ مسدود کرنے کا سوال ہی پیش نہیں ہے) اور نہ ان کی کوئی
اصلاح کی جائے منطقی ہٹ بھی عجب شے ہے یہ ہٹ کی ہر مشہور قسم سے ایک قدم آگے
ہوتی ہے اس لئے کہ اس کی بنیاد یہ خواہش ہوتی ہے کہ جان بوجھ کر ایک بات پر
اڑا جائے اور اپنی چاہتی بات کے گرد مخالفوں کی ایک باڑ کھڑی کر دی جائے۔ پبلک کی
نفسیات عموماً ایک بچے کی سی ہوتی ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ سیاسی ارتقا یافتہ ممالک میں بھی
پبلک یعنی عامۃ الناس بہ حیثیت مجموعی۔ اکثر معاملات میں ایک ہٹیلے بچے سے زیادہ
وقعت نہیں رکھتی۔ ایسی پبلک کو پبلک ہی کہا کہا جا سکتا ہے جس کا بہت بڑا حصہ
لوگوں کا ہو جنہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اور تربیت کا عہد طفلی ملانوں اور مولویوں کی

تسمہ بازی غلامی اور علم نما جہل میں گذارا ہو۔ ایسی پبلک کو تعلیمی آ
سم قاتل ہے اور جب ایسے ارباب جو انگریزی تعلیم پا چکے ہیں اور جن سے بعض اچھا
کی بھی ہوا کھا آئے ہوں پبلک میں مجلسوں اور پاٹ شالوں کی بنا کریں تعلیمی امور سے
کوئی پبلک نئے تعلیمی آزادی کی بنا پر کسی معقول رائے کی تردید کریں تو واقعہ تو یہ ہے
لطیفہ سنجی کی انتہا ہو جاتی ہے اور اگر اسے لطیفہ اور تفنن طبع نہ سمجھا جائے تو پھر مجبوراً
یہ ماننا پڑے گا کہ اس مخالفت کے پردہ میں علاوہ تعلیمی وجوہات کے کوئی اور وجہ
تحریک بھی ہے جس کی بنا پر ان قواعد و ضوابط کو محض چھیڑ چھاڑ کی آڑ بنا رہا ہے۔
ملک کی تعلیمی ترقی نہ تو اس طرح ہو گی کہ تعلیم یافتہ ارباب بے اصول اور مصنوعی
درنگاہوں کی حمایت پر پل پڑیں اور نہ اس صورت میں کہ خالص تعلیمی امور کو غیر متعلق
تحریکات اور شور و غوغا کے لئے ایک ٹٹی بنایا جائے۔ آج کل متمدن زندگی ایسی
پیچیدہ ہوتی جاتی ہے کہ جب تک ابنائے وطن کی تعلیم اور تربیت کا بندوبست موجودہ
زمانہ کو پیش نظر رکھکر باقاعدگی اور ضبط کے ساتھ نہ کیا جائے۔ کوئی ملک کسی بڑی
بہبودی کی توقع نہیں کر سکتا۔ اس زمانہ میں تعلیمی رجحانات اور تحریکات کو شتر بے مہار
کیطرح ایسے لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا جنہوں نے تعلیم تعلیم پکارنا تو سیکھ لیا ہے
لیکن کبھی اس اہم ترین سماجی بہبود کے مسئلہ کے بے شمار پہلوؤں کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا
اور کبھی کوئی تعمیری تعلیمی کام نہیں کیا ہرگز مفید نہیں ہو سکتا۔ لطف تو یہ ہے کہ اگر یہی صاحب
جو غوغا مچا رہے ہیں آج کل کی اس تعلیمی رفتار سے روشناس ہوتے جو یورپ کی جنگ عظیم کے لئے
مہذب قوموں میں پیدا ہوئی ہے تو اُن کو معلوم ہوتا کہ یورپی قوموں کی بقا اور ارتقا
کس قدر ضروری ہو گیا ہے کہ حکومتوں کی جانب سے جملہ تعلیمی رجحانات کی نگرانی کیجائے
بات تو یہ ہے کہ جس وقت بدقسمتی سے کسی معاملہ میں ایسے جذبات شامل کر دیے جائیں
جو اس معاملہ سے متعلق نہیں ہو سکتے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل استدلال

ملی جذبات کے شور و غوغا میں سنائی نہیں دیتی اور انسانی تعمیری کا اصل راز یہی ہے۔ اس تعلیمات کی گشتی پر خالص تعلیمی پہلو سے غور ہونا چاہئے۔ اور جہاں کہیں جن اصحاب کو ان قواعد و ضوابط کے متعلق کچھ اعتراض پیدا ہوا ان کے بارے میں عام متعلقہ سے گفت و شنید اور دلائل قدح ہو سکتی ہے۔ جو لوگ پبلک پبلک کا ورد کرتے رہتے ہیں ان کو یہ نہ بھلانا چاہئے کہ ارباب حکومت اور ارکان دولت خود پبلک کا اہم جز ہیں۔ اگر یہ راستہ اختیار کیا جاتا تو ایک تعمیری صورت پیدا ہوتی اور ہمیں یقین ہے کہ اس طرح غل پکار کی نوبت ہی نہیں آتی اور ان قواعد اور ضوابط کے دور رس بہبود عامہ کا پہلو پوری طرح واضح ہو جاتا اور سرکار عالی ان قواعد کے نفاذ پر موجب شکریہ قرار پاتی۔ ان خیالات کی روشنی میں اب قارئین کرام ان قواعد و ضوابط کا مطالعہ فرما سکتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ان قواعد و ضوابط کی ضرورت اور اہمیت تعلیمی پہلو سے بخوبی ظاہر ہو جائے گی۔

قواعد قیام مدارس خانگی

ممالک محروسہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

چونکہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے جملہ رجحانات اور تحریکات تعلیمی سے سرکار عالی کا باخبر رہنا ضروری ہے تعلیمی اعداد و شمار کی تکمیل نیز جملہ تعلیم گاہوں کا عام اصول تعلیم اور حفظان کا ربند ہونا ملک کی فلاح تعلیمی کے لئے لازمی ہے۔ لہذا ذیل کے قواعد خانگی مدارس کے قیام ان کے اعداد و شمار اور ان کی نگرانی اور مسدودی کے لئے منظور کئے جاتے ہیں۔ ایسے خانگی مدارس بھی جو ان قواعد کے قبل نفاذ سے قائم ہیں ان قواعد کے اثر سے مستثنیٰ نہ ہوں گے اور ان پر بھی ان قواعد کی پابندی لازمی

(۱) خانگی مدرسہ سے مراد ایسی تعلیم گاہ ہے جہاں پندرہ
تعلیم پاتے ہوں اور جس کو سرکار عالی سے نہ امداد ملتی ہو
نصاب سرکار عالی یا سرکاری امتحان کی تعلیم کے لئے سرکار عالی نے تجویز کیا ہو۔

(۲) ان قواعد کے نفاذ سے مدرسے کوئی خانگی مدرسہ کسی شخص یا جماعت کی جانب سے
قائم نہ ہو سکیگا جب تک ایسے مدرسہ کے قیام کی اجازت حسب صراحت ذیل
حاصل نہ کر لی جائے۔

(الف) مدارس ابتدائیہ و تحتانیہ کے لئے متعلقہ صدر مہتمم تعلیمات کی اجازت ضروری ہوگی

(ب) مدارس وسطانیہ اور فوقانیہ ذکور اور وسطانیہ و فوقانیہ نسواں کے لئے بالائی
اجازت کے مجاز صرف ناظم تعلیمات ہونگے۔

(ج) مدارس نسواں ابتدائیہ و تحتانیہ کے قیام کی اجازت صدر مہتممہ مدارس
نسواں اپنے حدود میں اور اضلاع پر صدر مہتممان اجازت دینے کے مجاز ہوں گے

(۳) خانگی مدرسہ کے قیام کے لئے بانی مدرسہ یا جماعت کی صورت میں انتظامی کمیٹی کے
ایک درخواست حسب نمونہ منسلکہ ناظم تعلیمات یا صدر مہتمم تعلیمات کے پاس
پیش کی جائے گی جس میں امور ذیل کی تفصیل ہوگی۔

(الف) مقاصد قیام مدرسہ (ب) نصاب تعلیم

(ج) مکان مدرسہ (د) اسٹاف اور ان کی قابلیت

(نوٹ) جو مدارس خانگی ان قواعد کے قبل نفاذ قائم ہیں ان کو اس امر کی بھی صراحت
کرنی ہوگی کہ یہ مدارس کب سے قائم ہیں۔

(۴) خانگی مدارس میں سرکاری۔ امدادی یا منسلکہ سرکار مدارس کا کوئی طالب علم
یا طالبہ اس وقت تک شریک نہ کی جائے گی جب تک کہ وہ اپنے مدرسہ کا
صداقت نامہ ترک مدرسہ پیش نہ کرے۔

یا طالب علم یا طالبہ کسی خانگی مدرسہ میں بلا صداقت نامہ ترک مدرسہ شریک ہو جائے تو مدرسہ متعلقہ کے صدر مدرس کی تحریک پر خانگی مدرسہ کے بانی یا انتظامی کمیٹی ایسے طالب علم یا طالبہ کو اپنے مدرسہ سے خارج کر دیں۔

(۶) ہر خانگی مدرسہ میں بلا امتیاز مذہب و ملت طلباء شریک کئے جائیں سوائے ان طلباء کے جو کسی مرض متعدی میں مبتلا ہوں یا جن کی شرکت سے دوسرے طلباء کی صحت پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہو۔

استثناء وہ مدارس جو کسی خاص فرقے کے لئے یا کسی خاص غرض کے لئے باجازت قائم کئے گئے ہوں ان کے لئے شرط بالا کی پابندی لازمی نہ ہوگی۔

(۷) خانگی مدارس کے نصاب یا درس تدریس میں۔

(الف) ایسی مذہبی تعلیم نہ دی جائے گی جس سے دوسرے مذہب والوں کے جذبات کو صدمہ پہونچے اور ان کی دلشکنی ہو۔

(ب) ایسی سیاسی یا غیر سیاسی امور کی تعلیم نہ دی جائے گی جس سے دولت آصفیہ کے افسروں یا ارکان خاندان آصفیہ یا حضرت اقدس و اعلیٰ کی حکومت (گورنمنٹ) کے خلاف بددلی یا بے چینی یا بدخواہی یا غیر وفادارانہ خیالات طلباء یا طالبات کے ذہن نشین ہوں۔

(۸) جملہ خانگی مدارس سالانہ اعداد و شمار کے تختہ جات کی باحتیاط خانہ پری کر کے صدر مہتمم تعلیمات یا ناظم تعلیمات کے پاس تاریخ معینہ پر بھیجدیں گے۔

(۹) ان قواعد کے نفاذ کے قبل سے جو مدارس خانگی قائم ہیں ان کے بانی یا انتظامی کمیٹی کی جانب سے صدر مہتمم تعلیمات سمت متعلقہ کو حسب نمونہ متذکرہ فقرہ (۳) قواعد ہذا امور الف۔ ب۔ ج اور د سے اندرون سہ ماہ مطلع کریں گے۔

(۱۰) ان قواعد کے نفاذ کے بعد جو خانگی مدارس بلا اجازت قائم ہوں یا موجودہ

خانگی مدارس حسب فقرہ (۸) تخصیصات فراہم نہ کریں یا اور کسی طرح پابندی نہ کریں تو متعلقہ صدر مہتمم تعلیمات یا ناظم تعلیمات اول تعلقہ رصاحب یا کوتوال صاحب بلدہ کے ذریعہ ان کی مسدودی کی کارروائی کریں گے۔

(۱۱) جملہ معائنہ کنندہ عہدہ داران سررشتۂ ہذا خانگی مدارس کے معائنہ کے مجاز ہوں گے اور بانی یا منتظمین ان کے معائنہ میں ہر طرح کی سہولت مہیا کریں گے۔

(۱۲) مجاز کو یا رہوہ بلا اظہار وجوہ قیام مدرسہ کی اجازت نہ دے یا قائم شدہ مدرسہ کے برخاست کی کارروائی کرے۔

(۱۳) سرکار عالی کا یہ منشا نہیں ہے کہ قواعد ہذا خانگی تعلیم گاہوں کے قیام میں کوئی رکاوٹ پیدا کریں۔ سرکار عالی متوقع ہیں کہ ناظم تعلیمات اور صدر مہتمم تعلیمات بجز ایسی صورتوں کے جہاں تعلیمی یا اخلاقی یا جسمانی یا مذہبی یا سیاسی مضر اثرات کے معقول اندیشہ ہو اس قسم کے مدارس کے قیام کی اجازت بعجلت ممکنہ دیں گے اور ہر طرح سے بانیان مدرسہ کی معاونت کریں گے۔

نمونہ درخواست برائے قیام مدرسہ خانگی

(۱) نام مدرسہ۔ (۲) نام موضع بصراحت تعلقہ وضلع۔

(۳) نام بانی مدرسہ۔ (۴) نام معتمد یا صدر وغیرہ۔

(۵) قسم مدرسہ۔ (۶) مقاصد قیام۔

(۷) نصاب تعلیم۔ (۸) عمارت مدرسہ کے حالات جس میں کہ مدرسہ قائم ہوگا۔

(الف) عمارت میں کتنے کمرے ہیں اور ان کا طول و عرض و بلندی۔

(ب) کھیل کا میدان ہے یا نہیں ہے اور اس کی وسعت کیا ہے۔

(ج) پانی اور بیت الخلا کا کیا انتظام کیا گیا ہے۔

(۹) مدرسین اساتذہ کس لیاقت اور مشاہرہ کے ہوں گے۔

(۱۰) کتنے طلباء اور کن مذاہب کے جمع ہونے کی توقع ہے جماعتواری اندازہ دیا جائے

(۱۱) مصارف جماعتوں میں اگر فیس لیجائے گی تو کس قدر ہوگی۔

(۱۲) فرنیچر کا کیا انتظام کیا جائے گا۔

(۱۳) کتب خانہ ہوگا یا نہیں۔

(۱۴) تخمینہ آمدنی مدرسہ از انہ بذریعہ چندہ عطیات وغیرہ۔

اقرارنامہ

اقرار واثق کیا جاتا ہے کہ اگر مدرسہ کے قیام کی اجازت دی جائے گی تو جملہ قواعد واحکام سررشتہ متعلقہ قیام مدارس خانگی کی پابندی کی جائے گی فقط

مقام

تاریخ

دستخط معتمد یا صدر مدرس

اخبار تعلیم لاہور

ہر قسم کے تعلیمی معاملات پر آزادانہ بحث کرنے والا مدرسین کا وکیل اور ترجمان طلباء کا معاون ومددگار افسران محکمہ تعلیم کا خیر خواہ سررشتہ تعلیم کا مشیر ہر قسم کے علمی اخلاقی طبی وغیرہ مضامین کا مخزن ہفتہ وار اخبار تعلیم لاہور سے شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ پیشگی ششماہی تین روپیہ آٹھ آنہ سہ ماہی دو روپیہ۔

منشی طالب علی صاحب پابند وقت ایڈیٹر اخبار تعلیم لاہور سے طلب کیجئے

تبصرہ

بیم لیٹ

شیکس پیر کے اس مشہور ناٹک کا ترجمہ منشی امتیاز علی صاحب بی۔ اے وکیل فیض آباد نے کیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ شیکس پیر کے کل کھیلوں کا ترجمہ کبھی کا ہو جاتا۔ اردو ادب ڈرامے سے بالکل کورا ہے اور اردو کے ارباب قلم اسی وقت ڈراما کی طرف کامیابی کے ساتھ متوجہ ہوں گے کہ ان کو اردو میں ڈراما کے اعلیٰ نمونے ملیں۔ اس کام کو وہی اصحاب بخوبی انجام دے سکتے ہیں جو انگریزی ادب پر حاوی ہوں اور اردو میں اہل قلم ہوں۔ ہمیں خوشی ہے کہ منشی امتیاز علی صاحب نے شیکس پیر کے شہپارے کا ترجمہ اردو داں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

ترجمہ اور پھر ادبیات کا ترجمہ نہایت مشکل کام ہے۔ ترجمہ میں اصل کی روح کا آنا اور ترجمہ کا ترجمہ ہی رہنا ایسی چیز ہے کہ اس کام سے ممتاز قابلیتوں کے اہل قلم بھی مشکل سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ شیکس پیر کے کھیلوں کا ترجمہ ایک جماعت اپنے ذمہ لے اس جماعت کے ارکان وہ لوگ ہوں جو ایک طرف انگریزی ادب میں پکے ہوئے ہوں دوسری طرف اپنی مادری زبان پر پورا پورا قابو رکھتے ہوں۔ یہ جماعت ایک کلب کی صورت میں ہو اور اس کا مقصد محض یہ ہو کہ اولاً شیکس پیر کے جملہ کھیلوں کا ترجمہ اپنے ارکان یا بعض ایسے غیر ارکان حضرات سے کرائے جو اس کام کے لئے بہت موزوں سمجھے جائیں اور ثانیاً شیکس پیر کے فن اور اس کے کمال کے متعلق جہاں تک ممکن ہو کارآمد باتیں اردو کے قالب میں ڈھال دی جائیں۔

بہرحال منشی امتیاز علی صاحب نے بہت اچھا کام کیا ہے جن تعلیم یافتہ ارباب کو اس جانب ذوق ہو وہ اس طرف قدم اٹھائیں نفس ترجمہ پر اس وقت تبصرہ کا موقع نہیں

سری سو ر ہے سکتے ہیں کہ ترجمہ رواں ہے اور آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔
کھفائی چھپائی بھی ہے۔ ذیل کے پتہ پر کتاب مل سکتی ہے۔
منشی صغر علی مکان نمبر جم محلہ مغلپورہ شہر فیض آباد قیمت غیر مجلد ۴ مجلد ۶

شذرات

بصدارت عالیجناب نواب حیدر نواز جنگ بہادر صدر المہام فینانس سرکار عالی بمقام
[illegible] مدرجہ پروگرام کے مطابق انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کا پہلا اجلاس منعقد ہوگا۔
اجلاس اول۔ پنجشنبہ ۱۹ امرداد ۱۳۳۵ف افتتاح نمایش تعلیمی کے بعد پونے دس بجے
صبح سے ساڑھے بارہ بجے تک ہوگا اس میں عالیجناب صدر نشین صاحب کی
افتتاحی تقریر اور مولوی مرتضیٰ صاحب مرحوم کی بے وقت وفات پر اظہار افسوس کی تحریک
اکمنہ مدارس کو اصول حفظان صحت کے مطابق تعمیر کرنے اور مدارس کے سفائی کے متعلق تحریک
کی جائیگی

اجلاس دوم۔ پنجشنبہ ۱۹ امرداد ۱۳۳۵ف سہ پہر ۲ بجے سے ۴ بجے تک۔
ڈالٹن کے طریقہ تعلیم پر (جناب مولوی محمد عثمان صاحب بی۔ اے اول مدرس
نارمل اسکول بلدہ) اور حفاظت اطفال (جناب مولوی سید محمد حسین صاحب
بی اے۔ ناظم تعلیمات) پر تقریروں کے علاوہ ہائی اسکول لیونگ
سرٹیفکیٹ کے نصاب کی اصلاح اور امتحانات ہائی اسکول لیونگ
سرٹیفکیٹ و عثمانیہ میٹرک کے ممتحنین و ڈویژنس میں مدرسین کی کافی تعداد کو
شریک کرنے کی تحریکیں پیش ہوں گی۔ ۵ سے ۶ تک اسکاٹس کا اجتماع
(Scauts Rally) ہوگا بعد ازاں عالیجناب نواب مسعود جنگ بہادر

ناظم تعلیمات جاپان پر بذریعہ میجک لان ٹرن لیکچر دیں گے

اجلاس سوم جمعہ ۲۰ امرداد ۱۳۳۵ف ۹ تا ۱۱ ساعت تعلیم اخلاق اور نظام دلسق مدارس نوفیہ تقریروں کے علاوہ مدا کے نصاب میں تبدیلی کرنے کی تحریک پیش کی جائے گی۔

اجلاس چہارم جمعہ ۲۰ امرداد ۱۳۳۵ف ۲ تا ۴ ساعت جغرافیہ کی تعلیم۔ تعلیم ورزش جسمانی کے متعلق تقریریں اور ثانویہ میٹرک کی مدت تعلیم بجائے ۱۰ سال کے تین سال مقرر کرنے کی تحریک پیش ہوگی اس کے بعد تقسیم انعامات نمایش عالیجناب صدر نشین جناب کی آخری تقریر اور شکریہ و دعا فقط

نتیجۂ امتحان ہائی سکول لیونگ سرٹیفکیٹ ملک کا عان ۱۹۲۶ء

نشان سلسلہ	نام مدرسہ	تعداد شرکا	کامیاب درجہ دوم	کامیاب درجہ سوم	کیفیت
۱	مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد	۲۸	۷	۹	
۲	مدرسہ فوقانیہ چادرگھاٹ حیدرآباد	۵۳	۱۵	۱۳	
۳	سنی کالجیٹ سکول حیدرآباد	۵۱	۴		
۴	مدرسہ فوقانیہ گلبرگہ	۲۰	۱	۶	
۵	مدرسہ عالیہ حیدرآباد	۱۸	۹	۳	
۶	مدرسہ فوقانیہ ورنگل	۱۵	۲	۳	
۷	زنانہ ہائی سکول حیدرآباد	۴	۱	۳	
۸	آل سنٹس ہائی سکول حیدرآباد	۱۶	۲	۱	
۹	اسلامیہ ہائی سکول سکندرآباد	۸	۱	۲	
۱۰	محبوب کالج سکندرآباد	۱۴۸	۱۶	۱۲	

۱۱	متہدسٹ مشن سکول حیدرآباد	۱۰	۰	۱
۱۲	وسلیین مشن سکول	۲۱	۷	۶
۱۳	اسٹانڈرڈ گرلز سکول	۱۲	۴	۴
۱۴	شرکا، خانگی ذکور	۳۸	۰	۸۱
۱۵	" اناث	۷	۰	۴
۱۶	اساتذہ	۹	۰	۱

ہندستانی طلبا امریکہ میں ذیل کے معلومات سے اُن ہندوستانی طلبا کو فائدہ ہوگا جو بغرض تعلیم امریکہ جانا چاہتے ہیں۔

بیرونی طلبا میں دوستانہ تعلقات کے متعلق ایک کمیٹی نیویارک میں قائم کی ہے۔

اس کمیٹی کا پورا نام اور پتہ یہ ہے۔

The Committee on Friendly Relations among Foreign Students, 347, Madison Avenue, New York.

یہ کمیٹی اس بات پر آمادہ رہتی ہے کہ جو طلبا، غیر ملک سے صوبہ جات متحدہ کے کسی بندرگاہ پر آئیں ان کو لینے کا انتظام کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو طلبا، کی مدد کی جائے علاوہ اس کے اس کمیٹی کی جانب سے اُن طلبا، کو مطالعہ وغیرہ کی تفصیل بھی دریافت کرنے پر مل جاتی ہے اس کمیٹی کو وائی۔ یم۔ سی۔ اے کے محکمہ خارجہ نے قائم کیا ہے کیونکہ یہ کمیٹی ممالک غیر سے جو طلبا، صوبہ جات متحدہ میں آئے ہوئے ہیں اُن کی بہت وسیع پیمانہ پر خدمت کرتی رہتی ہے اس وقت ۵۱۸ بیرونی طلبا، صوبہ جات متحدہ میں ہیں جن میں سے ۲۳۷ ہندوستانی ہیں علاوہ اس کمیٹی کے جو نیویارک تک محدود ہے وائی۔ یم۔ سی۔ اے ہر بندرگاہ پر طلبا، کو امداد دینے کا انتظام کر سکتی ہے اگر طلبا، نیویارک کے علاوہ کسی اور بندرگاہ میں اترنا چاہتے ہیں تو

اس کی اطلاع وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے سکرٹری کو بھیجنی چاہئے اور اگر یارک جانا ہے مذکورہ بالا کمیٹی کے سکرٹری کو لکھنا چاہئے۔ بندرگاہوں پر اتارنے وغیرہ کی زحمت طلبا اور پروفیسروں کی خواہ وہ کسی ملک سے آئیں بلا کسی معاوضہ کے انجام دی جائے گی یہ کمیٹی بلحاظ اپنے منشاء اور بلحاظ اراکین بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اسکا مقصد یہ ہے کہ طلبا کی فوری ضرورتوں کو پورا کیا جائے اور طلبا کے ساتھ ہمدردی کرکے ان کو اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے اعلیٰ ترین منصوبوں کے مطابق تعلیم حاصل کرسکیں جو ہندوستانی طالب علم امریکہ جانا چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس کمیٹی کے خدمات سے فائدہ اٹھائیں تو ان کو چاہئے کہ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے جنرل سکریٹری کو لکھیں اور امور کی وضاحت کردیں کہ وہ کونسے بندرگاہ پر کس جہاز میں اور کس تاریخ وہاں پہونچیں گے اگر ممکن ہو تو یہ بھی بتادیں کہ جہاز کے کس درجہ میں سفر کریں گے جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے نیویارک کے متعلق ان امور کی وضاحت مذکورہ بالا کمیٹی کے انتظامی سکرٹری کو بھیجنی چاہئے

فیلڈ (امریکہ) کا ڈاکٹر "اے ایس ڈبلیو روزنباچ" غالباً دنیا میں کتابوں کا سب سے بڑا شوقین ہے جس نے گزشتہ دس سال کے عرصہ میں بیس لاکھ پونڈ سے زیادہ رقم نادر اور بیش قیمت کتابوں کے خریدنے پر صرف کی ہے بیان کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر مذکور کے کتب خانہ میں ایسی نادر کتابیں ہیں جو دنیا کے کسی اور کتبخانہ میں نہیں پائی جاتیں۔

نواب اشرف حسین صاحب نے مسلم طلبا کو بیرونی ممالک میں وظیفہ دینے کے لئے ساڑھے اکیس ہزار روپیہ مرحمت فرمایا ہے۔

دہلی میں بھی میونسپالٹی ابتدائی جبری تعلیم کو پھیلا رہی ہے۔

ضمیمہ

امتحان ڈرائنگ علاقہ بمبئی کے امتحان میں سال حال حسب ذیل طلبا ملک سرکار عالی کے کامیاب ہوئے

شعبہ انٹرمیڈیٹ ڈرائنگ

سٹی کالجیٹ اسکول

۱۔ مرزا محمد عبدالمنیر بیگ

مدرسہ فوقانیہ چادرگھاٹ حیدرآباد

۲۔ شیخ محی الدین

۳۔ محمد عزیز الدین

۴۔ جے راج نائڈو

مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم بلدہ

۵۔ محمد لیاقت علی

۶۔ سید عبدالوحید

متھڈسٹ ہائر سکول

۷۔ جارج پی سامیول

مدرسہ سلطانیہ شاہ علی بنڈہ

۸۔ عبدالقادر محمد صدیقی

مدرسہ وسطانیہ مستعدپورہ

۹۔ عمر بن عبداللہ

مدرسہ وسطانیہ نرمل

۱۰۔ پی نرسلو

مدرسہ آصفیہ ملک پیٹھ

۱۱۔ رام پرشاد

مدرسہ رفاہ عام مہری باولی

۱۲۔ محمد سوان خاں

کایستھ پاٹھ شالہ بلدہ

۱۳۔ رام سروپ

۱۴۔ کاظم علی

مدرسہ مفید عام بلدہ

۱۵۔ سید عبدالمجید

۱۶۔ سید محمد

شرکار خانگی

۱۷۔ محمد اسمٰعیل

۱۸۔ مرزا احمد علی بیگ

۱۹۔ محمد اظہر الدین

۲۰۔ [illegible] دار علی

۲۱۔ عبدالرحیم

۲۲۔ عبدالعظیم خاں

۲۳۔ غوث محی الدین

۲۴۔ محمد ظہور

شعبۂ الیمنٹری ڈرائنگ

نظام کالج

۱۔ سید صلاح الدین احمد

سٹی کالجیٹ سکول حیدرآباد

۲۔ کے، کے، سری راملو

۳۔ محمد عبدالرحمن

۴۔ یم بھگوان سنگھ

۵۔ غلام محی الدین

۶۔ مرزا محمد عبدالمنیر بیگ

مدرسہ فوقانیہ چادرگھاٹ

۷۔ محمد عبدالقادر

۸۔ یم، یم، ڈیوڈ

۹۔ وینکٹا چلاپتی نائڈو

۱۰۔ بی نارائن راؤ

۱۱۔ نرسنگراؤ سندھی

۱۲۔ پی بلارام

مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم حیدرآباد

۱۳۔ گوردھن پرشاد

۱۴۔ حسین علی

۱۵۔ احمد محی الدین

۱۶۔ مرزا وحید علی بیگ

۱۷۔ محمد قادر علی

۱۸۔ محمد حیدر علی

۱۹۔ سید یوسف الدین

۲۰۔ سید محمد نعمت اللہ

۲۱۔ شیخ عبدالقادر

۲۲۔ سید عبدالقاسم

۲۳۔ سید خلیل

مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ ناملی بلدہ

۲۴۔ گوندراؤ جلو

۲۵۔ چندریا

۲۶۔ مرزا عزیز بیگ

۲۷۔ خواجہ محی الدین شریف

مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ میدک

۲۸۔ محمد یعقوب شریف

۲۹۔ عبداللہ حسین

۳۰۔ میر سجاد علی

نارمل اسکول ورنگل

۳۱۔ سی۔ آر گوپال راؤ مدلیار

مدرسہ فوقانیہ مفید الانام بلدہ

۳۲۔ محمد عبدالرزاق صدیقی

۳۳۔ محی الدین حسین

مدرسہ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ

۳۴۔ شیخ احمد

۳۵۔ کشن راؤ۔

۳۶۔ حسین شجاع الدین

۳۷۔ دھنپل سنگھ

مدرسہ وسطانیہ دارالشفا حیدرآباد

۳۸۔ میر معصوم علی

۳۹۔ محمد رفیع الدین

۴۰۔ مرزا محمد عسکری

۴۱۔ محمد عبدالسلام صدیقی

مدرسہ وسطانیہ زیڈنسی بازار حیدرآباد

۴۲۔ احمد محی الدین

مدرسہ سلطانیہ لوئر گنڈہ
۴۳۔ محمد سلیمان
۴۴۔ بی ونخ نگیا
مدرسہ سلطانیہ کاچی گوڑہ
۴۵۔ عبدالولی
مدرسہ سلطانیہ سدی پیٹھ
۴۶۔ یم لکشمی نرسیا۔
مدرسہ سلطانیہ نرمل
۴۷۔ نرسلو
۴۸۔ امجد علیخاں
۴۹۔ احمد محی الدین
۵۰۔ شیخ حیدر
مدرسہ سلطانیہ نظام آباد
۵۱۔ عبدالوحید
۵۲۔ درگا پرشاد

۵۳۔ گجانن
۵۴۔ ہنمنتو
۵۵۔ نرسمار یڈی
مدرسہ آصفیہ ملک پیٹہ
۵۶۔ محمد نعمت اللہ خان
اشرف المدارس تپہ بازار
۵۷۔ محمد عبدالوحید خاں
۵۸۔ محمد عبدالغفور
کایستہ پاٹ شالہ بلدہ
۵۹ محمد باقر علی
اے دی مڈل اسکول بلارم
۶۰۔ محمد عبدالرحمن
۶۱۔ وی پدما راؤ
۶۲۔ جی ویرپا
۶۳۔ کے پی رام کرشنا

مدرسہ انوار العلوم نامپلی حیدرآباد
۶۴۔ محمد حسین
مدرسہ تعلیم المعلمات ملبہ حیدرآباد
۶۵۔ قطب النسا بیگم
زنانہ کالج حیدرآباد۔
۶۶۔ بشیر النسا بیگم
۶۷۔ ایوجینیلین پالومن
۶۸ خدیجہ بیگم
شرکار خانگی
۶۹۔ محمد اسمٰعیل
۷۰۔ بی راملو
۷۱۔ محمد اظہر الدین
۷۲۔ عبدالعظیم خاں

ایک نامور کی رحلت

المعلم مطبع میں جا چکا تھا کہ ۲۹ تیر سنہ رواں کو یہ افسوسناک خبر پہنچی کہ نواب عماد الملک بہادر نے اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔ نواب صاحب کی بزرگ اور بابرکت ہستی لیاقت علم مسلمانوں کا بہترین نمونہ تھی۔ نواب صاحب کا نام نامی ہندوستان اور خصوصاً ممالک محروسہ سرکار عالی کی تعلیمی ترقی اور تحریکات کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

نتائج امتحان معلمی ادنی پرائمری سنہ ۳۵ف

مدرسہ تعلیم المعلمات اردو حیدرآباد — وسیلین مشن گرلز نارمل ٹریننگ سکندرآباد

۱۔ خیر النساء بیگم بنت سید محمد ابراہیم ۔ درجہ اول
۲۔ خیر النساء بیگم بنت محمد یٰسین خان ۔ درجہ اول
۳۔ آمنہ بی درجہ دوم
۴۔ صمدانی بیگم سال آئندہ صرف علوم عامہ میں امتحان دینا ہوگا
۷۔ احمدی بیگم ۔ 〃 〃 〃
امید واران خانگی
۱۰۔ عزت النساء بیگم ۔ سال آئندہ صرف ریاضی میں امتحان دینا ہوگا
۱۴۔ زینب بی درجہ دوم
۱۵۔ حافظ النساء بیگم سال آئندہ صرف زبان اردو مذہبی امتحان دینا ہوگا
۱۹۔ خورشید جہاں بیگم درجہ اول
۲۰۔ امت اللہ بیگم درجہ دوم
۲۲۔ زہرا بیگم کامیاب در ریاضی ۔
۲۳۔ عائشہ بیگم ۔ کامیاب در ریاضی
۲۴۔ یٰسین بیگم ۔ کامیاب در علوم عامہ

۲۶۔ گارڈ مالکم ۔ سال آئندہ صرف اردو میں امتحان دینا ہوگا
مدرسہ تعلیم المعلمات مرہٹی اورنگ آباد
۳۷۔ مینا بائی ۔ زبان دوم اردو میں سال آئندہ امتحان دینا ہوگا
۴۱۔ راما بائی سال آئندہ صرف اردو میں 〃 〃
۴۴۔ ہرنا بائی ۔ سال آئندہ 〃 〃 〃 〃
۴۵۔ گیتا بائی ۔ کامیاب در اردو
۴۶۔ منو بائی ۔ 〃
مدرسہ تعلیم المعلمات تلنگی ورنگل
۴۷۔ رنگما ۔ سال آئندہ صرف اردو میں امتحان دینا ہوگا
۴۸۔ پاروتی بائی ۔ 〃 〃
۴۹۔ جانکی بائی ۔ 〃 〃
۵۰۔ بائما درجہ اول
۵۱۔ کنکما ۔ کامیاب در علوم عامہ
۵۲۔ وتیم راج لکشمی بائی کامیاب در اردو

*

اعلیحضرت فرمانروائے دکن حضور پرنور بندگانعالی متعالی مدظلہ العالی خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ

سے بذریعہ فرمان مبارک

میر فرخی تاشین پریس کو پیشگاہ حکیم الملک

نواب اعظم جاہ بہادر اللہ تعالیٰ اقبالہ واجلالہ

کے مبارک نام نامی

۱۸ ربیع الاول ۱۳۴۱ھ شاہزادگان و ہز ہائینس ولیعہد

اعظم اسٹیم پریس سے موسوم کرنے کی اجازت عطا فرمائی گئی۔ ملک کی قدردانی اور کاروبار کی ترقی کے لحاظ سے ہر قسم کی بدرجہ اعلیٰ لکھائی چھپائی رنگین سادہ اور مصنفین کی سہولت۔ دفاتر سرکاری کی ترقی اور اہم کارہائے طباعت کے عمدہ اور فوری انجام پانے کا خاص اہتمام رکھا گیا ہے۔

سررشتہ تعلیمات کی ہر جماعت کے متعلقہ جملہ اصلی کتب نصاب و خلاصہ جات و کتب انعامی۔ اردو۔ فارسی۔ عربی۔ انگریزی تلنگی مرہٹی

ڈرائنگ و تصاویر جو بچوں کی ابتدائی تعلیم اور ڈرائنگ کے عیاں کلاسوں کے مفید کارآمد کتب ڈرائنگ کاپیاں و کمپاس تصاویر نباتات و جانوران وغیرہ۔

نقشہ جات دکن ہندوستان یشیا یورپ۔ افریقہ امریکہ بھی موجود ہیں و اجرتی قیمت ہر تفصیلی فہرست کتب خانہ ہذا کی مفت طلب کر ملاحظہ فرمائیے

المشتہر سید عبدالتواب تاجر کتب و پبلشر و مالک اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن

شمع پادشاہان اودھ اور ان کے مشہور اُمرا اعزا اور لکھنؤ کے مایۂ ناز قدیم شعرا کی قلمی تصاویر عہد مغلیہ و عہد جدید کی مصوری کے بہترین نمونے جو اب تک شائع نہیں ہوئے ہیں اور نہ کسی دوسری جگہ میسر آسکتے ہیں رسالہ شمع میں مسلسل شائع ہو رہے ہیں شمع تاریخی۔ علمی۔ ادبی اور سیاسی مضامین اور فسانوں کا ہندوستان میں سب سے زیادہ حجم ۱۱۲ صفحات کا رسالہ ہے اور جنوری ۱۹۲۳ء سے محمد حبیب صاحب (آکسن) پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ اور جناب حسن عابد جعفری جناب بارسٹر آگرہ کی اڈیٹری میں نہایت آب و تاب کیساتھ جاری ہے شذرات اور تبصرے قابل دید ہوتے ہیں لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب کاغذ چکنا اور حجم سالانہ ۱۴۰۰ صفحات اور کم از کم ۳۰ تصاویر سالانہ چندہ صرف (دس) ممالک متوسط و برادر سرکار آصفیہ حیدرآباد نے شمع کو مدارس میں جاری فرمایا ہے۔ الہ آباد۔ لکھنؤ۔ دھاکہ۔ پنجاب اور کلکتہ کی یونیورسٹیوں اور بہت سے کالجوں اور اسکولوں میں خریدا جاتا ہے شمع کے ارزاں ہونیکی صرف یہ وجہ ہے اس سے کوئی ذاتی نفع مقصود نہیں ہے محض علمی اور ادبی خدمت کے شوق میں جاری کیا گیا ہے چندہ سالانہ (ہ) اہر حجم ۱۱۲ صفحے نمونہ

نوٹ۔ نمونہ کا پرچہ کسی حالت میں بھی مفت روانہ نہیں ہوگا۔ المشتہر

منیجر۔ شمع۔ شاہ گنج آگرہ

*

دی حیدرآباد بک ڈپو

توپ کا سانچہ حیدرآباد دکن

ہمارے پاس ہر قسم کی جدید و قدیم انگریزی و اردو کتب کا بہترین ذخیرہ ہے ہم نے ایسا انتظام کیا ہے کہ تازہ ترین کتب شائع ہوتے ہی ہمارے پاس سے دستیاب ہو سکتی ہیں ہمارے قیمتیں بہت کم ہیں۔ جو کتاب بمبئی یا مدراس وغیرہ میں ۱۴ ار کلدار کو ملتی ہے وہ ہم بلا لحاظ نرخ کلدار.... مہ سکہ عثمانیہ میں فروخت کرتے ہیں اس کے علاوہ ہمارے پاس صادر کا بہترین سامان ہے قسم قسم کے پنسل کاغذ لفافہ کاغذ ربچاک سامان ڈرائنگ نقشہ جات وغیرہ وغیرہ موجود ہیں۔

مدارس کے ساتھ خاص رعایت کی جاتی ہے براہ کرم اپنی ضروریات سے مطلع فرمائیے اور استفسار کرنے میں تامل نہ فرمائیے۔ ہماری دکان پر ایک دفعہ تو ضرور تشریف لائیے رفاہ عام کی غرض سے ہم نے نشست و برخاست کا بھی معقول انتظام کیا ہے شائقین علم و ادب ہماری دکان پر تشریف لاکر ہر قسم کی کتابوں کا بلا معاوضہ مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

دی حیدرآباد بک ڈپو توپ کا سانچہ حیدرآباد دکن

۳۷۰۵

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔

کتب خانہ
جامعہ عثمانیہ